الیاس سیتاپوری
منتخب تاریخی کہانیاں
داستانِ حُر
داستان گو
اقبال

الیاس سیتاپوری

کی منتخب تاریخی کہانیاں

داستانِ حُر

کتابیات پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۳۔ سعید مینشن، بلمور یا اسٹریٹ، آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی۔۲

جُملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

پاکستان اور بھارت سے ایک ساتھ شائع ہونے والی منتخب تاریخی کہانیاں

مصور: اقبال مہدی
ناشر: کاشف الیاس
باردوم، ۱۹۸۸ء
قیمت: ۴۰ روپے
مطبوعہ: شکیل پرنٹنگ پریس آرام باغ، کراچی

واحد تقسیم کار:
کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

کورگ کی باغی دوشیزہ	۵
سمرقند کا مستقبل شناس	۴۳
لیلاوتی کی سرگزشت وفا	۶۷
بزدل کا قصّۂ عبرت	۱۱۲
لال کنور کا افسانہ	۱۵۵
داستانِ حور	۱۹۱

کورگ کی بغاوت کا دوشیزہ

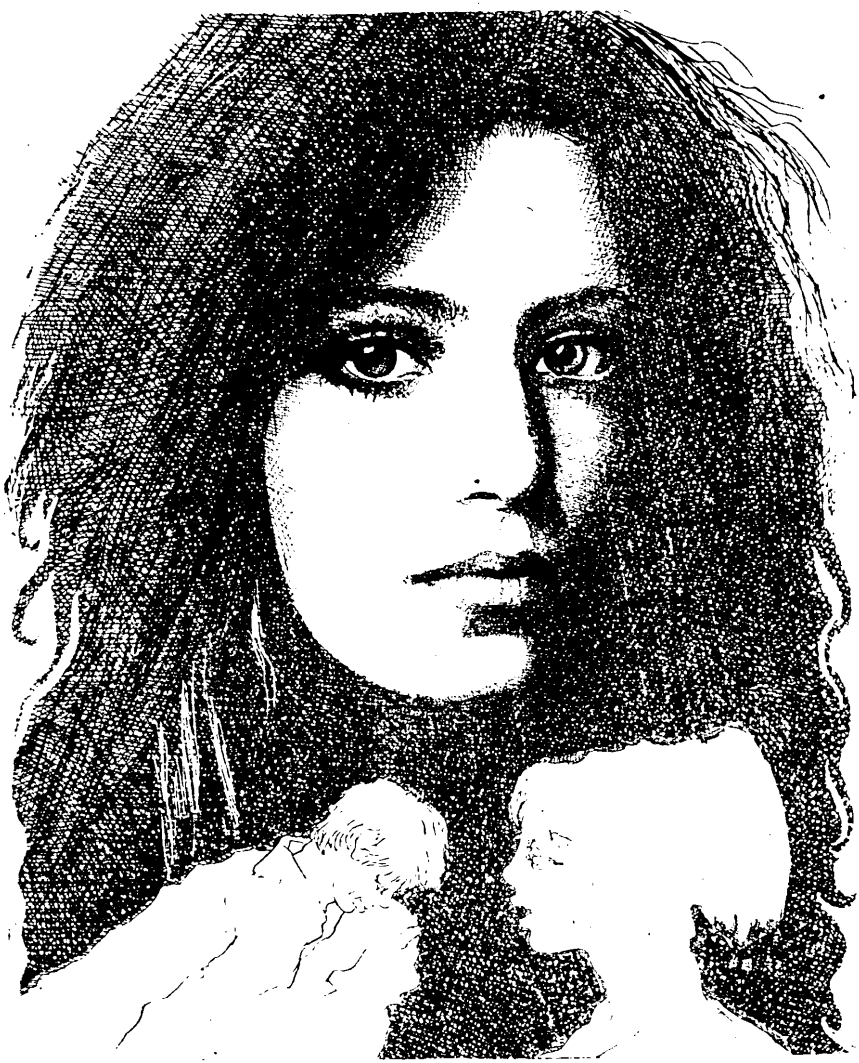

جب نواب حیدر علی نے ارکاٹ سے سولہ میل جانبِ شمال انتقال کیا تو شہزادہ ٹیپو بنگلور کے قریب خیمہ زن تھا۔ وفادارانِ مملکت اور خیر خواہانِ مملکتِ خداداد نے چھوٹے شہزادہ عالیجاہ محمد کریم شاہ کو تختِ حکومت پر بٹھا دیا اور ایک جاں نثار مہا مرزا خاں کو شہزادے ٹیپو کی خدمت میں اس پیغام کے ساتھ روانہ کر دیا کہ

"چونکہ نواب حیدر علی رحلت فرما چکے ہیں، ان کی رحلت اور ولی عہد شہزادے کی عدم موجودگی کی وجہ سے چھوٹے شہزادے کریم شاہ کو وقتی طور پر تخت پر بٹھا دیا گیا ہے، جلد از جلد سرنگا پٹم پہنچ کر اقتدار سنبھالیے اور ملک کو ان امکانی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے بچائیے جو نواب مرحوم کی موت کی خبر مشتہر ہو جانے کے بعد ظاہر ہو سکتی ہیں۔"

ٹیپو کو اس خبر نے پریشان کر دیا۔ باپ کی موت کا صدمہ اور کریم شاہ کی تخت نشینی کی تردد آمیز فکر۔ اسے شبہ گزرا کہ کہیں یہ اس کے خلاف کوئی سازش تو نہیں کی جا رہی ہے، باپ کی موت کا تو اسے یقین آ گیا تھا لیکن اس پر ہرگز یقین نہ تھا کہ شہزادہ کریم شاہ اس کے حق میں تخت و تاج سے بآسانی دستبردار ہو جائے گا۔ اس نے مہا مرزا خان کو عزت و احترام سے خیمے میں بٹھایا اور پھر دل میں اتر جانے والی نظروں سے اسے گھورتا ہوا بولا "کیا تم واقعی میرے وفادار ہو؟"

مہا مرزا خان عقیدت و احترام سے آگے کو کچھ جھک گیا "میری وفاداری پر خدا شاہد ہے شہزادے۔"

"اچھا تو ذرا ٹھہرو" ٹیپو خیمے کے دوسرے حصے میں چلا گیا اور وہاں سے جزدان میں رکھا ہوا قرآن پاک اٹھا لایا۔ اسے مہا مرزا خان کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "مہا مرزا خان بہتر ہے کہ اسے ہاتھ میں لے کر خدا کو شاہد لو۔"

مہا مرزا خان نے قرآن کو دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے تو اسے بوسہ دیا پھر چہرے سے لگا کر سر پر رکھ لیا اور چند قدم چلتا ہوا بولا: "اے خدا کے کلام! تو شاہد ہے کہ میں مہا مرزا خان یہاں کسی سازش کے ماتحت نہیں آیا ہوں سرنگا پٹم کے تاج و تخت شہزادے ٹیپو کے منتظر ہیں، ولی عہد کے پہنچتے ہی کریم شاہ کو تاج و تخت سے محروم اور شہزادے ٹیپو کو سریر آرائے سلطنتِ خداداد کر دیا جائے گا!"

ٹیپو نے ایک ادائے خاص سے مہا مرزا خان کو دیکھا اور اسے دوبارہ بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

اب ٹیپو کو اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ مہا مرزا خان نے جو کچھ بھی کہا حرف بحرف درست ہے، اس نے فوراً واپسی کے احکام جاری کیے اور بہ سرعت سرنگا پٹم کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے پہنچتے ہی شہزادہ کریم اس کے حق میں حکومت سے دستبردار ہو گیا اور تخت و تاج نہایت آسانی سے ٹیپو کے قبضے میں آ گئے۔ اہالیانِ دربار اور معززینِ سلطنت میں عہدے اور مناصب تقسیم ہوئے، مہا مرزا خان کو ایک خصوصی اعزاز ملا۔ ٹیپو اسے اپنا انتہائی قریبی دوست سمجھنے لگا۔

نواب حیدر علی کی موت نے دشمنوں کی ہمتیں بڑھا دی تھیں اور ماتحت قلعے دار سرکشی اختیار کرنے لگے تھے، ٹیپو یکے بعد دیگرے ان سب سے نپٹتا رہا۔ اسی اثنا میں اسے اطلاع ملی کہ اہلِ کورگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ سلطان ٹیپو کو یاد آیا کہ کورگ مرحوم نواب کے زمانے میں بھی کئی بار جرم بغاوت کے مرتکب ہو چکے ہیں، اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوج

کو تیاری کا حکم دیا۔ اور بارہ ہزار پیادے، دس ہزار سوار اور بائیس ضرب توپ لے کر کورگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دشوار گزار راستوں، ندی نالوں اور کوہستانی علاقوں کو روندتی ہوئی جب اس کی فوج کورگ کے رن منڈل میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ دشمن بھی اس سے مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ یہاں دونوں فوجیں آپس میں متصادم ہو گئیں اور دونوں میں گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی، سلطانی سپاہ فرانسیسی جرنیل موسیو لالی کے زیر کمان کورگ والوں پر ٹوٹ پڑی، اسی دوران جب خود سلطان اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ میدانِ جنگ میں کود پڑا تو آناً فاناً جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ باغیوں کی صفیں ٹوٹ گئیں اور وہ فرار ہو کر جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ سلطانی افواج نشۂ فتحمندی سے سرشار تھل کادیری، ملن ہلی اور خوشحال پور میں داخل ہو گئیں۔

ملن ہلی کا علاقہ مہا مرزا خان کے سپرد کر کے سلطان آگے بڑھ گیا۔ سلطان نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ ملن ہلی میں رہ کر کچھ انتظام کرے کہ آئندہ کورگ والے سر نہ اٹھا سکیں، مہا مرزا خان کے لیے یہ جگہ نہ صرف نئی بلکہ عجیب تھی، جن مقامی لوگوں نے اطاعت قبول کر لی تھی، انہیں ملازمتِ سلطانی میں داخل کر لیا گیا اور جو ابھی تک باغی تھے وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہو چکے تھے ملن ہلی کے چاروں طرف خندقیں کھدی ہوئی تھیں کیونکہ اس کے گرد و پیش جو جنگلات تھے۔ ان میں خوفناک درندے رہتے تھے اور ہاتھیوں کی سرکشی کا تو یہ عالم تھا کہ جب موقع ملتا دندناتے ہوئے ملن ہلی کی طرف بڑھتے لیکن خندقیں دیکھ کر واپس ہو جاتے۔ مہا مرزا خان نے سوچا کہ جب تک وہ یہاں ہے اسے دو دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہے، دشمن نمبر ایک وہ کورگی جو یہاں کے جنگلات اور پہاڑوں میں روپوش تھے اور دشمن نمبر دو وہ خونخوار جانور جو یہاں کے جنگلات میں پائے جاتے تھے، ان دو کے علاوہ ایک تیسرا دشمن ایسا تھا جسے مہا مرزا خان پہچانتا بھی نہ تھا، یہ وہ لوگ تھے جو ملن ہلی ہی میں رہتے تھے اور بظاہر مطیع اور فرماں بردار بھی ہو گئے تھے لیکن دلوں میں جذبۂ بغاوت رکھتے تھے۔ چنانچہ مہا مرزا خان جب بھی قلعے سے باہر نکلتا۔ حفاظتی دستہ ساتھ ہوتا اور اپنے آس پاس سے چوکنا اور ہوشیار رہتا۔

مہا مرزا خان کو یہاں رہتے ہوئے آٹھ ماہ گزر چکے تھے، اس عرصے میں سلطان ٹیپو نے اور کئی قلعے سر کر لیے تھے اور آس پاس اُس کی دھاک بیٹھ گئی تھی، جیسے جیسے سلطان کا رُعب بڑھ رہا تھا۔ ملن ہلی کے مقامی لوگ مہا مرزا خان کے رفادار ہوتے جا رہے تھے۔ جب مہا مرزا خان دریافت حال کے لیے ان کی آبادیوں میں جاتا تو یہ لوگ ایک عجیب حلیے میں نظر آتے، مردوں کے جسم پر گلے سے لے کر گھٹنوں تک کرتا ہوتا، سر چمڑے کی ٹوپی میں چھپے رہتے کمر ایک رومال سے کسی رہتی جس میں تیر لگے رہتے۔ بندوقیں ہاتھ میں رہتیں، ان کا نشانہ بہت کم خطا ہوتا تھا۔ عورتوں کا لباس مردوں سے مختلف تھا اور انہوں نے تو تخفیفِ لباس میں حد ہی کر دی تھی، سینے پر ایک دو ہاتھ کا رومال اس طرح بندھا رہتا کہ اس سے پیدا شدہ نیم برہنگی مردوں کی آتشِ شوق مشتعل رکھتی، ناف سے زانو تک دھوتی باندھتیں، ان دو کپڑوں کے سوا جسم پر کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس برہنگی اور عریانی کے ساتھ ہی انہیں حُسن اور صحت ایسی عطا ہوئی تھی کہ بڑے بڑے زاہدانِ شب بیدار بھی انہیں دیکھ کر گوشۂ عزلت سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے اور ان کے لطف و عنایت کی اُمید میں موعودہ جنت

[illegible]

پر طاری ہوتی جا رہی ہیں۔ جب وہ انہیں ان کے نیم عریاں لباس میں دیکھتا تو کچھ شرما جاتا لیکن یہ عورتیں ذرا بھی نہ شرماتیں، جب بھی ان کے سامنے سے گزرتا اشتیاق آمیز نظروں سے دیکھتی رہتیں اور جب وہ شرما کر گردن جھکا لیتا تو وہ شوخی سے مسکرانے لگتیں۔

مہا مرزا خان کو مخبروں نے اطلاع دی کہ شہر کے مغربی حصے میں مفرور باغیوں کے کچھ آدمی رسد حاصل کرنے آئے ہوئے ہیں، مہا مرزا خان نے فوراً سپاہیوں اور مخبروں کے ساتھ اُدھر کا رُخ کیا۔ اس وقت موسم بڑا خراب تھا گھٹائیں بہت گہری تھیں اور شمال میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی، سہ پہر کا وقت تھا لیکن شام کا گمان ہوتا تھا۔ راستے ناہموار تھے اور چند دنوں کی متواتر بارش نے نالوں اور پوکھروں کو لبالب کر دیا تھا۔ موسم اور راستے کی خرابیوں کے باوجود مہا مرزا خان باغیوں کے سر پر پہنچ گیا۔ یہاں کے مقامی لوگوں پر سلطان ٹیپو کی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ مہا مرزا خان اور اس کے آدمیوں کو دیکھتے ہی لوگ اپنے گھروں سے باہر آگئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ آنے والے باغیوں کی تلاش میں آئے ہیں تو انہوں نے کسی مقابلے کے بغیر انہیں مہا مرزا خان کے حوالے کر دیا۔ یہ تین آدمی تھے، مہا مرزا خان کی نظر میں یہ تینوں اس لیے زیادہ اہمیت رکھتے تھے کہ ان سے روپوش باغیوں کے ٹھکانے معلوم ہو سکتے تھے۔

جب مہا مرزا خان ان تینوں کو لے کر واپس آ رہا تھا تو یکایک زوردار بارش شروع ہو گئی۔ یہ لوگ مختلف گھنیرے درختوں کے نیچے کھڑے ہو گئے موسم جانے پہلے ہی سے ادھر رکھے تھے، دھواں دھار بارش کے اس پار کورگ کے نائروں کے مکانات خواب و خیال کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اسی وقت ایک طرف سے بھاگتے ہوئے تین اور مقامی آدمی بھی مہا مرزا خان کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی، یہ چاروں بارش میں بُری طرح بھیگ چکے تھے اور ان کا لباس جسم سے اس طرح چپکا ہوا تھا کہ سب کچھ بے نقاب ہو رہا تھا۔ لڑکی کے سینے کا رومال اس طرح چپکا ہوا تھا گویا سُرخ و سفید سر بند پہاڑوں پر پھاہا رکھ دیا گیا ہو۔ مہا مرزا خان نے ایک نظر اسے دیکھا اور محسوس کیا جیسے بجلی کوند گئی ہو، لڑکی نے بھی اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور پھر اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر مسکرا دی، مہا مرزا خان کے سپاہی بھی اُسے پوری آزادی سے دیکھنے کے لیے بے چین تھے لیکن اس کی موجودگی میں ایسا ناممکن تھا، صرف کنکھیوں سے دیکھنے پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔

اچانک مہا مرزا خان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی پنڈلی میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں وہ فوراً جُھک گیا، اس نے دیکھا تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دو جونکیں چمٹی ہوئی خون چوس رہی ہیں، وہ پریشان ہو گیا اسے معلوم تھا کہ یہ جونکیں اس وقت تک خون چوستی رہیں گی، جب تک سیر نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد گر جائیں گی، یہ بڑی بے بسی کا عالم تھا، لڑکی نے اُسے جُھکتے ہوئے دیکھا اور غالباً اس کی پریشانی کی وجہ سمجھ گئی۔ تیزی سے اس کے قریب پہنچ گئی اور پوچھا "کیا ہوا؟ کیا جونک چمٹ گئی ہے؟"

مہا مرزا خان کو حجاب سا آ گیا لیکن تکلیف میں مبتلا تھا۔ سادہ سا جواب دیا "ہاں، جونک نہیں، جونکیں چمٹ گئی ہیں، ایک نہیں دو جونکیں۔"

"اچھا!" وہ فوراً بیٹھ کر پنڈلی کی طرف جھک گئی اور دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑ کر معلوم نہیں کیا کیا کہ دونوں جونکیں الگ ہو گئیں، وہ ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی، کہنے لگی "یہاں جونکیں عام ہیں اور خاص کر درختوں کے نیچے، اور ہم لوگ خوب جانتے ہیں کہ ان خون کی پیاسی جونکوں کو کس طرح الگ کیا جائے؟"

مہا مرزا خان اس بے حجاب اور شوخ و شنگ لڑکی سے کچھ اتنا مسحور ہوا کہ شکریہ بھی نہ ادا کر سکا۔ اس کی آواز کے ترنم نے دل کی آگ کو کچھ اور بھڑکا دیا۔ اس نے لڑکی کے ساتھی مردوں کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا شاید ان مردوں کو لڑکی کی یہ حرکت ناگوار گزری ہو لیکن ان کے چہروں پر کرب، وحشت، حسد یا شکایت کا ذرا سا بھی اثر نہ تھا، وہ بالکل پُرسکون تھے، اُس نے سُنا، لڑکی مہا مرزا خان کی طرف اشارہ کر کے بتا رہی تھی کہ اس مسلم فوجی سردار کی پنڈلی میں دو جونکیں چمٹ گئی تھیں، جنہیں اس نے چھڑا دیا۔ تینوں نے ہنستے ہوئے اس طرح مہا مرزا خان کو دیکھا گویا کہہ رہے ہوں "واہ یہ بھی کوئی مسئلہ تھا جو اتنے پریشان ہو گئے؟"

مہا مرزا خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ جتنی دیر وہاں رہا، دوسروں کی نظریں بچا بچا کے لڑکی کو دیکھتا رہا، جب بارش کا زور ٹوٹنے لگا تو وہ دعا مانگتا کہ "خدایا! تھوڑی دیر اور۔ ابھی دل نہیں بھرا؟!"

لیکن خدا جانتا تھا کہ یہ تھوڑی دیر، کتنی طولانی ہو سکتی ہے، موسلا دھار بارش بوندا باندی میں تبدیل ہو گئی، مہا مرزا خان سے پہلے ہی لڑکی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اُسی طرف چل دی، جدھر سے یہ لوگ باغیوں کو گرفتار کر کے لا رہے تھے، لڑکی نے جاتے جاتے بھرپور نظروں سے مہا مرزا خان کو دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے مسکرا دی۔ دونوں ہونٹ ہلے اور فضا میں ایک ہلکا سا ترنم بکھر گیا "سیکی"!

مہا مرزا خان لفظ سیکی کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اس کی نظریں ان چاروں پر لگی رہیں جو لمحہ بہ لمحہ اس سے دُور اور اپنی آبادی سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ کافی دُور جا کے لڑکی نے ایک بار گھوم کر اسے پھر دیکھا اور پھر بستی کے مکانوں میں کہیں گُم ہو گئی۔

جن تین باغیوں کو مہا مرزا خان نے گرفتار کیا تھا، یہ مشہور باغی سردار ممونی نائر کے آدمی تھے۔ پہلے تو مہا مرزا خان نے ان سے ممونی نائر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہی، لیکن انہوں نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ بالآخر مہا مرزا خان نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں سلطان ٹیپو کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے وہ خود جیسا سلوک چاہے گا کرے گا۔

یہاں تنہا رہتے رہتے مہا مرزا خان کا جی اکتا گیا تھا اور پچھلے کئی دنوں سے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے بیوی بچوں کو سرنگا پٹم سے بلا لینا چاہیئے کیونکہ سلطان ٹیپو کی طرف سے اسے یہ حکم مل چکا تھا کہ وہ یہاں اس کے نائب کی حیثیت سے مستقل قیام کرے گا۔ جب تک اس نے اس ہوش رُبا نائر لڑکی کو نہیں دیکھا تھا، بیوی بچوں کو بلوانے کا خیال پایۂ ارادہ کی شکل اختیار کر چکا تھا لیکن اب یہ ارادہ بارش کے پانی میں کہیں بہہ چکا تھا وہ کچھ بھی سوچ رہا ہوتا لیکن اُس کی سوچ

کا آخری پہر اگھوم پھر کر نائر لڑکی کے خیال سے جا ملتا۔ یہ ایک ایسا پیچیدہ اور افسوس ناک مسئلہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے کسی مشیر سے کوئی مشورہ بھی نہ طلب کر سکتا تھا، اسے یہ سارا دکھ خاموشی سے خود ہی سہنا تھا۔ جہاں اسے اس بے حیا اور بے حجاب لڑکی پر غصہ آتا وہیں شرم اور ندامت بھی محسوس کرتا۔ کبھی دل یہ کہتا کہ اس اذیت کا واحد علاج یہ ہے کہ بیوی بچوں کو فوراً بلا لینا چاہیے۔ اور کبھی حریص دل یہ مشورہ رد کر دیتا کہ ابھی کچھ دن اور ٹھہر وا اور اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ اسی کش مکش اور تردد میں پوری رات آنکھوں ہی میں کٹ گئی۔ صبح جب مؤذن نے برائی سے بھاگنے اور نیکی کی طرف آنے کی بہ بانگ دہل دعوت دی تو وہ وضو کر کے اپنے ساتھیوں کی امامت کرنے لگا

نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ چاہتا تو ذرا دیر کے لیے ایک نیند لے لیتا لیکن یہ سوچ کر ایسا کرنے سے باز رہا کہ اس طرح عبادت کا لطف اور ثواب جاتا رہے گا۔ چنانچہ نماز کے بعد قرآن پاک کھول کر بیٹھ گیا اور جب سورۂ رحمٰن کی یہ تکرار بار بار دہرانا پڑی کہ "تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!" تو جیسے کان میں شیطان نے کہا کہ "یہ نائر لڑکی بھی خدا کی نعمت ہے، تم اس سے کس طرح منہ موڑو گے؟" مہامرزا خان کو اپنے اس شیطانی خیال پر رونا سا آ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر کہنے لگا: "اے اللہ العالمین! میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں۔ میرے خیالات اور شیطانی وسوسے میری عبادت کو کہیں ضائع نہ کر دیں۔ اس نائر لڑکی کے خیال سے نجات دلا!"

اسی لمحے اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ "جناب والا! کل والی لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے!"

اس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں، اس کا معتمد سامنے کھڑا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ دریافت کیا: "تم کچھ مجھ سے کہہ رہے ہو؟"

"ہاں!" اس نے کچھ جھجک کے عرض کیا: "کل والی لڑکی آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہے!"

"کیا وہ تنہا آئی ہے؟" اسے یقین اب بھی نہیں آ رہا تھا۔

معتمد نے جواب دیا: "نہیں اس کے تینوں ساتھی بھی اس کے ساتھ ہیں!"

مہامرزا خان کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ بولا: "انہیں عزت سے بٹھاؤ اور خصوصاً اس لڑکی کو زیادہ عزت سے بٹھاؤ کیونکہ اس نے کل مجھ پر ایک احسان کیا تھا"

معتمد واپس چلا گیا

مہامرزا خان اندر چلا گیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا، اسے اپنی شخصیت اور وضع قطع کچھ یوں ہی سی محسوس ہوئی چنانچہ وہ کچھ دیر کھڑا بنتا سنورتا رہا اور جب اسے اپنی شکل خود ہی پیاری لگنے لگی تو وہ باوقار انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھا جہاں نائر لڑکی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

جب وہ اس بیٹھک میں داخل ہوا تو اس کا دل ایک دم زور زور سے دھڑکنے لگا، لڑکی اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ہنستی ہوئی بولی: "کل ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اتنی جلدی تم سے دوبارہ ملنا پڑے گا!"

مہامرزا خان نے پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھا اور بے نیازی سے دریافت کیا: "خیریت؟ کوئی خاص بات؟"

"ہاں جناب بہت ہی خاص بات ہے!" لڑکی کہنے لگی "کیا تمہیں اس کا اقرار ہے کہ کل میں نے تم پر کوئی احسان کیا تھا؟"

"کیوں نہیں، بالکل یاد ہے!"

"اور کل تم نے ہمارا شکریہ بھی نہیں ادا کیا تھا!"

"ہاں بھول ہو گئی تھی، بات ذہن سے نکل گئی تھی" پھر مسکرا کر بولا "اب قبول فرمائیں ہمارا شکریہ!"

لڑکی نے بے رُخی اور اُداسی سے کہا "نہیں، مجھے تمہارا شکریہ نہیں چاہیئے۔ میں تمہارا شکریہ لے کر آخر کروں گی بھی کیا؟ یہ میرے کس کام کا!"

"پھر؟" وہ مجسمۂ عجز و انکسار بن گیا۔

"اگر میں اپنی اس خدمت کی کوئی قیمت طلب کروں تو کیا تم ادا کر دو گے؟"

"بالکل" مہامرزا خان نے بے سوچے سمجھے حامی بھر لی۔

لڑکی کے چہرے پر شوخی کی ہنسی نمودار ہوئی "خوب اچھی طرح سوچ لو"

"خوب سوچ لیا"

"تب پھر ان تینوں آدمیوں کو میرے حوالے کر دو جنہیں کل تم میرے گھر سے پکڑ کر لائے ہو!" لڑکی نے اپنی اس خواہش کا اظہار اتنے غیر متوقع، اچانک اور ڈرامائی انداز میں کیا کہ مہامرزا خان بوکھلا گیا۔ دل پوری طرح اس پر تیار تھا کہ لڑکی کی خواہش پوری کر دی جائے لیکن فکر اور مآل اندیشی روک رہی تھی، عقل کہہ رہی تھی کہ "یہ تینوں تیرے قیدی کب ہیں جو تو چھوڑ دے گا، یہ سلطان ٹیپو کے قیدی ہیں، تیرا ان پر کیا اختیار!"

لڑکی اس کا تذبذب بھانپ گئی۔ بولی "کل ہم لوگ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ جب تم انہیں گرفتار کرنے پہنچ گئے تھے اگر گھر ہوتے تو تم سے مقابلہ ضرور کرتے!"

مہامرزا خان نے اسے جھڑک دیا "تم ہمارا مقابلہ کرتیں؟ ہمارے سو آدمیوں کا مقابلہ بھلا کتنے آدمیوں سے؟" پھر اس کے تینوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "ان تین آدمیوں کی مدد سے؟"

لڑکی نے سینہ تان کر رعونت سے جواب دیا "ہاں ان تینوں کی مدد سے تمہارا مقابلہ کرتی اور پھر یا تو تم ہم سب کو قتل کر دیتے یا ہمیں آزاد کرا لیتی!"

"لڑکی؟" مہامرزا خان نے بے رُخی سے جواب دیا "تم واپس جاؤ افسوس کہ تمہاری یہ خواہش کسی قیمت پر بھی پوری نہ کی جا سکے گی!"

لڑکی نے معصومیت اور حیرت سے پٹر پٹر آنکھیں جھپکائیں اور سادگی سے کہا "تو کیا تم لوگ جھوٹ بھی بولتے ہو؟"

مہامرزا خان نے خفت سے جواب دیا "نہیں ہم جھوٹ نہیں بولتے!"

لڑکی نے معصومیت سے کہا "یہ دوسرا جھوٹ ہے۔ تم جھوٹے ہو!"

مہامرزا خان کو حیرت اور جھنجھلاہٹ تھی کہ یہ کیسی غیر مہذب اور زبان دراز لڑکی ہے کہ اسے جھوٹا ثابت کرنے پر مُصر ہے، لڑکی کا چہرہ اس کے اندرونی جوش اور جذبات کی وجہ سے سُرخ ہو گیا تھا اور سانسوں کے تموّج سے سینہ زیر و بم میں مبتلا تھا۔

"میں کہتی ہوں تم جھوٹے ہو!" لڑکی غصّے سے بولی "تم نے ابھی ابھی ہم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں جو چاہوں گی تم دو گے۔ لیکن اب تم اپنے وعدے سے پھر رہے ہو!"

مہامرزا خان کا معتمد آگے بڑھا اور اس نے لڑکی کو ڈانٹا "جاہل لڑکی! اپنی زبان قابو میں رکھ کچھ جانتی ہے کہ اس وقت تُو کس سے مخاطب ہے؟"

"اے!" لڑکی نے اسے بھی آڑے ہاتھوں لیا "ہم دونوں کے درمیان بولنے کا حق تجھے کس نے دیا؟ کل احسان تو میں نے اس پر کیا تھا۔ یہ اُس احسان کی قیمت دینا چاہتا ہے، پھر تو کیوں بول رہا ہے؟"

مہامرزا خان نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے معتمد کو چُپ رہنے کا اشارہ کیا، وہ چپ تو ہو گیا لیکن اس وقت اس کا خون جوش مار رہا تھا، اسے مہامرزا خان پر سخت غصّہ آیا جو ایک وحشی نار لڑکی کے حُسن سے متاثر ہو کر اس کی جا اور بے جا باتیں سن رہا تھا۔

اتنے میں لڑکی کے تینوں ساتھیوں میں سے ایک کہنے لگا "جناب والا! یہ لڑکی ہماری بہن ہے، ہم تینوں اس کے بھائی ہیں اور وہ تینوں جنہیں کل تم ہمارے گھر سے پکڑ لائے ہو، میری بہن کے منگیتر ہیں....."

مہامرزا خان کو اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا "کون منگیتر ہے؟"

بھائی نے جواب دیا "وہ تینوں ہی!"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ تینوں میری بہن سیمکی کے منگیتر ہیں، ہم مشہور نار سردار مموئی کے خاندان سے تعلّق رکھتے ہیں جب تمہارے سلطان کی فوجوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو ہمارا سردار مموئی اپنے بیشتر آدمیوں کے ساتھ یہاں سے فرار ہو گیا۔ ہم لوگ پیچھے رہ گئے۔ سیمکی کے تینوں منگیتر بھی مموئی سردار کے ساتھ ہی چلے گئے تھے، کل یہ تینوں چھپتے چھپاتے اس غرض سے آئے تھے کہ ہم سیمکی کی ان تینوں سے شادی کر دیں اور وہ اسے لے کر یہاں سے چلے جائیں!"

مہامرزا خان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا سوائے ایک بات کے کہ اس لڑکی کا نام سیمکی ہے، اسے یاد آیا کہ کل چلتے چلاتے لڑکی نے چیخ کر "سیمکی" جو کہا تھا تو اس کا شاید یہی مقصد تھا کہ وہ اسے اپنا نام بتا رہی تھی، مہامرزا خان نے سیمکی کی طرف دیکھا اور سوال کیا "سیمکی! کیا تمہارے بھائی نے جو کچھ کہا ہے، وہ درست ہے؟"

سیمکی کی آنکھیں چمکنے لگیں، خوشی اور جذبات کی شعاعیں اس طرح خارج ہو رہی تھیں کہ انہیں دیکھنے کے بجائے محسوس کیا جا سکتا تھا۔ سیمکی نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور مزے لیتی ہوئی بولی۔ "ہاں وہ تینوں میرے منگیتر ہیں"

"تینوں تمہارے منگیتر ہیں؟" اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں، لیکن تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟"

مہامرزا خان کا معتمد بھی آنکھیں پھاڑے یہ گفتگو سن رہا تھا۔

مہامرزا خان نے کہا "یعنی ان تینوں سے تمہاری شادی کر دی جائے گی؟"

"ہاں!" سیمکی نے جواب دیا "ابھی ایک کی اور گنجائش ہے"

اب مہامرزا میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیمکی نے اس کا تجسس ختم کر دیا۔ بولی "میں لڑکی ہوں، ہمارا سماجی قانون ہمیں ایک وقت میں چار مردوں سے شادی کی اجازت دیتا ہے یہ تینوں جو تمہاری قید میں ہیں میرے بچپن کے عاشق ہیں اور مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں!" اس کے بعد وہ روہانسی ہو گئی کہنے لگی "میں ان تینوں سے محبت کرتی ہوں مسلم سردار، تم بھی کسی سے محبت کرتے ہو گے، تمہیں اپنے خدا کا واسطہ کہ انہیں رہا کر دو"

سیمکی کی باتوں نے مہامرزا خان کی امید پر پانی پھیر دیا اور موہوم سا وہ رشتۂ امید جو خود بخود دل میں قائم ہو گیا تھا، ٹوٹنے کی حد تک کمزور ہو گیا۔ سیمکی اس کی صورت تکے جا رہی تھی اور چہرے کے آثار چڑھاؤ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ صادر ہونے والا فیصلہ کس حد تک امید افزا ہو سکتا ہے۔

مہامرزا خان اس طرح گویا ہوا، گویا خواب میں بول رہا ہو "سیمکی! ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہارے منگیتروں کو نہیں چھوڑ سکیں گے۔ دراصل انہیں چھوڑنے کا ہمیں اختیار ہی نہیں ہے، یہ سلطان کے باغی ہیں اور انہی کو یہ اختیار حاصل ہے، کہ چاہیں تو چھوڑ دیں اور چاہیں تو سزا دیں!"

سیمکی بے چین ہو گئی "تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

اس نے جواب دیا "ہم بس اتنا کر سکتے ہیں کہ سلطان کی خدمت میں ان کی رہائی کی درخواست بھیج دیں"

"اچھا تو تم یہی کرو!" وہ مایوسی سے بولی "لیکن جب تک تمہارے سلطان کا جواب نہ آئے تم ان تینوں کا خیال ضرور رکھنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے"

مہامرزا نے جواب دیا "درخواست کے ساتھ ہی یہ تینوں قیدی بھی سلطان کے پاس روانہ کر دیئے جائیں گے"

• سیمکی ایک دم گھبرا گئی "نانا ایسا نہ کرنا، انہیں یہیں رکھو اور درخواست سلطان کو بھیج دو"

یہ کہتے کہتے سیمکی نے کچھ اس طرح جھینک کر اور مسکرا کر مہامرزا خان کو دیکھا کہ وہ انکار نہ کر سکا۔ اس وقت سیمکی کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار پیدا ہو گیا اس کا نشہ مہامرزا پر چڑھ گیا اور نیم مدہوشی میں جواب دیا "اچھا سیمکی تم جیسا کہو گی ہم ویسا ہی کریں گے!"

معتمد کو یہ بات بری لگی، اس نے سوچا کہ یہ ایک بہترین موقع ہے، جس سے مہامرزا خان کو پس منظر میں پھینک

کہ اس کی جگہ حاصل کر لی جائے۔

مہامرزا خان نے سیمکی اور اس کے بھائیوں کو خوب اچھی طرح یقین دلایا کہ کچھ بھی ہو کوشش یہی کی جائے گی کہ یہ تینوں رہا کر دیئے جائیں۔"

چلتے چلاتے سیمکی نے آہستہ سے اس سے کہا "سردار! شکریہ، تم بھی اچھے آدمی ہو، اچھے اور دلکش بالکل اُن تینوں کی طرح، میرے منگیتروں کی طرح۔ پھر ضرور ملنا۔"

مہامرزا عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا، سیمکی، سردار خاندان کی لڑکی تھی، لیکن یہ لوگ غیر مہذب بہت تھے، اتنے غیر مہذب کہ انہیں لباس تک پہننا نہ آتا تھا، اسے سیمکی بہت پسند آئی تھی، لیکن مجبوری یہ تھی کہ اپنی پسند یا محبت کا اظہار کسی دوسرے پر ہرگز نہ کر سکتا تھا، کیونکہ اس میں اس کی سبکی تھی، خود سیمکی پر بھی اپنی محبت کے اظہار میں وہ ایک قسم کی خجالت سی محسوس کرتا تھا، کیونکہ دونوں کے تمدن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بہر حال اس کا سکھ چین اس سے چھن چکا تھا۔

اس نے تینوں قیدیوں کی بابت تفصیلی روداد لکھ کر سلطان ٹیپو کی خدمت میں روانہ کر دی اور سلطان سے دریافت کیا کہ "ان کے بارے میں جو حکم صادر فرمایا جائے گا اس پر عمل کیا جائے گا۔" آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ "تحقیقات سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ قیدیوں کا باغی فوج سے گہرا تعلق نہیں ہے بلکہ یہ غلطی سے باغیوں سے جا ملے تھے اب وہ اپنے کیئے پر شرمندہ ہیں اور اپنے ہی خاندان کی سیمکی نامی لڑکی سے تینوں شادی کرنا چاہتے ہیں، اور حلفیہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ شادی کے بعد سلطان کے وفادار بن کے رہیں گے۔"

شادی کے متعلق ان کی عجیب و غریب رسم کا اس طرح اظہار کیا تھا: "سلطان کو یہ جان کر حیرت بھی ہو گی اور غصہ بھی آئے گا کہ ان میں ایک عورت بیک وقت چار مردوں سے شادیاں کر سکتی ہے، چنانچہ ان تینوں باغی قیدیوں کی بابت ہمیں یہی معلوم ہوا ہے کہ تینوں سیمکی کے منگیتر ہیں۔"

سب کے آخر میں اپنی رائے اس طرح دی: "غلام کی کمترین رائے یہ ہے کہ ہمیں ان تینوں قیدیوں کو معاف کر دینا چاہیئے، ہمیں اس معافی سے کئی فائدے پہنچ سکتے ہیں پہلا فائدہ تو یہ نکلے گا کہ اس طرح باغی نائروں پر یہ اثر پڑے گا کہ سلطان حد درجہ خدا ترس اور فراخ دل ہیں، دوسرے باغی بھی مقابلے سے باز رہیں گے جو اس وقت ہمارے لیے بہت ضروری ہے ان کی رہائی سے دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ ہم انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے اعتماد میں لے لیں گے اور ہمارا یہ اعتماد مستقبل میں بہت کام آئے گا۔"

تیز رفتار قاصد مہامرزا خان کا پیغام لے کر سرنگاپٹم روانہ ہو گیا۔ لیکن مہامرزا خان کو اس کا قطعی علم نہ تھا کہ یہی قاصد اس کے معتمد کا بھی ایک خاص پیغام لے گیا تھا۔ معتمد کا خفیہ پیغام قاصد نے لمبی رشوت کے عوض لے جانا قبول کیا تھا، اس میں معتمد نے سلطان کو لکھا تھا:-

"سلطان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کا نائب یہاں کے نائر قبیلے کی ایک لڑکی سیمکی

پر بُری طرح فریفتہ ہو چکا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ نائب کورگ دمہامرزا خان نے اپنے مکتوب میں تینوں باغیوں کی رہائی کی پُرزور سفارش ضرور کی ہوگی۔ اگر نائب مہامرزا خان نے زیادہ دنوں اسی تغافل اور سستی سے کام کیا تو کورگ کا خدا ہی حافظ ہے۔"

مہامرزا خان بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اب جب سیمکی آئے گی تو وہ اس کے سامنے رنگ برنگے کپڑوں کا ڈھیر لگا دے گا۔ اور اس سے کہے گا کہ اس میں سے اپنی مرضی کے کپڑے نکال لو اور آئندہ اپنا بدن لباس سے چھپا کر آیا کرو۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکی اس کی یہ بات بہت پسند کرے گی۔

دوسرے دن، پورا دن سیمکی کے انتظار میں گزار دیا لیکن وہ نہیں آئی، بارش کا آج بھی وہی عالم تھا کہ زوروں پر ہو رہی تھی، دُھل دُھلا کر مکانات اور درخت ایسے نکل آئے تھے جیسے ابٹن کے بعد کسی کنوارے کا رنگ روپ، جیسے جیسے سیمکی کی آمد میں دیر ہو رہی تھی مہامرزا خان کے دل و دماغ پر شیطان قبضہ جماتا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے جی میں آئی کہ کیوں نہ ان تینوں کو ہلاک کر دیا جائے کیونکہ ان تینوں کی ہلاکت کے بعد سیمکی کے دعویدار ختم ہو جائیں گے اور اس وقت سیمکی کو حاصل کرنا بہت آسان ہوگا، لیکن ابھی وہ اپنے اس خیال کو اچھی طرح دل و دماغ میں جگہ بھی نہ دے سکا تھا کہ سیمکی تنہا آ گئی۔ آج اس کے سینے کا رومال مچھلی مٹی کی چھینٹ کا تھا اور نیچے کی دھوتی بھی اسی کپڑے کی تھی، آج اس کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج سیمکی یہ طے کر کے آئی تھی کہ مہامرزا خان کو پوری طرح فتح کیے بغیر نہ رہے گی، مہامرزا خان اسے لیے ہوتے قلعے کے اس حصے میں چلا گیا جہاں اس کے تینوں منگیتر قید تھے، دیکھنے والے یہ سمجھے کہ وہ سیمکی کو اسکے منگیتر دل سے ملانے کے لیے جا رہا ہے لیکن اس وقت اس کا کچھ اور ہی ارادہ تھا، وہ اسے دوسروں کی نظروں سے بچا کے ایک تنہا کمرے میں لے گیا۔ سیمکی کمرے کا ساز و سامان دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہاں کی ہر چیز شیر کی کھال جیسے رنگ کی تھی، کیونکہ یہ سلطان ٹیپو کا پسندیدہ رنگ تھا اور اس کے نائبین سلطنت بھی اس کی خوشنودی کے لیے یہی رنگ پسند کرتے تھے۔ فرش پر قیمتی قالین اور ان پر سفید چاندنیوں پر گاؤ تکیے دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئی۔ لکڑی کا سامان بھی ایسا نادر اور عجیب و غریب تھا کہ سیمکی نے ایسا سامان پہلے کہیں بھی نہ دیکھا ہوگا۔

مہامرزا خان نے اسے ایک چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن سیمکی تکلف اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی۔ کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن بس مسکرا کر رہ گئی۔

مہامرزا خان ذرا آگے بڑھا اور بالکل اس کے قریب پہنچ کر کہنے لگا "تم بیٹھتی کیوں نہیں؟"

سیمکی نے اُجڈ پنے سے جواب دیا "تم بیٹھ جاؤ، میں یوں ہی ٹھیک ہوں"

"نہیں، تم شرماؤ نہیں، اسے اپنا ہی گھر سمجھو!"

سیمکی کو شہری تکلف تو آتا نہ تھا۔ فوراً جھٹک کر جواب دیا "واہ اسے میں اپنا گھر کیوں سمجھوں، یہ تو تمہارا گھر ہے۔"

اس کی اس سادگی نے مہامرزا خان کو اور زیادہ ریجھا دیا، اس نے ذرا ہمت سے کام لیا، بڑھ کر سیمکی کا ہاتھ پکڑ لیا

اور زور دے کر چوکی پر بٹھانے کی کوشش کرتا ہوا بولا "سمیکی! تم بیٹھو تو، میں تم سے تمہارے منگیتروں کی بابت کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اب سمیکی فوراً بیٹھ گئی۔

مہامرزا خان اس کے مقابل بیٹھتا ہوا بولا "سمیکی! کیا اجازت ہے کہ ہم بھی یہیں بیٹھ جائیں؟"

سمیکی کو اس کی یہ باتیں کچھ اچھی نہیں لگیں، ذرا ناگواری سے بولی "سردار! تم کیسے آدمی ہو، پہلے بیٹھ جاتے ہو اس کے بعد مجھ سے بیٹھنے کی اجازت مانگتے ہو اور پھر تمہاری یہ بات بھی کتنی عجیب ہے کہ گھر تمہارا ہے، جہاں اور جب چاہو بیٹھ جاؤ، میں اجازت دینے والی کون؟"

مہامرزا خان خفیف ہو گیا اور ان چند جملوں سے کم از کم ایک بات اس کی سمجھ میں ضرور آ گئی وہ یہ کہ اس لڑکی سے گفتگو کے دوران تمدن کے تکلفات سے پرہیز ہی کرنا پڑے گا۔

سمیکی نے پوچھا "تمہارے سلطان نے میرے منگیتروں کے لئے کیا فیصلہ کیا؟"

مہامرزا ہنس دیا "اتنی جلدی جواب کس طرح آ سکتا ہے؟"

"پھر کتنے دن لگیں گے؟"

"کم از کم ایک مہینہ!" مہامرزا خان نے یونہی کہہ دیا۔

"ایک مہینہ!" اس نے تکلیف اور حیرت سے کہا "یہ تو بہت ہوتا ہے!"

"ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی سلطان کا کوئی حکم آ جائے۔"

"اچھا تو تم ایسا کرو کہ انہیں میرے حوالے کر دو، میں تم سے یہ وعدہ کرتی ہوں کہ جب تک تمہارے سلطان کا کوئی حکم نہ آ جائے گا، میں ان تینوں کو اپنے گھر میں رکھوں گی، انہیں کہیں بھی نہ جانے دوں گی۔"

سمیکی نے یہ درخواست اس طرح پیش کی تھی گویا یہ کوئی نہایت معمولی سا معاملہ ہو۔

مہامرزا نے افسوس سے جواب دیا "سمیکی! ہم شرمندہ ہیں کہ تمہاری درخواست پر عمل نہ کر سکیں گے۔"

"اچھا تو تم مجھ سے ایک معاملہ کر لو" سمیکی نے ایک تجویز پیش کی "مجھے ان تینوں کو لے جانے دو، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میرے چوتھے دولھا تم ہو گے۔ کہو منظور؟"

مہامرزا خان کو چکر سا آ گیا۔ اس نے کہا "سمیکی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

سمیکی نے سادگی سے جواب دیا "تم کچھ اونچا تو نہیں سنتے؟" پھر ذرا زور سے بولی "میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم میرے منگیتروں کو اسی وقت میرے حوالے کر دو، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میرے چوتھے دولھا تم ہو گے!"

مہامرزا لاجواب ہو گیا لیکن پھر معلوم نہیں اس کے جی میں کیا آئی کہ اٹھ کر برابر والے کمرے میں جاتا ہوا بولا "سمیکی ہم ابھی آتے ہیں، تم ہمارا انتظار کرو!"

سمیکی حیرت سے اسے دیکھنے لگی یہاں تک کہ وہ دوسرے کمرے میں اوجھل ہو گیا۔ اس کے پیچھے سمیکی نے اس کمرے کا سامانِ تعیش حسرت اور حیرت سے دیکھا اور کچھ مرعوب سی ہو گئی۔

مہامرزا خان جب واپس آیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں رنگ برنگے کپڑوں کے بہت سارے ٹکڑے تھے اس نے انہیں سمیکی کے آگے ڈالتے ہوئے کہا "سمیکی! تم انہیں لے جاؤ اور ان سے ایسا لباس سلوا لو جس سے تمہارا نصف اوپری حصہ ڈھک جائے!"

سمیکی نے شوق اور اشتیاق سے ان ٹکڑوں کو دیکھا پھر بولی "ان کے رومال بڑے اچھے رہیں گے!"

"رومال نہیں قمیص سمیکی!"

سمیکی کھڑی ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے مہامرزا خان قمیص بنوانے کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور کہنے لگی "سردار! تم ہمیں قمیص بنوانے کا حکم تو نہیں دے سکتے!"

مہامرزا نے جواب دیا "سمیکی! ہم تمہیں حکم نہیں دے رہے، درخواست کر رہے ہیں!"

سمیکی نے حقارت سے کہا "لیکن سردار! ہم نے تو تمہیں اس پر نہیں مجبور کیا کہ تم بھی ہمارا لباس پہنو، پھر تم ہمیں اس پر کیوں مجبور کر رہے ہو؟"

مہامرزا پھر لاجواب ہو گیا۔ یکایک دل میں پیار کا سوتا پھوٹ نکلا، وہ بے قابو ہو گیا۔ سارے تکلفات اور اخلاقیات کو بالائے طاق رکھا اور بڑھ کر سمیکی کو آغوش میں لے لیا۔ اس کا خیال تھا سمیکی کچھ پس و پیش ضرور کرے گی لیکن وہ تو بالکل ہی خاموش رہی اور اس نے خود کو بالکل مہامرزا کے حوالے کر دیا۔

مہامرزا خان نے اسے پوری طاقت سے بھینچ لیا۔ وہ بھی نائر قبیلے کی لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک، رخساروں کی سرخی اور سانسوں کے تموج نے مہامرزا خان کی پیش قدمی اور جارحانہ اقدام کا فراخ دلانہ استقبال کیا۔ اور مہامرزا کے بوسوں کا جواب بوسوں سے اور بھینچنے کا جواب بھینچنے سے دیا لیکن یکایک مہامرزا خان کے جذبات سرد پڑ گئے، وہ تو تکلفات کا عادی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سمیکی کچھ مزاحمت کرے گی ہاتھ پیر چلائے گی، دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکیل کر خود بھی پیچھے ہٹ جائے گی، اس کی ایک ایک ادا میں وحشت اور گھبراہٹ موجود ہو گی لیکن یہاں تو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ سمیکی نے اپنا سب کچھ کسی معمولی سی مزاحمت کے بغیر ہی اس کے حوالے کر دینا چاہا تھا اور یہی بات مہامرزا کو بالکل پسند نہ آئی تھی۔

سمیکی نے حیرت اور غصے سے مہامرزا کو گھورا "تم دور کیوں ہٹ گئے! کیا ہوا؟"

مہامرزا خان نے اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور کرب کے عالم میں بولا "تمہیں پہلے ہمارا تمدن سیکھنا چاہیے، تکلف، جھجک، حیا اور شرم جو حسن کی جان ہوتے ہیں، تم ان سے بالکل محروم ہو سمیکی۔ تم گلے لگ جانے کے بعد بھی ہمیں اجنبی اور بیگانہ سی محسوس ہوتی رہیں اور ہم نے ایسا محسوس کیا کہ ہم دونوں میں کچھ ایسی باتیں ضرور ہیں جو متغائر اور متضاد ہیں"

سیمکی اس کی باتیں بالکل نہ سمجھ سکی، اس نے جواب دیا "میں تمہیں اپنا چوتھا دولہا بنا سکتی ہوں لیکن شرط یہی رہے گی کہ تم میرا لباس ہی پہنتے رہو گے اور شادی ہمارے اپنے رواجوں کے مطابق ہو گی"

"سیمکی! ہم مسلمان ہیں، کیا تم بھی مسلمان ہو جانا پسند کرو گی؟"

"نہیں!" سیمکی نے جواب دیا "مجھے تم اچھے لگتے ہو، میں مسلمان نہیں تمہاری دلہن بن سکتی ہوں"

کہیں دور سے ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ سیمکی زور سے ہنس دی، بولی "جانتے ہو یہ ہاتھی کیوں چنگھاڑ رہا ہے؟"

مہامرزاخان نے گم سم انداز میں، نفی میں گردن ہلا دی۔

سیمکی نے شوخی سے جواب دیا "اسے دلہن کی تلاش ہے!" پھر اچانک سنجیدہ ہو گئی، کچھ ٹھہر کر بولی "اسی طرح میں بھی اپنے منگیتروں کے لیے اداس ہوں، اس شرابی موسم میں جب والیو دیوتا کسی تنہا جوانی کو چھیڑتے ہوئے گزرتے ہیں تو پورے بدن میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے، سردار! جوانی کے بھی کچھ مطالبے ہوتے ہیں، میں بھی کچھ چاہتی ہوں!" اس کے بعد بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "ہمارے منگیتروں کو چھوڑ دو سردار!"

مہامرزاخان بھی بے بس ہو گیا۔ سلطانی عتاب کی پرواہ کیے بغیر وہ اس کے منگیتروں کی رہائی پر آمادہ ہو گیا، بولا "سیمکی! میں تمہارے منگیتروں کو ایک شرط پر چھوڑ سکتا ہوں"

سیمکی اس کی صورت تکنے لگی گویا پوچھ رہی ہو "بتاؤ وہ شرط کیا ہے؟"

مہامرزاخان نے کہا "تم ان تینوں سے اس وقت تک شادی نہیں کرو گی جب تک ہم سے کچھ تفصیلی باتیں نہ ہو جائیں"

"منظور!" سیمکی نے بے پس و پیش جواب دیا۔

مہامرزاخان نے کہا "اس وقت تو تم چلی جاؤ، رات کی تاریکی میں کسی وقت تمہارے منگیتر بھی تمہارے گھر پہنچ جائیں گے"

سیمکی نے طنز کیا "سردار! تم شہر والوں کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی پیچ ضرور ہوتا ہے!"

"ایسا ہی سمجھ لو" اس نے جواب دیا "اپنا آگا پیچھا دیکھ کر کام کرنا پڑتا ہے"

سیمکی نے چلتے چلاتے مہامرزاخان کا ایک بوسہ لے لیا۔ الوداعی بوسہ اور اسے ایک بار پھر سیمکی سے کراہت سی محسوس ہونے لگی۔

مہامرزاخان نے جس وقت سیمکی سے اس کے منگیتروں کی رہائی کا وعدہ کیا تھا، وہ مخلص تھا لیکن جب سیمکی چلی گئی تو معاً یہ بات ذہن میں آئی کہ اس کے اور سیمکی کے مابین ملاقات کا سبب یہی قیدی ہیں، اگر وہ چھوڑ دیے گئے تو پھر سیمکی کی ملاقات بڑی اتفاقی ہو جائے گی۔ اس کی نیت بدل گئی، لیکن جب اس مسئلے پر اس نے بہت زیادہ سوچا تو طبیعت بدمزہ ہو گئی۔ سیمکی غیر مہذب اور بے حجاب لڑکی تھی اگر وہ کسی طرح اسے حاصل بھی کر لے گا تب بھی بات

نہیں بنے گی اور جب سیمکی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا ہے تو اس کے منگیتروں کی رہائی فضول سی بات ہے، خوامخواہ سلطانی عتاب کیوں مول لیا جائے۔ آخر وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ بیوی بچوں کو جلد از جلد بلا لینا چاہیئے، تاکہ ان خرخشوں سے نجات ملے۔

نصف شب بیت گئی لیکن نیند نہ آئی بار بار سیمکی کا چہرہ اور اس کی دلچسپ اور سادہ لوحی کی باتیں یاد آتی رہیں، اس کے لہجے اور باتوں کا جادو دل میں آگ لگاتا رہا حقائق پسندی اور خوش فہمی میں جنگ ہوتی رہی، رات گزر گئی اور اصل مسئلہ جہاں تھا وہیں رہا۔ صبح معتمد کی متجسس نگاہوں نے رات کے کرب اور شب بیداری کا حال پڑھ لیا۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ ضروری کاغذات تھے اور وہ مہامرزا خان کو یہ یاد دلا رہا تھا کہ بعض اہم معاملات اس کی توجہ کے مستحق ہیں اور سلطان کے ایک خاص مراسلے کا تفصیلی جواب دینا ہے، وہ دونوں ایک ساتھ دیوان میں داخل ہوئے اور سرکاری کاغذات کھل کھل کر سامنے آنے لگے۔ پچھلی رات کی بیداری اور فکرمندی نے اس کے اعصاب تھکا ڈالے تھے اور سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا، معتمد ایک کاغذ پڑھتا اور رک کر اس کی صورت دیکھنے لگتا کہ مہامرزا اس پر کیا فیصلہ دیتا ہے لیکن اسی لمحے اس کے کان میں گزشتہ دن کے ہاتھی کی چنگھاڑ گونجنے لگتی اور پھر سیمکی کا یہ سوال سنائی دیتا۔ "جانتے ہو یہ ہاتھی کیوں چنگھاڑ رہا ہے؟"

اور مہامرزا خان نفی میں گردن ہلا دیتا۔ معتمد یہ سمجھ گیا کہ مہامرزا خان کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ اس نے سارے کاغذات سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیئے اور ایک سرخ رنگ کا کاغذ کھول کر بیٹھ گیا۔ مہامرزا خان نے اس پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی اور ایک دم ہوش میں آ گیا، پوری توجہ سے اس کاغذ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "یہ سلطانی مکتوب کب آیا؟"

معتمد نے سردمہری سے جواب دیا "کل"

"کون لے کر آیا ہے؟"

"سلطان کا ہرکارہ"

"وہ کہاں ہے؟"

"مملکت کے مہمان خانے میں!"

"اُسے ہمارے پاس کیوں نہیں لایا گیا"؟

معتمد نے اسے شریر نظروں سے دیکھا اور آنکھیں جھکا کر مسکراتا ہوا بولا۔ "اس وقت آپ نائر لڑکی سے مصروفِ گفتگو تھے، میں نے مداخلت مناسب نہ سمجھی۔"

مہامرزا خان سناٹے میں آ گیا، اس کا خیال تھا کہ سیمکی سے اس کی ملاقات کا علم معتمد کو ہرگز نہ ہوگا، وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

کہنے لگا "شاہانِ ذی احترام، جلد سے جلد آ ... انہیں فوراً ہمارے ملاحظے میں پیش کرنا چاہیئے۔"

معتمد نے جواب دیا: "آئندہ ایسا ہی ہوگا"

مہامرزا نے اسے حکم دیا: "سلطان کا فرمان پڑھ کر سناؤ"

معتمد نے آہستہ آہستہ فرمان پڑھنا شروع کیا۔

"مہامرزا خان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمیں نائروں کی نیم جنگلی تہذیب سے پریشانی لاحق ہو رہی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ تم انہیں آدمی بنانے کی کوشش کرو اور وہاں کے حالات اور لوگوں کی ذہنی کیفیت نظر میں رکھ کر کچھ ایسی اصلاحات کرو کہ ان کا جنگلی پن رفتہ رفتہ دور ہو جائے۔

ہمیں ان کی عورتوں کے حسن اور برہنگی سے یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ہماری سپاہ مصیبت میں نہ مبتلا ہو جائے تمہیں اس خصوص میں خاص توجہ دینی چاہیئے۔ نائر مفتوح ہیں اور ہم فاتح، ہمارے سپاہیوں کو اقتدار اور حکومت کے زعم اور نشے میں نائر عورتوں کی آبرو اور مقامی لوگوں کے مال و منال کے معاملے میں حدِ اعتدال سے نہیں نکلنا چاہیئے اگر تم یہ محسوس کرو کہ نائر عورتوں کا حسن اور دلکشی تمہارے آدمیوں کے ضبط اور احتیاط کو تباہ اور برباد کیئے دے رہے ہیں تو تم نائروں کے سامنے اسلام پیش کرو اور انہیں ہر طرح یہ یقین دلانے کی کوشش کرو کہ وہ مسلمان ہونے کے بعد بہت فائدے میں رہیں گے۔ جب وہ مسلمان ہو جائیں تو ان کی عورتوں سے اپنے آدمیوں کی شادیاں کر کے رشتے داریاں قائم کرو، ہمارا خیال ہے کہ اس طرح کچھ عرصے بعد دو بہتر نتیجے برآمد ہوں گے، ایک تو یہ کہ ہم ان میں گھل مل جائیں گے اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح وہاں کے نیم وحشی لوگ انسان بن جائیں گے، لیکن ایک بات کا بطورِ خاص خیال رہے، وہ یہ کہ اس منصوبے میں جبر اور زبردستی سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔"

فرمان کی لوح پر سلطان کی مہر موجود تھی۔ اس مکتوب سے مہامرزا خان بہت خوش ہوا اور اسے یقین ہو گیا کہ سلطان رواداری میں سمیکی کے تینوں منگیتروں کی رہائی کا حکم دے دے گا چند ثانیوں کے لیے ذہن میں یہ بات آئی کہ اب جبکہ سلطان کی اجازت مل ہی جائے گی تو کیوں نہ تینوں قیدیوں کو پہلے ہی رہا کر دیا جائے، اس طرح سمیکی کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی لیکن ان کی رہائی سے پہلے اسے یہ ضروری محسوس ہوا کہ سمیکی سے ذرا کھل کے مفاہمت کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے اور یقین دلایا جائے کہ مسلمان ہو جانے کے بعد اس کے مرتبے، اعزاز اور دولت میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا اور پھر اس سے یہ درخواست بھی کی جائے کہ ایک وقت میں کئی کئی مردوں سے کسی ایک لڑکی یا عورت کا شادی کرنا چونکہ ازروئے اسلامی قانون ناجائز ہے اس لیئے اپنے تینوں منگیتروں کو چھوڑ کر وہ اس سے شادی کر لے۔ مہامرزا خان کا خیال تھا کہ سمیکی کے خیال میں غالباً عشق یا محبت نام کی کوئی شے نہیں ہوتی، اس لیے شوہر نام کا کوئی شخص بھی اس کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر سمیکی واقعی عشق یا محبت کی قائل ہوتی تو یقیناً تین آدمیوں کو بخوشی بیک وقت شوہر بنانے پر تیار نہ ہوتی اور ان تینوں کے بعد جب اچانک خود وہ مرزا خان اس کے سامنے آیا تو چوتھے شوہر کی حیثیت سے اسے

قبول کرنے پر تیار ہو گئی۔ سوچتے سوچتے دل اُلجھ گیا۔ خیالات اور سوچ کا یہ ایک طولانی سلسلہ تھا جس کا کوئی اور چھور نہ تھا، اسے اس وقت ہوش آیا جب معتمد کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ معتمد پوچھ رہا تھا "ہمیں اس مسئلے کا فوراً ہی جواب تیار کرنا ہے کیا آپ ہمیں مطلع فرمائیں گے کہ سلطانی ہرکارہ کب تک یہاں قیام پزیر رہے گا؟"

مہامرزا خان نے جواب دیا "کل تک، لیکن جواب سے پہلے ہم تم سے تفصیلی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

دیوان کے آس پاس کے کمروں میں سرکاری متصدّی اور دوسرے عہدے دار اپنے اپنے فرائض انجام دینے میں مشغول تھے، معتمد نے ان کی بھنبھناہٹ پر کان لگاتے ہوئے کہا "غالباً اس کے لیے تخلیہ درکار ہوگا؟"

"ہاں!" مہامرزا نے جواب دیا "تم بہت سمجھ دار آدمی ہو!" اور وہ مسکرا دیا۔

معتمد بھی مسکرانے لگا، کھڑا ہوتا ہوا بولا "آپ کی صحبت اور نوازشوں نے سمجھ دار بنا دیا ہے، ورنہ اس سے پہلے میں کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں!"

مہامرزا خان بھی کھڑا ہو گیا۔ متبسّم لہجہ میں بولا "نہیں، تمہیں تمہارا جوہر قابل آگے بڑھا رہا ہے!"

اس کے بعد یہ دونوں باتیں کرتے ہوئے دیوان سے دُور چلے گئے۔ سامنے سبزے کا فرش بچھا ہوا تھا۔ دونوں اپنے ہاتھوں کو کمر کی پشت پر باندھ کر ٹہلنے لگے۔

مہامرزا خان نے کہا "بخشی! ہم تم سے بعض اہم معاملات میں مشورے چاہتے ہیں اور چونکہ ان دنوں ہم چند ناقابلِ بیان اُلجھنوں کا شکار ہو گئے ہیں، اس لیے ہمارا دماغ کوئی کام نہیں کر رہا!"

معتمد بخشی نے فرمان برداری سے سراپا عجز و نیاز بن کر عرض کیا "خادم ہر طرح خدمت کو حاضر ہے میں خود بھی کئی دنوں سے یہی محسوس کر رہا تھا کہ جناب کچھ بہت زیادہ پریشان نظر آتے ہیں لیکن یہ سوئے ادب تھا کہ آپ سے آپ کے دل کا بھید لینے کی کوشش کرتا۔"

مہامرزا خان اس کی میٹھی میٹھی باتوں کے دام میں آ گیا۔ بولا "تم نے اس ناہنجار لڑکی کو خوب اچھی طرح دیکھا ہے نا جس نے میری پنڈلی سے جونکیں الگ کی تھیں؟"

بخشی نے جواب دیا "ہاں جناب خوب اچھی طرح دیکھا ہے اور اس خادم نے جب سے اسے دیکھا ہے پریشان ہو رہا ہے؟"

مہامرزا خان نے چونک کر اسے دیکھا "کیوں؟ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟"

بخشی دونوں ہاتھ کمر کی پشت سے ہٹا کے ہتھیلیاں رگڑنے لگا۔ بولا "جناب تو یہ جانتے ہی ہیں کہ خادم کو اس درجے پر لانے والا کون ہے؟ وہ آپ ہی تو ہیں جس نے سلطان سے میری سفارش کی تھی اور مجھے اپنا معتمد بنایا تھا بندہ آپ کا یہ احسان کس طرح فراموش کر سکتا ہے!"

مہامرزا خان نے پُروقار آواز میں کہا "مطلب بیان کرو، طولِ طویل تمہید کی کوئی ضرورت نہیں!"

بخشی نے کہا "پہلے دن ہی خادم کے دل میں یہ بات آئی تھی کہ اتنی حسین لڑکی کو جناب کے گھر میں ہونا چاہیئے"

"لیکن تمہیں یہ بھی تو معلوم ہے کہ ہم شادی شدہ ہیں اور ہمارے چار بچے بھی ہیں!"

"خوب جانتا ہوں!" بخشی کے چہرے پر بناوٹی خوشی پھیلی پڑ رہی تھی، آنکھوں میں مکر کے آنسو آ گئے۔ "اور یہ بندۂ ناچیز یہ بھی جانتا ہے کہ جناب ابھی تین شادیاں اور کر سکتے ہیں اور خادم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جنابِ والا کے چہرے سے یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ آپ شادی شدہ ہیں اور چار بچوں کے باپ بھی ہیں!"

جھوٹی مدح سرائی اور پُرلطف خوشامد نے مہامرزا کی دانائی کو صید کر لیا۔ اس نے دل کا راز اُگل دیا۔ کہنے لگا، "بخشی! تم ہمارے معتمد ہو اس لیے ضروری ہے کہ تم ہمارے ذاتی معاملات سے بھی آگاہ رہو اور ہمیں مشورہ دیتے رہو" ذرا دیر کے لیے سکوت اختیار کیا۔ پھر بولا "ہم نے جب سے اُس لڑکی کو دیکھا ہے دل پر لاکھ قابو رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ قابو ہی میں نہیں آتا کچھ تم مشورہ دو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

بخشی نے جواب دیا "یہ حقیر تو پہلے ہی اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہے کہ اتنی حسین لڑکی کو آزاد پرند کی طرح پھرنے نہیں دینا چاہیئے۔ اپنے محل کا پنجرہ کھول کے اسے فوراً اپنے قابو میں کر لیں"

مہامرزا خان نے فکرمند لہجے میں کہا "لیکن راہ میں چند مجبوریاں جو حائل ہیں، ان کا کیا کریں؟"

"ارشاد فرمائیں ہو سکتا ہے ان کے حل بھی نکل آئیں"

مہامرزا خان نے جواب دیا "لڑکی کے تینوں منگیتروں کا کیا کیا جائے؟ اور پھر یہ کہ لڑکی نہایت آزاد فضا کی پروردہ ہے، وہ یہ کس طرح پسند کرے گی کہ اپنے خاندان، رسم و رواج، غیر مہذب ذہن اور مزاج اور ایک خاص روایتی ماضی سے صرف ہماری خاطر کنارہ کشی اختیار کر لے۔ صرف ہمارے لیے ہماری خاطر جس سے اسے کوئی اُنس بھی نہیں!"

"نہیں جناب!" بخشی نے کہا "کل غلام نے آپ کے قریب اُس کی ایک جھلک دیکھی تھی اور اُس وقت اُس لڑکی پر جو کیفیت طاری تھی اس کے پیشِ نظر تو یہ ناچیز وثوق سے یہ عرض کر سکتا ہے کہ لڑکی جنابِ والا سے بے پناہ محبت کرتی ہے!"

مہامرزا حیران رہ گیا، اسے یقین ہو گیا کہ بخشی نے یقیناً سب کچھ دیکھ لیا ہے، لیکن یہ کس طرح؟ وہاں تک یہ کس طرح پہنچ گیا؟

"تم وہاں کس طرح پہنچ گئے تھے؟"

بخشی نے جواب دیا "جب سلطان کا مکتوب وصول ہوا تو یہ بندہ فوراً ہی آپ کی خدمت میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ جناب کے چند خاص خدمت گاروں نے اس حقیر کو روکنا بھی چاہا لیکن جب انہوں نے میرے ہاتھ میں سُرخ کاغذ دیکھا تو چپ ہو گئے اور کوئی تعرض نہ کیا کیونکہ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ سلطان کے مکاتیب اور فرامین ہمیشہ سُرخ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں"

مہامرزا چور سا بن گیا۔ بخشی کہتا رہا "پھر جب خادم نے جناب کو کھڑکی کے ساتھ ایک مخصوص حالت میں دیکھا تو اُلٹے قدموں واپس آ گیا اور سلطان کا مراسلہ صحیح جناب کی خدمت میں پیش کیا"

اب بخشی سے کچھ چھپانا بے سود تھا۔اس نے کہا: "خیر جو کچھ تم نے دیکھا اُس میں ہماری اپنی مرضی یا خواہش کو کوئی دخل نہ تھا اُس وقت وہاں جو کچھ بھی ہوا، اس میں سبکی کی بے اعتدالیاں اور غیر مہذب، نیم وحشی خوش فعلیاں ہی سب کچھ تھیں، ایسی بے دھڑک اور جرأت آزما لڑکی کو آخر ہم کس طرح انسان بنا سکتے ہیں اور کیونکر رام کر سکتے ہیں اسی سوچ میں سرگرداں ہیں، کل اس نے ایک نئی مشکل میں مبتلا کر دیا۔ کہتی ہے، میرے منگیتر کو رہا کر دو، یہ سلطنتِ خداداد کے وفادار رہیں گے۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

معتمد نے فوراً مشورہ دیا " جناب انہیں بلا چوں وچرا رہا فرما دیں، لیکن چھوڑنے سے پہلے لڑکی سے کچھ عہد و پیمان ضرور لے لیں۔"

مہا مرزا اُس کی صورت دیکھنے لگا۔

معتمد نے کہا "اگر جناب کو اس غلام پر کچھ اعتماد ہے تو یہ عرض کرے گا کہ اس لڑکی کو میرے حوالے فرما دیں، یہ سارے معاملات میں خود طے کر دوں گا۔"

مہا مرزا خان کسی جن کی طرح اپنے معتمد کی میٹھی میٹھی باتوں کی بوتل میں اُتر گیا۔ بولا "ہم تمہیں اختیار دیتے ہیں کہ اس لڑکی کو جس طرح چاہو ہمارے حق میں رام کر لو، اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ سلطان سے سفارش کر کے تمہیں بھی کہیں کا سپہدار مقرر کرا دیں گے۔"

معتمد نے کچھ جھک کر پیشگی شکریہ ادا کیا۔ مہا مرزا نے مزید کہا "سلطان کے مکتوب کا ہم کل تک جواب تیار کر لیں گے، ہرکارے سے کہو اطمینان رکھے اور ہاں، ہمیں اُس محاذ پر بھی کام کرنا ہے جس کا سلطان نے مشورہ دیا ہے"

"وہ بالکل بجا، درست!" معتمد نے جواب دیا۔

یہ دونوں جدا ہونے ہی والے تھے کہ سامنے سے دیوان کا ایک معمولی کارندہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ قریب آکر سرکاری آداب بجا لایا اور معتمد کی شکل اس طرح دیکھنے لگا۔ گویا کچھ عرض کرنے کی اجازت طلب کر رہا ہو۔

معتمد نے رعونت سے کہا "عرض کیا جائے!"

کارندے نے عرض کیا "بستی کا ایک معزز ہندو بنیا دیوان میں حضور سے ملاقات کا خواستگار ہے۔"

مہا مرزا نے حیرت سے پوچھا "ہندو بنیا یہاں بھی موجود ہے؟"

"جی جناب والا" معتمد نے جواب دیا "اور ایک نہیں کئی موجود ہیں"

"خوب!" وہ مسکرایا "یہ بھی عجیب ذات ہوتی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاں دو انسان ہوں گے وہاں تیرا ہندو بنیا خود بخود پہنچ جائے گا"

"جی" معتمد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

مہا مرزا خان نے کہا "چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ اُس بنیے کو ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں"

اور یہ دونوں بھی کارندے کے ساتھ ہی دیوان میں پہنچ گئے، وہاں ایک سوکھا سڑا ستر بہتر سالہ بنیا اکھو کے مکان

کی طرح پیٹ پھلائے بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ دونوں کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا، اور دُہائی دیتا ہوا بولا "صاحبو! میں لُٹ گیا، تباہ ہو گیا، برباد ہو گیا!"

مہامرزا خان نے نرمی سے دریافت کیا "تم پر کس نے ظلم کیا؟"

بنیا کہنے لگا "صاحب! ہم یہاں پچھلے پندرہ سال سے اپنا دھندا چلا رہے ہیں، میرا ایک ہی لڑکا ہے، اٹھارہ سال کا۔ کل اسے چند نائر پکڑ کر لے گئے ہیں، کہتے ہیں دو ہزار اشرفیاں دو، تو چھوڑیں گے ورنہ لڑکے کو قتل کر دیں گے۔"

یہ کہہ کر بنیا زار و قطار رونے لگا۔

دیوان کے سبھی آدمی سناٹے میں آ گئے۔

مہامرزا بھی ہکا بکا رہ گیا۔ دریافت کیا "وہ نائر کہاں ہیں؟"

"بستی کے ایک مکان میں!"

"تمہارا لڑکا کہاں ہے؟"

"اسی مکان میں ان نائروں کے ساتھ۔"

"تم نے وہ مکان دیکھا ہے؟"

"ہاں جناب دیکھا ہے۔"

مہامرزا خان نے کہا "چلو، ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔"

بنیا گڑگڑا رہا "صاحب وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، میں نے بڑی محنت سے پالا ہے۔ ماں کا تو بُرا حال ہے۔"

مہامرزا خان نے معتمد کو حکم دیا کہ چالیس پچاس سپاہیوں کا انتظام کیا جائے، وہ اسی وقت اس مکان کا محاصرہ کر کے لڑکے کو آزاد کرانے کی کوشش کریں گے۔

معتمد فوراً وہاں سے چلا گیا۔ مہامرزا خان نے بنیئے سے کہا "ہم تمہارے ساتھ چل تو رہے ہیں، لیکن کیا تمہارے پاس دو ہزار اشرفیاں نہیں ہیں کہ نائروں کو دے کر بیٹے کو چھڑا لو؟"

"ہیں کیوں نہیں دو ہزار اشرفیاں لیکن اگر اشرفیاں دے کر ہی اپنے لڑکے کو آزاد کرایا تو پھر سلطان ٹیپو کی حکومت اور اس کے نظم و نسق کی بات ہی کیا رہ گئی!"

"بات یہ نہیں ہے!" مہامرزا خان نے اسے سمجھایا "تمہارا لڑکا نائروں کے قبضے میں ہے۔ اگر ہم اس وقت انہیں گھیر کر تمہارے لڑکے کو آزاد کرانے کی کوشش کریں گے تو اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ کہیں وہ بپھر کر تمہارے اکلوتے لڑکے کو ہلاک نہ کر دیں!"

"آپ لڑکے کو آزادی دلانے کی کوشش تو کریں! اگر ہم دو ہزار اشرفیاں دے بھی دیں گے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ بدذات میرے لڑکے کو چھوڑ بھی دیں گے؟"

مہامرزا خان نے کہا "لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں ناگ جھوٹ نہیں بولتے "

"کچھ بھی ہو پہلے میرا لڑکا آزاد ہوجائے، اس کے بعد کچھ سوچیں گے !"

مہامرزا خان نے کہا "نہیں، ایسا نہ کرو، بلکہ پہلے انہیں اُن کی مطلوبہ اشرفیاں بھجوا دو اور لڑکے کو اپنے قابو میں کرو۔ اس کے بعد ہم ان پر حملہ کرکے ان سے اشرفیاں بھی چھین لیں گے اور انہیں کیفرِ کردار کو بھی پہنچا دیں گے۔"

"نہیں جناب! مجھے ان پر رتی بھر اعتبار نہیں۔ پہلے لڑکا بعد میں کچھ اور!" اس کے بعد اس نے اپنی دھوتی کے پلّو میں سے ایک کاغذ نکال کر مہامرزا خان کی طرف بڑھا دیا۔ بولا،

"اگر اشرفیاں دے کر لڑکے کو رہا کرانا ہوتا تو آپ صاحبان کے پاس ہرگز نہ آتا، اُسے کب کا آزاد کرا چکا ہوتا۔"

مہامرزا خان نے کاغذ کی تہیں دور کیں اور اس کی عبارت کو پڑھنے لگا۔

"اچھے کمار کی طرف سے پتا جی کو معلوم ہو کہ میں ناگوں کے چکر میں آ گیا ہوں۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر ایک مکان میں قید کر دیا ہے اور میرے عوض دو ہزار اشرفیاں چاہتے ہیں، پتا جی تم آسانی سے دو ہزار اشرفیاں دے سکتے ہو۔ میں تمہارا اکلوتا بیٹا ہوں، مجھے بھگوان کے لیے بچا لو۔ میں وہاں آکر دو ہزار سے زیادہ کما کر تمہارا یہ قرض اتار دوں گا۔"

یہ خط بنیے کے بیٹے کا تھا۔ مہامرزا خان نے جب بنیے سے یہ معلوم کیا کہ یہ خط لے کر کون آیا تھا تو معلوم ہوا انہی ناگوں میں سے کوئی ایک تھا۔

مہامرزا خان کو بنیے کی سنگدلانہ ضد اور احمقانہ لالچ پر غصہ تو بہت آ رہا تھا لیکن اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ بنیا انہیں اسی طرف لیے چلا جا رہا تھا جہاں سے اس نے مسیکی کے تینوں منگیتروں کو گرفتار کیا تھا۔ بنیے نے انہیں اس مکان کے دروازے پر لے جا کر کھڑا کر دیا اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے گردن باہر نکال کر بنیے سے دریافت کیا "دو ہزار اشرفیاں لے آئے؟"

بنیے نے اکڑ کر داہنی جانب کھڑے ہوتے مہامرزا خان اور اس کے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "نکال میرے لڑکے کو باہر۔ ورنہ ابھی مکان کو آگ لگوا دوں گا۔"

ناگ نے فوراً دروازہ بند کر دیا اور اندر سے جواب دیا "لڑکا اسی وقت ملے گا جب تم ہمیں دو ہزار اشرفیاں پہنچا دو گے۔"

مہامرزا خان نے آگے بڑھ کر بنیے سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

بنیے نے دانت پیستے ہوئے کہا "جناب یہ لوگ سیدھی طرح نہیں مانیں گے۔ اب آپ کو میری خاطر ایک ترکیب کرنی پڑے گی۔"

"کیسی ترکیب؟" مہامرزا نے پوچھا۔

"یہ مکان گھاس پھوس اور لکڑی کا ہے۔ ہمیں اس مکان میں آگ لگا دینی چاہیئے۔ جب یہ لوگ جلنے

لگیں گے، تو خود بخود باہر نکل آئیں گے!"

مہامرزا خان کو اُس کی عقل اور تدبیر پر غصہ آگیا۔ بولا "اگر وہ سب باہر نکل آئے اور تمہارے لڑکے کو اندر ہی رہنے دیا تو پھر کیا ہوگا؟"

بنیئے نے جواب دیا "میں نائروں کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ کبھی باہر نہ نکلیں گے!"

مہامرزا خان نے کہا "نائر اگر نہیں بھی نکلیں گے، تب بھی تمہارے لڑکے کی جان تو خطرے ہی میں رہے گی"

بنیئے نے اپنا منہ پیٹ لیا، پھر بولا "پھر میں کیا کروں؟"

مہامرزا نے جواب دیا "انہیں دو ہزار اشرفیاں دے کر اپنے لڑکے کی جان بچاؤ۔ اس کے بعد ان کے خلاف کوئی قدم اُٹھانا مناسب رہے گا۔"

بنیئے نے انکار میں گردن ہلا دی۔ بولا "نہیں، دو ہزار اشرفیاں بہت ہوتی ہیں، یہ میں نہیں دے سکتا۔"

اس کے بعد تیزی سے آگے بڑھا اور مکان کو آگ لگا دی۔ یہ کچھ اتنی تیزی اور غیر متوقع طور پر ہوا کہ مہامرزا خان کی سمجھ میں بات اس وقت آئی جب گیلے در و دیوار سے دھواں اُٹھنے لگا۔

دفعتہً اندر سے کسی انسانی چیخ کی آواز سنائی دی، جیسے اُسے ذبح کیا جا رہا ہو، مہامرزا خان کو شبہ گزرا کہ یہ آواز یقیناً بنیئے کے لڑکے کی ہوگی جسے نائروں نے مایوس ہو کر قتل کر دیا ہوگا۔ اس کے بعد اندر سے گولیاں چلنے لگیں، مہامرزا خان بال بال بچا، اس نے بھی اپنے آدمیوں کو گولیاں چلانے کا حکم دیا اور بے تحاشہ گولیاں چلنے لگیں۔

بنیئے کی آگ نے ذرا دیر بعد رنگ دکھایا۔ اندر جو خشک گھاس پھوس یا لکڑی تھی وہ تیل کی طرح جلنے لگی۔ مہامرزا خان دیر تک نائروں کے نکلنے کا انتظار کرتا رہا لیکن ایک بھی باہر نہ نکلا اور وہ تینوں اُسی میں جل بھن کر راکھ ہو گئے چونکہ بنیئے کا لڑکا تھا اور وہ بھی نائروں کے ساتھ جل کر خاک ہو گیا۔

آس پاس کے بہت سے نائر جمع ہونے شروع ہو گئے ان کے چہروں سے حزن و ملال اور بے بسی جھلک رہی تھی اور بعض کے چہرے غصّے سے تمتما رہے تھے، مہامرزا خان کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بڑا ہنگامہ برپا ہونے والا ہے اس نے نائروں کو پیغام بھیجا کہ متنبہ کیا "خبردار جو کسی نے سرکشی کا ثبوت دیا، ایک ایک کو قتل کر دیا جائے گا۔"

نائر آپس میں بھن بھن کر کے معلوم نہیں کیا باتیں کر رہے تھے۔

مہامرزا خان کو بنیئے پر غصّہ آ رہا تھا کہ اس کی حماقت اور جلد بازی نے چار جانیں لے لیں۔

پوری بستی میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ مہامرزا خان کسی ناخوشگوار واقعے سے پہلے ہی قلعے میں واپس جانا چاہتا تھا، اس نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ ہی بنیئے کو بھی لے لیا کیونکہ اس پر چار آدمیوں کی جان لینے کا جرم عائد ہو چکا تھا۔ واپس کے لیے وہ مڑا ہی تھا کہ اُس نے ایک طرف سے بیس پچیس نائر مرد عورتوں کو اپنی طرف

آتے ہوئے دیکھا عورتیں زور زور سے بین کر کے رو رہی تھیں اور مرد خاموش تھے، مردوں میں سے چند کے سوا سبھی کے پاس بندوقیں تھیں۔ مہامرزا خان غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ نیم وحشی مقابلہ کرنے آ رہے ہیں۔ فوراً اپنے سپاہیوں کو مستعد ہو جانے کا حکم دیا۔ بندوقیں پوزیشن میں آگئیں اور نشانے قائم کر لیے گئے۔ آنے والے مردوں نے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کیے، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جنگ کی نیت سے نہیں آئے ہیں۔

جب وہ ذرا قریب آئے تو اُن کے درمیان سے ایک لڑکی نمودار ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ مہامرزا خان کی طرف بڑھی، وہ رو رہی تھی، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور منہ سے بین کر رہی تھی، مہامرزا خان نے اُسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، یہ سیمکی تھی۔ وہ اپنے سامنے مہامرزا خان کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی اور قریب آ کر نفرت سے بولی "تو سردار یہ تم ہو!"

وہ اُس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اُس نے مزید کہا "سردار جھوٹ نہیں بولا کرتے، لیکن تم جھوٹے بھی ہو!"

مہامرزا خان چپ رہا۔ اسے جواب دے کر اپنی سبکی تو کرانی نہ تھی۔

سیمکی دفورِ جذبات میں چیخ کر بولی "تم نے مجھے تباہ کر دیا سردار، تم نے میرا گھر جلوا دیا۔ اس میں میرے تینوں بھائی اور بوڑھی ماں جل کر مر چکے ہیں، سردار تمہیں میرا خیال بھی نہ آیا؟"

مہامرزا خان نے چونک کر پوچھا "سچ؟ تمہارا خاندان اس میں رہتا تھا؟"

سیمکی بولی "ہاں سردار! میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں"

سیمکی کے ساتھی اُس کے دونوں طرف کے رشتے دار تھے۔

مہامرزا خان کے دل کو دھکا سا لگا۔ اُس نے سوچا یہ کیسا غضب ہو گیا؟

سیمکی بدستور غصّے اور حقارت سے کہہ رہی تھی "سردار! تم ہمیں بھی مار سکتے ہو، ہم موت سے نہیں ڈرتے!" پھر وہ اچانک بلبلے کی طرف لپکی اور اسے زمین پر گرا دیا "میرے بھائی تجھ سے میری شادی کے لیے اشرفیاں مانگ رہے تھے، لالچی شیطان"

بلبلا چیخنے لگا۔ مہامرزا خان نے مشکل سے بلبلے کی جان چھڑائی۔

سیمکی چیخیں مار کے رونے لگی "اب میرا کیا ہوگا سردار، اپنا تو سب کچھ جل گیا اس آگ میں، ماں بھائی گرہستی۔ اب میری شادی کون کرے گا؟ گرہستی کہاں سے آئے گی؟ بھائی، ماں کہاں ملیں گے؟" پھر ایک دم مہامرزا خان پر برس پڑی "جھوٹے سردار! میرے مگیتروں کو چھوڑ دو، ورنہ میں اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی"

مہامرزا خان سبکی مٹانے کے لیے اپنے آدمیوں سے بولا "اس وقت یہ لڑکی شدتِ غم میں اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے ہم قلعے واپس جاتے ہیں۔ تم میں سے کوئی اسے قلعے لے کر پہنچے۔ کوشش کی

جائے گی کہ آتش زدگی سے اسے جو مالی نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کر دی جائے گی!"

معتمد آگے بڑھا: "ناچیز حاضر ہے، جناب قلعے واپس تشریف لے جائیں، بندہ اس گستاخ نادان لڑکی کو اپنے ہمراہ لے کر حاضر ہوتا ہے۔"

مہامرزا خان چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ راستے بھر وہ اس سانحے کی بابت سوچتا گیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اب دو کام بہر حال انجام دینے پڑیں گے، ایک تو یہ کہ بیٹے سے سیمکی کو اتنی رقم دلا دی جائے گی جس سے اس سانحے کی تھوڑی بہت تلافی ہو جائے دوسرے یہ کہ سلطان کا اجازت نامہ آئے یا نہ آئے تیمکی کے منگیتروں کو فوراً رہا کیا جائے گا اور اسی لمحے پھر یہی سوال اُبھر آیا "اور سیمکی ان تینوں سے شادی کر لے گی۔ پھر خود اس کا کیا ہوگا؟" اس سوال کے پیدا ہوتے ہی سارے ارادے ڈانوا ڈول ہو گئے۔

معتمد کافی دیر بعد جب واپس آیا تو بہت خوش اور پُر امید نظر آ رہا تھا۔ آتے ہی کہنے لگا" بندہ پرور! خادم کو ایک ہفتے کی مہلت دیجیے۔"

"ایک ہفتہ کیوں؟" مہامرزا خان نے تشویش سے پوچھا

"جناب والا! اس سرکش ضدی لڑکی کو مغلوب کرنے کے لئے ایک ہفتہ ضرور درکار ہوگا۔"

مہامرزا خان نے معتمد کو ایک ہفتے کی مہلت دے دی اور ساتویں دن معتمد بہت خوش خوش اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"خادم نے سیمکی کو راضی کر لیا ہے، کہتی ہے مسلمان ہو جاؤں گی اور جیسا آپ کہیں گے کروں گی۔ اب جناب کو ذرا سی زحمت کرنا پڑے گی۔"

مہامرزا نے دریافت کیا، "وہ کیا؟"

معتمد نے جواب دیا" جناب والا کو خود تشریف لے جانا پڑے گا اس کے پاس۔ کہتی تھی کہ میں لڑکی ہوں اگر جناب اُس کے اُمیدوار ہیں تو اُمیدواری کی خواہش اُس کے گھر میں جا کر کرنی چاہیئے۔ وہ اپنے جلے ہوئے گھر میں ملحق جانوروں کے باڑے میں منتقل ہو گئی ہے۔"

مہا مرزا خان کو اُس کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک بار پھر تصدیق چاہی" تم نے جو کچھ کہا کیا یہ واقعی سچ ہے؟"

غلام جھوٹ کیوں بولے گا؟"

"پھر ہمیں کس وقت اس کے پاس جانا چاہیئے؟"

"مغرب کے بعد اندھیرے میں، تا کہ لوگ آپ کو وہاں جاتا ہوا نہ دیکھ سکیں۔ فدوی کو جناب کی عزت و آبرو کا بھی تو پاس ہے!"

"کیا وہ واقعی مسلمان ہو جانے پر آمادہ ہے؟" اُسے اطمینان نہ ہوتا تھا۔

"احمق کو جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے!" وہ کچھ بُرا مان گیا۔
مہامرزا خان نے شرمندہ ہو کر کہا "ٹھیک ہے پھر اس وقت سلطان کے مکتوب کا جواب ہی لکھ ڈالا جائے، کیا خیال ہے تمہارا؟"
"بجا ارشاد" معتمد جلدی جلدی بولا
اور پھر معتمد کے معمولی مشورے کے بعد سلطان کو جواب دیا گیا:-
"سلطان کا ارشاد بجا ہے، تبلیغ کا کام شروع کر دیا گیا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ سب اچھے شہری بن جائیں۔ ہماری کوشش ہے کہ جب یہ مسلمان ہو جائیں تو ان میں شادی بیاہ کر کے رشتے داری کا بیج بو دیا جائے اور اگر خدا نے چاہا تو اس رسم کی ابتدا سلطان کا خادم خود کرے گا۔"
سلطان کا کارندہ جواب لے کر چلا گیا۔
جب مغرب کا وقت بھی گزر گیا تو اس نے پندرہ منتخب آدمیوں کو ساتھ لیا، اور نائروں کی بستی میں پہنچ گیا۔
چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی، بستی میں جلنے والے چراغوں کی روشنی تاروں کی طرح بکھری ہوئی تھی، وہ اندازے سے اس جلے ہوئے مکان کے قریب پہنچ گیا۔ کیونکہ اسی کے بچے ہوئے ایک حصے میں جانوروں کے باڑے میں سیمکی سمٹ گئی تھی۔ اس نے کوٹھڑی کا دروازہ تھپتھپایا تو وہ فوراً ہی کھل گیا جیسے اس کا انتظار ہی کیا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو پہلے ہی سے یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ جب وہ باڑے کے اندر چلا جائے تو نہایت مستعدی اور چالاکی سے احاطے کو فحاصرے میں لے لیا جائے اور اس دوران اگر اندر سے اس کے چلانے یا زور زور سے تالی بجانے کی آواز سنائی دے تو وہ لوگ بے تامل اندر داخل ہو جائیں۔
اندر دروازے کے سامنے سیمکی موٹی بتی کا چراغ لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن اس مسکراہٹ میں غم اور دکھ بھی شامل تھے، اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اندر آجاؤ۔"
مہامرزا خان اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ صرف بھیڑ دیا گیا۔
اندر غضب کی اداسی اور سناٹا طاری تھا۔ خشک پتوں اور گھاس پھوس کے دبیز بستر کے قریب ہی مٹکی رکھی تھی جس کے منہ پر باریک چھینٹ کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا تھا۔ مٹکی کے قریب دو بڑے بڑے پیالے رکھے تھے۔ اس نے بہ نظرِ غائر پورے حصے کا جائزہ لیا۔ دیواروں میں کئی طاق تھے، ان میں سے ایک میں چھوٹے بڑے دس بارہ مورتی رکھے تھے، دوسری میں جست کی مورتی، تیسری میں گھونگے اور سیپیاں بھری تھیں۔ دیواروں میں الماری کی جگہ کھونٹے گڑے تھے، ان میں گھر گرہستی کے سامان میں مٹی، لوہے اور تانبے کے برتن بھرے ہوئے تھے دیواروں میں کاٹھ کی کھونٹیوں پر کمانیں، تیروں سے بھرے ہوئے ترکش، بندوقیں، تلواریں، خنجر اور ڈھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔ سیمکی اس کی محویت غور سے دیکھ رہی تھی۔ آخر اس نے سکوت توڑ دیا، بولی "اب اس گھر میں

کیا رہ گیا ہے۔ سب کچھ جل کر خاک میں مل گیا!"

مہامرزا خان نے پہلی بار چراغ کی تیز روشنی میں سیمکی کو دیکھا اُس پر سر سے پاؤں تک ایک ادائے متانہ چھائی ہوئی تھی، سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اُس کے سینے پر سرنگا پٹم کی رنگین ململ کا ٹکڑا بندھا ہوا تھا اور دھوتی ریشمین تھی۔ یہ کپڑے سیمکی کو کہاں سے ملے؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

سیمکی نے ایک ادائے خاص سے گھاس پھوس کے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مہامرزا خان نے کہا "سیمکی! ہم بیٹھنے کے لیے نہیں آئے، چند باتیں کر کے واپس چلے جائیں گے، یہ بتاؤ تمہاری ہمارے معتمد سے کیا باتیں ہوئیں؟"

سیمکی نے ناگواری سے جواب دیا "پہلے بیٹھ جاؤ، پھر باتیں کروں گی۔"

مہامرزا خان بیٹھ گیا۔ سیمکی اس سے لگ کر بیٹھ گئی، مہامرزا خان کو ایک سرور سا محسوس ہوا۔

سیمکی کہنے لگی "اب میرا اس دُنیا میں کوئی بھی نہیں رہ گیا۔ میرا چچا ممولی ٹانا پہلے ہی باغی ہو کر روپوش ہو چکا ہے، میرے تینوں بھائی اور ماں جل کر ہلاک ہو چکے ہیں۔ رہے تینوں سنگیتر، وہ تمہاری قید میں ہیں" اُس کے بعد اس نے خالی خولی کوٹھری کی فضا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم یہ کوٹھری دیکھ رہے ہو۔ ذرا تم آ گئے ہو تو کوٹھری کی ویرانی دُور ہو گئی ہے۔ جب تم چلے جاؤ گے تو یہ پھر بھائیں بھائیں کرنے لگے گی پھر ٹھنڈی سانس لے کر دریافت کیا "سردار! کیا تمہیں ہم پر رحم نہیں آتا؟"

مہامرزا خان کا دل پسیج گیا۔ بولا "آتا ہے اور اس وقت تم سے یہی باتیں کرنے آئے ہیں۔ کیا تم...؟"

سیمکی نے بات کاٹ دی۔ تلخ و ترش لہجے میں بولی "سردار! تم باتیں تو بہت کرتے ہو، وعدے بھی کر لیتے ہو، لیکن سچ نہیں بولتے۔ اور آج میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ تم سے سچ بُلوا کر رہوں گی!"

مہامرزا خان خفیف ہو گیا "آج جو وعدے ہوں گے وہ پورے کیے جائیں گے!"

سیمکی نے مشکی سے پیالے میں کچھ انڈیلا، تیز ناگوار بُو پورے کمرے میں پھیل گئی مہامرزا خان سمجھ گیا یہ شراب ہے، گھر میں کشید کی ہوئی شراب، اس کا ماتھا ٹھنکا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

سیمکی نے ایک پیالہ تو خود چڑھا لیا، دوسرا مہامرزا خان کی طرف بڑھایا کہنے لگی "یہ تم پی لو، اس کے بعد باتیں کروں گی۔"

مہامرزا خان کھڑا ہو گیا "یہ ہم نہیں پی سکتے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ سلطان ٹیپو کی حدود سلطنت میں شراب ممنوع ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور سلطان کا بھی یہ حکم ہے کہ کوئی مسلمان شراب نہیں پی سکتا۔ شراب نوشی یہاں ایک بدترین جُرم ہے۔"

"یہ کوئی جُرم نہیں۔۔۔!" سیمکی سرور میں بولی "اتنی اچھی چیز پینے سے روکنے والا کوئی اچھا آدمی نہیں ہو سکتا

"میں جو کہتی ہوں، کیا میرے ساتھ بھی نہ پیو گے؟"

"نہیں سیمکی بے جا ضد نہ کرو۔ ہم شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے!"

"تم ہاتھ نہ لگانا۔ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں پلا دوں گی!" یہ کہتے ہوئے اُس نے کھڑے ہوکر بہا
رزا خان کو اپنی آغوش میں لے لینا چاہا لیکن اس کے جسم پر سجے ہوئے ہتھیار آڑے آئے۔ سیمکی نے تنگ
اُس کی تلوار کھینچ کر دور کر دینی چاہی۔ بہامرزا خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "یہ کیا کرتی ہو؟"

سیمکی نے ناک بھوں چڑھا کر، مسکراتے ہوئے شوخی سے پوچھا "تم مجھ سے ملنے آئے ہو یا جنگ کرنے؟"

بہامرزا نے جواب دیا "تم سے ملنے آئے ہیں۔ کیوں؟"

سیمکی نے اس کے ہاتھ کو ہونٹوں سے لگالیا "جھوٹے۔ پھر جھوٹ بولے۔ اگر یہاں تم لڑنے نہیں آئے
ے تو جسم پر یہ ہتھیار کیوں ہیں؟"

بہامرزا خان نے آن بان سے جواب دیا "یہ ہتھیار ہمارے زیور ہیں، انہیں جسم سے کس طرح دور
یا جا سکتا ہے۔"

سیمکی نے ایک اور کوشش کی کہ ہتھیار اُتروا دے۔ بہامرزا خان کو شبہ گذرا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس
نے مزاحمت جاری رکھی تو سیمکی آزردہ ہو گئی، بولی "کیا تمہیں سیمکی پر اعتبار نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں" بہامرزا خان نے کہا "صرف اعتبار ہی نہیں، محبت بھی ہے تم سے!"

"سردار! ایسا نہیں ہے، تم جھوٹ بولتے ہو" سیمکی نے ترشی سے جواب دیا "میں بتاؤں گی کہ محبت
یا ہے اور کیا نہیں ہے۔"

اس کے بعد وہ ایک کھر کھے کی طرف بڑھی اور اس میں سے ایک دیگچی نکال لائی۔ اسے کھول کر اندر سے
ہوئی مچھلی کا ایک قتلہ نکال کر کھاتی ہوئی بولی "سردار! یہ مچھلی ہے جانتے ہو یہ پانی سے کتنی محبت کرتی ہے
کہ اگر پانی نہ ملے تو یہ مر جاتی ہے اور مرنے کے بعد بھی پانی سے محبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جو اسے کھاتا ہے
سے بار بار پانی ہی کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔ یہ ہوتی ہے محبت۔ جو مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے!"

بہامرزا خان سیمکی کو محض نیم وحشی، اُجڈ اور الھڑ ہی سمجھتا رہا تھا، یہ تو ذہین بھی بہت نکلی!

سیمکی نے اسی پر بس نہیں کیا۔ بولی "سردار! تم تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر اعتبار کر لو، میں جھوٹ نہیں بولتی
تمہیں دھوکا نہیں دوں گی!" اس کے بعد باڑے کے اندر صحن کی طرف جاتے ہوئے بولی "سردار ادھر میرے
ساتھ تو آؤ، میں تمہیں منافقانہ محبت کا روپ دکھاؤں!"

بہامرزا خان اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا، سیمکی پلٹی اور ہاتھ میں موٹی بتی والا چراغ لے لیا اور بہامرزا خان کو
کر صحن میں چلی گئی۔ صحن کے دوسرے کنارے پر لگے ہوئے ایک درخت کی طرف بڑھتی ہوئی بولی: "سردار!
[illegible]

کھڑی ہوگئی، چراغ کو درخت کے تنے کی طرف جھکاتے ہوئے کہا" ادھر دیکھو سردار"۔
مہامرزا خان نے غور سے دیکھا، ایک سانپ سیاہ سانپ، درخت کے تنے سے رسی کی طرح لپٹا ہوا تھا چراغ کی روشنی میں اس کی جلد چمکنے لگی، سیمکی نے کہا" یہ صندل سے عشق کرتا ہے۔ یہ آج کئی دن سے اپنے محبوب سے چمٹا ہوا ہے۔ لیکن ریاکاری اور منافقت کا یہ عالم ہے کہ منہ میں رکھی ہوئی زہر کی پوٹلی اس حالت میں بھی وہیں موجود ہے، اسے اب بھی دور نہیں کرتا"۔ پھر چوٹ کھاتی ہوئی ناگن کی طرح بولی" سردار! تم بالکل اس سانپ کی طرح ہو کہ مجھ سے ملنے آئے ہو اور جسم پر سے ہتھیار نہیں اتارتے"۔
مہامرزا خان ایسا بدحواس ہوا کہ اسی وقت ہتھیار اتارنے لگا۔
یہ دونوں پھر کوٹھری میں واپس آگئے اور یہاں مہامرزا خان نے سارے ہتھیار اتار دیئے۔
ہنستا ہوا بولا" اب تو ہم سے خوش ہو؟"
سیمکی نے نفی میں گردن ہلادی" نہیں ابھی نہیں۔ پہلے تم اپنے حصے کی شراب پی لو!"
مہامرزا خان نے سختی سے کہا" نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا"۔
"کیوں؟ اس میں کیا حرج ہے؟"
"بہت بڑا جرم ہے، یہ شے مذہباً حرام ہے اور دوسرے یہ کہ میں سلطان کی حکم عدولی نہیں کرسکتا!"
سیمکی نے معصومیت سے کہا" پھر؟ اگر تم شراب نہیں پیوگے تو میرے منگیتر کس طرح رہا ہوں گے؟"
مہامرزا خان کا حیرت سے منہ کھل گیا" ہماری شراب نوشی سے تمہارے منگیتروں کا کیا تعلق ہے؟ میں سمجھا نہیں، ذرا کھل کر بات کرو سیمکی!"
سیمکی نے ایک پیالہ اور چڑھا لیا۔ مہامرزا خان سے لپٹ گئی۔ گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ٹھوڑی کا بوسہ لے لیا۔ مہامرزا خان بھی بے قابو ہوگیا، اس نے ضبط واحتیاط کی بہت کوشش کی لیکن طبیعت خراب ہوتی گئی۔ سیمکی اس کے سینے میں چھپ جانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ سسکیاں لیتی ہوئی بولی" سردار! میرے منگیتروں کو رہا کردو"۔
اب مہامرزا خان کے لیے انکار ناممکن تھا، بولا" رہا کردوں گا"۔
"جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"
"نہیں، وہ آج رات ہی رہا کردیئے جائیں گے!"
"سچ؟" اس نے پوری قوت سے مہامرزا خان کو بھینچ لیا۔
مہامرزا خان نے سیمکی کے بیچ سر کے بالوں میں پیار کرلیا" ہم انہیں خود یہاں تک پہنچادیں گے"۔
سیمکی وارفتہ ہوگئی، بار بار زور زور سے بھینچنے اور پیار کرنے لگی۔

"سیمکی!" مہامرزا خان نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"ہم نے تو تمہاری بات مان لی۔ کیا تم بھی ہماری ایک بات مان لوگی؟"
"ضرور مانوں گی، کہو۔"
"تم ان تینوں سے شادی نہ کرو!"
سیمکی اس طرح الگ ہو گئی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "کیوں؟"
مہامرزا خان نے کہا "ہم تم سے محبت کرتے ہیں سیمکی، ہم تمہیں سرنگاپٹم لے جائیں گے، وہاں تمہیں بڑے آرام سے رکھیں گے۔"
سیمکی نے غصّے سے پوچھا "اور میرے منگیتروں کو؟"
"یہ یہیں رہیں گے۔" مہامرزا خان نے جواب دیا۔ "ہم یہی تو چاہتے ہیں کہ تم ہمارے لیے اپنے ان منگیتروں کو چھوڑ دو۔"
"کیوں؟ میں انہیں کیوں چھوڑ دوں!"
"اس لیے کہ ایک عورت کا بیک وقت کئی مردوں سے شادیاں کرنا اخلاقی اعتبار سے بُرا ہے۔"
"تم لوگ بھی تو ایک ہی وقت میں کئی عورتوں سے شادیاں کر لیتے ہو یہ کیا ہے؟"
مہامرزا خان کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چاروں طرف سے محصور ہو گیا ہو، جز بز ہو کر بولا "سیمکی، یہ ہمارے مذہب کا قانون ہے، اسلام کا قانون ہے۔"
سیمکی نے جواب دیا "سردار! ایک عورت کا چار مردوں سے شادی کرنا ہمارا اپنا قانون ہے۔ ہمارے ملک اور قوم کا قانون ہے، پھر افسوس سے بولی "تمہارا یا تمہارے مذہب کا قانون ہے صرف اسی لیے تو نہیں صحیح ہو سکتا کہ تم فاتح ہو اور ہمارا یا ہمارے ملک و قوم کا قانون صرف اسی لیے غلط نہیں ہے کہ ہم مفتوح ہیں۔"
مہامرزا خان نے سوچا کہ اس ضدی، گمراہ اور وحشی لڑکی سے کون بحث کرے۔
سیمکی تھوڑی دیر تک جواب کا انتظار کرتی رہی پھر بولی "سردار! جب میں تمہارے قانون میں کوئی دخل نہیں دیتی تو تمہیں بھی ہمارے علاقائی قانون میں کوئی دخل نہیں دینا چاہیے۔"
مہامرزا خان نے کہا "جو بات ہم کہنا چاہتے ہیں، تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتی۔"
سیمکی پر بہت زیادہ نشہ چڑھ چکا تھا، اٹھلا کر بولی "اور جو میں کہہ رہی ہوں وہ تم نہیں سمجھتے سردار!"
سیمکی نے ایک بار پھر اُسے پوری قوت سے چمٹا لیا۔ بولی "سردار! ویسے میں تم سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔"
مہامرزا خان نے مایوسی سے کہا "ہم آج رات تمہارے منگیتروں کو رہا کر دیں گے۔ لیکن سیمکی! ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہیں نہیں حاصل کر سکیں گے!"

سمیکی نے چونک کر بوسوں کی بارش کردی " لیکن سردار! میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی !"

مہامرزا خان کی اُمید بندھی، خوش ہوکر پوچھا " تو گویا تم ہماری خاطر اپنے تینوں منگیتروں سے دستبردار ہونے پر آمادہ ہوگئی ہو "

"نہیں یہ بات نہیں ہے سردار!" سمیکی جھومتی ہوئی بولی " آؤ ہم دونوں اس بات پر سمجھوتہ کرلیں کہ میں تمہاری بیوی پر کوئی اعتراض نہیں کروں گی اور تمہیں میرے منگیتروں پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ ہم دونوں کے معاملات یکساں ہیں!"

"نہیں ایسا نہیں ہوسکتا!" مہامرزا خان نے درشتی سے کہا " یہ فضول سی پیش کش ہے !"

"تمہاری مرضی، لیکن سردار! میں تنہا تمہارے لیے تین محبوبوں کو نہیں چھوڑ سکتی، اس سلسلے میں ایک بار پھر تمہیں یہ یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہی کو سب سے زیادہ چاہتی ہوں "

مہامرزا خان نے اُسے ہٹاتے ہوئے کہا " سمیکی! اب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہمارے معتمد نے آخر جھوٹ کا سہارا کیوں لیا؟ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ تم ہماری خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہو اور تینوں منگیتروں کو چھوڑ دوگی!"

سمیکی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ بولی " اس نے ممکن ہے تم سے جھوٹ بولا ہو لیکن وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولا "

"اس نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"اس نے مجھے یہ کپڑے جو میں پہنے ہوئے ہوں دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں یہ کپڑے پہن کر رات کی تنہائی میں جب تم سے ملوں گی تو تم میری ہر بات مان لوگے، اس نے مجھے بتایا تھا یہ جادو کے کپڑے ہیں اور اس نے مجھے بتایا تھا کہ اگر یہ جادوئی کپڑے بیکار ہوجائیں اور کوئی اثر نہ ظاہر ہو تو میں تمہیں شراب پلاکر خود بھی شراب پیوں اور جب نشے میں ہوجائیں تو جادو کا اثر یقینی طور پر ظاہر ہوگا اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تم نے شراب تو نہیں پی لیکن لباس کا جادوئی اثر ظاہر ہوکے رہا!"

مہامرزا خان کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ معتمد کی سازش بے نقاب ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"ہمارے آدمی نے تم سے اور کیا کیا کہا تھا؟"

سمیکی نے جواب دیا " اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تمہارے سلطان کے نام ایک درخواست دوں کہ میں سردار کو اپنے چوتھے شوہر کی حیثیت سے قبول کرتی ہوں، سردار بھی اس پر آمادہ ہے اور چونکہ سلطان کے سردار اپنی شادی کے معاملے میں سلطان کی اجازت اور مرضی کے پابند ہیں۔ اس لیے اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"

مہامرزا خان کے رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے، گھبرا کر پوچھا " تو تم نے اس قسم کی کوئی تحریر دی تو نہیں؟"

"وے دی، اسی وقت دے دی۔" سمیکی نے کہا۔

مہامرزا خان کے لیے اب یہاں ایک لمحے بھی ٹھہرنا خطرناک تھا، فوراً واپسی کے لیے مڑا۔ "اچھا سمیکی! اب ہم چلتے ہیں۔ یہ بہت بُرا ہوا۔ تم نے ہمارے سولی پر چڑھانے کا سامان مہیا کر دیا ہے۔"

سمیکی نے ایک بار پھر اسے چمٹا لیا اور دیوانہ وار بوسے لیتی رہی۔ ترنگ میں بولی "شراب کتنی اچھی چیز ہے کہ اس میں آدمی دو نہیں رہتا، ظاہر و باطن ایک ہو جاتا ہے۔ اس میں آدمی ریاکار یا منافق نہیں رہتا۔"

مہامرزا خان نے بیزاری سے کہا "سمیکی! اس وقت ہم اس حالت میں نہیں ہیں کہ تمہیں کوئی اچھا سا جواب دے سکیں لیکن چلتے ہوئے یہ ضرور کہتے جائیں گے کہ انسان کے ظاہر اور باطن کو الگ الگ ہی رہنا چاہیئے۔ اگر انسان میں یہ دونوں کبھی ایک ہو جائیں تو اس کی زندگی دوبھر ہو جائے گی، اس کی عارضی خوشیاں بھی اس سے چھن جائیں گی، ظاہر اور باطن الگ الگ ہی رہنے دو اور شراب میں اسی لیے زیادہ بُری سمجھتا ہوں کہ اس میں انسان برہنہ ہو جاتا ہے اور برہنگی اخلاقاً بہت بڑا عیب ہے۔"

سمیکی زہر میں بجھی ہوئی ہنسی ہنس کر بولی "تم لوگ شہری ہو جہاں اوپر نیچے کئی کئی لباس پہنے جاتے ہیں اور ان میں انسان معلوم نہیں، کہاں ہوتا ہے اور ہم لوگ جنگلوں کے رہنے والے ہمارے ہاں ہاتھی ہاتھی ہی ہوتا ہے، شیر شیر ہی ہوتا ہے، لومڑی لومڑی ہی ہوتی ہے لیکن تم انسانوں میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ اُن میں کون شیر ہے، کون بھیڑیا، کون لومڑی ہے کون گیدڑ۔"

مہامرزا خان کے سر میں درد ہونے لگا اسے محسوس ہوا جیسے شراب نے سمیکی کی عقل بڑھا دی ہو۔ زچ ہو کر بولا "اب ہمارے پاس وقت کم ہے سمیکی! پھر ملیں گے۔ لیکن تم نے سلطان کے نام درخواست لکھ کر بہت بُرا کیا!"

سمیکی نے ادھ کھلی آنکھوں سے مست اور سرشار طنزیہ لہجے میں مسکرا کر پوچھا "سردار! جب تم نے میرے منگیتروں کی رہائی کا وعدہ کیا تھا اس وقت تمہارا ظاہر و باطن ایک ہی تھا یا الگ الگ؟"

مہامرزا خان نے جھنجھلا کر پیار سے اُس کے گال پر ایک تھپکی رسید کی "تم ہمارے ظاہر و باطن کی فکر نہ کرو سمیکی، آج رات تمہارے منگیتر ضرور رہا کر دیئے جائیں گے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر سمیکی کی کوئی مزید بات سُنے بغیر باہر آ گیا۔ یہاں اس کے ساتھی اس کے انتظار میں کھڑے کھڑے اُکتا چکے تھے اور آپس میں ہنسی مذاق میں اس پر تقریباً متفق ہو چکے تھے کہ ان کا سپہدار مہامرزا خان ضرور اس البڑ مست شباب حسینہ کے چکر میں پھنس کر لمحے بھر کی لذت کے لیے طولانی تمہید گانٹھنے میں مصروف ہو گا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کے ساتھی اس کے چہرے بشرے اور حرکات و سکنات سے اندھیرے کے باوجود یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ فاتح ہے یا مفتوح، بامراد

ہے یا نامراد، شاد کام ہے یا ناکام؟"

مہامرزا خان نے وعدے کے مطابق سیمکی کے تینوں منگیتروں کو اسی رات رہا کر دیا، لیکن ساری رات چین سے سو نہیں سکا۔ سیمکی کی طرف سے مایوسی اور معتمد کی سازشی ذہنیت کے انکشاف پر غم اور غصّے کے مارے اس کے اندر باہر آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اب وہ معتمد کو ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا صبح پہلا کام یہی کرنا ہے کہ معتمد کو اس کے منصب سے الگ کر کے اسے نظر بند کر دیا جائے۔

فجر کی نماز میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو مہامرزا خان نے اسے قہر کی نظروں سے گھورا اور حکم دیا۔ "ہم تمہیں معطّل کرتے ہیں بخشی، تم اپنے منصب سے سبکدوش کیے گئے۔"

معتمد نے اس حکم کا کوئی اثر نہ لیا۔ غیر جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ "سلطان نے آپ کو معطّل کر دیا ہے۔ جائزے کی کارروائی مکمل کر کے آپ سرنگاپٹم روانہ ہو جائیں، آپکی جگہ سلطان نے میرا تقرر فرمایا ہے!"

مہامرزا خان کے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ پیر تھرتھرا گئے۔ کمزور آواز میں دریافت کیا۔

"سلطان کا فرمان کب موصول ہوا؟"

"کل رات کو!"

"کہاں ہے؟"

"میرے پاس!"

مہامرزا خان نے جوش میں چیخ کر کہا۔ "دغاباز، مکّار، سازشی تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے، لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ تیری یہ کامیابی عارضی ہے!"

معتمد نے پھر کوئی اثر لیے بغیر آہستہ سے کہا۔ "کوئی پروا نہیں، دیکھا جائے گا۔"

"سیمکی کی درخواست کہاں ہے؟"

"سلطان کو کئی دن ہوئے روانہ کر دی گئی!"

"آہ ظالم!" مہامرزا خان کو رونا آگیا۔ "تو نے ہمیں کہیں کا بھی نہ رکھا۔ اگر بیوی بچے سرنگاپٹم میں نہ ہوتے تو ہم ہرگز نہ جاتے۔" پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "بہرحال پھر بھی ہماری کچھ ایسی خدمات ضرور ہیں کہ ان کے طفیل سلطان ہمیں صفائی کا موقع دے کر معاف کر دیں گے۔"

مہامرزا خان نے دیوان میں جا کر سلطان کا فرمان وصول کیا۔ اس میں صرف چند سطریں تحریر تھیں۔

"مہامرزا خان! کورگ کا انتظام اپنے معتمد احمد بخشی کو سونپ کر خود مابدولت کی خدمت میں آجاؤ۔ سلطنتِ خداداد میں شراب اور زمینداری کو کلیتاً ختم کر دیا گیا ہے۔ اب مابدولت یہ محسوس فرما رہے ہیں کہ اپنے عمّال اور صاحبانِ مناصب کے اس عشق کو بھی جبراً ممنوع

نہ ادیں جو اپنے معیار سے کمتر لوگوں سے کیا جائے۔
مہامرزا خان تیک بیوی بچے موجود ہیں کہیں تو سٹھیا تو نہیں گیا ؟"

مہامرزا خان نے سوچا کہ اب جبکہ موت کی تلوار سر پہ لٹک رہی ہے ۔ تیمکی سے الوداعی ملاقات ضرور کر لینی چاہیئے ۔ اس نے سارا انتظام اپنے معتمد بخشی کے حوالے کیا ، اپنا سامان سمیٹا ، باندھا اور آخری ملاقات کے لیے تیمکی کے پاس چلا گیا ۔ اس وقت تیمکی اپنے گھر میں موجود نہ تھی ۔ اپنے منگیتروں کے ساتھ اُن کے گھر گئی ہوئی تھی ۔ یہ تینوں آپس میں حقیقی بھائی تھے اور ان کی عمروں میں ایک ایک سال کا فرق تھا ۔

ایک بچے کی رہنمائی میں مہامرزا خان وہاں پہنچ گیا ۔ یہ بہت بڑا مکان تھا ۔ اس کی آمد کی خبر سُن کر چاروں باہر نکل آئے ۔ خوشی سے اُن کے چہرے دمک رہے تھے ۔ تیمکی اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھی اور کہنے لگی "سردار ! میں نے ان تینوں سے بھی تمہارے لیے بات کر لی ہے ، اس گھر میں چوتھی جگہ تم لے سکتے ہو ! انہیں کوئی اعتراض نہیں"

سب سے وجیہہ اور توانا نوجوان بڑھ کر تیمکی کے قریب جا کھڑا ہو گیا ، بولا "سردار ! تم بہت اچھے انسان ہو ۔ تمہیں اپنے کنبے میں شامل کر کے ہم بہت خوش ہوں گے !"

مہامرزا خان نے سرد مہری سے جواب دیا ۔ "افسوس کہ ہم نہ تو پہلے اس کے لیے تیار تھے اور نہ کبھی آئندہ تیار ہو سکتے ہیں ۔ اس وقت ہم یہاں تم سے رخصت ہونے آئے ہیں ہمیں سلطانی حکم پر فوراً سمرقند جانا ہے"

تیمکی ایک دم اُداس ہو گئی بڑھ کر مہامرزا خان کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ "کیا تم جا رہے ہو ؟"

"ہاں تیمکی ! ہم جا رہے ہیں ؟" اُس کی آواز بھرا گئی ۔

تیمکی نے اس کے ہاتھ کی پشت پر ایک بوسہ دیا اور افسردگی سے کہا "دوبارہ واپس ضرور آنا سردار ۔ میں تمہارا انتظار کروں گی اور اگر تمہارے سلطان نے میری درخواست منظور کر لی تو میں تمہیں آسانی سے اپنا سکوں گی !"

مہامرزا خان نے اس کی سادہ لوحی کی غلطی کی نشان دہی مناسب نہ سمجھی ۔ مختصر سا جواب دیا "سلطان کے لیے تمہاری درخواست مہمل اور فضول ہے"

اس کے بعد وہ چاروں میزبان اپنے معزز مہمان کو اندر لے گئے ۔ اندر ایک کمرے کے بند دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا ، بند دروازے کی دہلیز کے پاس ایک بہت بڑا چھرا اگڑا ہوا ہے ۔ اور اس چھرے سے تھوڑے فاصلے پر تین نوجوان دروازے کی طرف منہ کئے مصروف گفتگو ہیں ۔ یہ ایک غیر معمولی کیفیت تھی ۔ اس نے چلتے ہوئے اُس طرف اشارہ کر کے تیمکی سے دریافت کیا ۔

"تیمکی ! یہ کیا ہے ؟"

تیمکی ہنسنے لگی ۔ سب سے وجیہہ نوجوان کو مخاطب کیا ۔ "تُرگا ! سردار کو بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے !"

ڈوگر نے عام سے لہجے میں جواب دیا "اس گرجنے اور کھڑے ہوئے چھپرے کا یہ مطلب ہے کہ اس چھپرے کا مالک اندر اپنی بیوی کے ساتھ لطف اندوز ہو رہا ہے اور یہ باہر تینوں بھائی اپنی اپنی باری کے منتظر ہیں!"

مہامرزا خان کو چکر آگیا، سر گھومنے لگا، اس نے مدہوشی میں سنا، سیمکی کہہ رہی تھی "یہ نہایت معمولی بات ہے ایکے اور اتحاد میں لطف اور فائدے بہت ہیں، آخر ہم اپنا صدیوں پرانا قانون کیوں اور کس طرح ختم کر سکتے ہیں اور ہم کیا، کوئی بھی ختم نہیں کر سکتا" پھر اس طرح سنائی دیا جیسے سیمکی مہامرزا خان سے پوچھ رہی ہو "کیوں سردار تم بھی تو اپنا صدیوں پرانا قانون نہیں بدل سکتے" پھر فکر مند اور غم زدہ چہرے کو دیکھ کر بولی "اگر اپنا قانون بدل سکتے ہو تو بدل دو اور آؤ ہم سب مل جل کر رہیں۔"

مہامرزا خان سے اب وہاں بالکل نہ ٹھہرا جا سکا۔ اجازت لیتے ہوئے بولا "سیمکی اور میرے دوست میز بانو! ہم اجازت چاہتے ہیں۔"

ڈوگر نے کہا "سردار! کچھ کھائے پیئے بغیر ہم تمہیں ہرگز نہ جانے دیں گے!"

سیمکی نے کہا "میں تمہارا انتظار کروں گی۔ سردار! تم جا رہے ہو۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں تم سے بھی بہت محبت کرتی ہوں!" اس کے بعد تیزی سے ایک کمرے میں گھس گئی اور وہاں سے ایک چھرا لے کر واپس آئی۔ اسے مہامرزا خان کے حوالے کرتے ہوئے کہا "یہ تمہارا چھرا ہے، اسے قبول کرو سردار! یہ اس بات کی علامت ہے کہ میں نے بحیثیت شوہر تمہیں قبول کر لیا ہے۔ جب کبھی واپس آنا مجھ سے ضرور ملنا اور اگر میں کسی کمرے میں بند ملوں تو تم اپنے بقیہ رشتے کے بھائیوں کے برابر بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار ضرور کرنا۔"

معلوم نہیں کیا سوچ کر سیمکی کا عطا کردہ چھرا مہامرزا خان نے قبول کر لیا اور اسے لے کر سرنگا پٹم روانہ ہو گیا مہامرزا خان گھر جانے کے بجائے سیدھا سلطانی محل چلا گیا، یہاں معلوم ہوا کہ سلطان محل کے ایوانِ عام، دریا دولت باغ میں تشریف فرما ہیں۔ یہ دریا دولت باغ پہنچ گیا، یہ دو منزلہ عمارت تھی سلطان دوسری منزل پر موجود تھا۔ خدام نے سلطان کو مہامرزا خان کی آمد سے مطلع کیا، فوری باریابی کا حکم ہوا۔ جب وہ سلطان کے سامنے پہنچا تو سلطان بہت برہم تھا۔ مہامرزا خان کو دیکھتے ہی حکم صادر ہوا کہ اس کے حملہ کا غذات حاضر کیے جائیں، پلک جھپکتے ہی کاغذات حاضر کر دیئے گئے، سلطان تیوریوں پر بل ڈالے مہامرزا خان سے متعلق کاغذات پڑھتا اور الٹتا پلٹتا رہا۔ پھر طنز کرتا ہوا بولا۔ "مہامرزا خان! خدا داد دولت کو تمہاری وفاداری پر کبھی شبہ نہیں رہا لیکن اب کہیں تم سٹھیا تو نہیں گئے ہو؟"

مہامرزا خان نے لجاجت سے عرض کیا "حضور روشن ضمیر ہیں، اس کے سوا یہ ناچیز اور کیا عرض کر سکتا ہے۔"

سلطان نے ایک کاغذ چٹکی میں لے کر اٹھایا اور اسے ہلاتے ہوئے کہا "کیا یہ درست ہے کہ تمہاری پنڈلی میں دو جونکیں چمٹ گئی تھیں جسے وہاں کی ایک نیم وحشی لڑکی نے آسانی سے چھڑا دیا تھا؟"

"بجا فرماتے ہیں حضورِ والا۔"

"اور کیا یہ بھی درست ہے کہ بعد میں وہ لڑکی خود جونک بن کر تیرے دل و دماغ سے چمٹ گئی ؟"

"حضور والا جو فرمائیں گے ناچیز اس پر صاد کرتا جائے گا۔"

"اور کیا یہ سمیکی کی درخواست بھی صحیح ہے ؟" سلطان نے سمیکی کی درخواست دور سے دکھائی۔

مہا مرزا خان نے صفائی پیش کی اور معتمد کی سازشوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔

سلطان نے ہوں، کہا اور کچھ سوچنے کے انداز میں بولا "سازشی! یہ وہی شخص ہے تا جو تمہاری مہربانیوں سے اس مرتبے کو پہنچا ہے ؟"

"حضور کی یادداشت اور حافظے کا ہر پیر و جوان مداح ہے۔"

"اچھا تو تمہیں سزا ضرور ملنی چاہیئے۔ اسی طرح تمہارا معتمد بھی ہماری سزا سے نہیں بچے گا۔ ہم محسن کش، موقع پرست اور زمانہ ساز کو نہیں برداشت کر سکتے" پھر پوچھا "اس بنیئے کا کیا ہوا جس نے غریب نائی لڑکی کا گھر پھونک دیا تھا ؟"

مہا مرزا خان نے جواب دیا "اب تک بند ہے جناب والا۔"

سلطان نے اپنے منشی سے کہا "کورگ کے عامل کو لکھو کہ وہ اسی وقت لڑکی کو بنیئے سے دیت دلائے — مابدولت یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔"

اسی وقت کسی نے ایک ضروری کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ سلطان نے سرسری نظر سے اسے دیکھا اور فوراً حکم دیا "کیا اس عامل کو یہ بھی پتہ نہیں کہ مابدولت نے پوری سلطنتِ خداداد میں زمینداری اور پالیگاری ختم کر دی ہے۔"

اس کے بعد منشی کو حکم دیا "کیرطے کے بڑے بڑے تیڑوں پر لکھوا دو جو ہل چلائے زمین اسی کی ہم زمیندار نہیں بحال کر سکتے، چاہے کچھ بھی ہو جاتے۔"

مہا مرزا خان دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ اگر اس وقت سلطان سے نجات مل جائے تو وہ سیدھا مشہور عزلت نشین بزرگ سیف شاہ کی خدمت میں جا کر دعا کا طالب ہو گا۔ لیکن اس وقت سلطان ایک نیا حکم جاری کر رہا تھا۔

"مابدولت کے اس فرمان کے بعد سلطنتِ خداداد کی حدود میں پیری مریدی ناجائز قرار دی جا رہی ہے۔ وہ حضرات جو محض سید ہونے کے سبب دوسروں کی کمائی پر گزر بسر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ مابدولت انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ وہ تجارت کو اپنائیں۔"

سلطان نے مہا مرزا خان کو حکم دیا "مہا مرزا خان! تم گھر جا سکتے ہو، پرسوں عید ہے۔ تمہیں عید کے دوسرے دن ——— باریابی کا شرف بخشا جائے گا۔"

مہامرزا خان، جان کی خیر مناتا ہوا اُٹھا اور سلام کیے بغیر واپس چلا آیا کیونکہ سلطان نہ تو کسی کا سلام قبول کرتا تھا اور خود کسی کو سلام کرتا تھا۔ بیوی بچوں نے اس کی آمد پر بڑی خوشی منائی۔ بیوی کے کانوں میں سیمگی کی کچھ باتیں پڑ چکی تھیں لیکن صابر اور شریف عورت نے اس سلسلہ میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔

عید گزر گئی اور اسے سلطانی محل حسب الحکم پہنچنا پڑا۔ اس وقت سلطان، محل کے جس حصّے میں تھا وہاں تک اس کی رسائی ناممکن تھی۔ وہ وہاں سے کافی دور ایسے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ جس میں سلطان کا شہور ساز رکھا ہوا تھا۔ ایک شیر کی شکل کا ساز جس کی گردن میں ایک انگریز کو جکڑا ہوا دکھایا گیا تھا۔ جب سلطان اسے بجاتا تھا تو اس میں سے پہلی آواز شیر کے گرجنے کی نکلتی تھی۔ اور اس کے فوراً بعد انگریز کے رونے دھونے اور گریہ وزاری کی آواز خارج ہونے لگتی تھی، یہ ساز سلطان کی اپنی ایجاد تھی۔

کچھ دیر بعد جب سلطان اس کمرے میں داخل ہوا تو اس کا مزاج اس دن سے بھی زیادہ برہم تھا، مہا مرزا خان مودبانہ کھڑا ہو گیا، اسے دیکھتے ہی بولا "مہامرزا خان تم بہت خوش قسمت ہو، مابدولت یہ طے کر چکے تھے کہ تمہیں کوئی نہ کوئی سزا ضرور دیں گے۔ لیکن ابھی تھوڑی دیر قبل ہمارے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ تم سزا سے بچ گئے!"

مہامرزا خان سلطان کی طرف ایک نظر ڈال کے خاموش ہو رہا۔

سلطان نے کہا "مابدولت تمہیں جو کچھ سنانا چاہتے ہیں۔ ہر چند کہ وہ سراسر ذاتی اور خاندانی ہے، لیکن چونکہ اس میں عبرت بھی ہے اس لیے سنانا ضروری ہے!" پھر ذرا دم لے کر بولا "ابھی ہم اپنے خاص کمرے میں سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے دونوں پیر دابے جا رہے ہیں۔ ہم نے آنکھ کھول کر دیکھا تو دو نہایت حسین عورتیں پیر داب رہی تھیں، جانتے ہو یہ عورتیں کون تھیں؟"

"نہیں، افسوس کہ غلام کو کچھ علم بھی نہیں"

سلطان نے شرمندگی سے بدقت تمام کہا "ہمارے مرحوم باپ کی نوخیز اور نوجوان بیوائیں تھیں۔ یہ مابدولت کی مائیں تھیں لیکن ان کے نفس نے فریب کیا اور وہ یہ سمجھ بیٹھیں کہ وہ ہم سے متمتع ہو سکیں گی۔ ہم نے انہیں ڈانٹا اور فوراً خواجہ سرا کے حوالے کر دیا کہ انہیں قرار واقعی سزا دو" پھر اصل موضوع پر آگیا "اسی طرح تم بھی بے گناہ رہے ہوگے۔ یہ عورت ہی تو ہے جو دق کی طرح لگ کے انسان کو کہیں کا بھی نہیں رکھتی"

مہامرزا خان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سلطان نے بعد سے آہستہ آہستہ اس کی پنڈلیوں پر مارا اور کہنے لگا "اور اوشیر مہامرزا خان! تم نے لڑکی کے تینوں منگیتروں کو میری اجازت کے اور حکم کے بغیر ہی رہا کر دیا تھا"

مہامرزا خان نے لجاجت سے عرض کیا "حضور والا! ہم نے جو کچھ بھی کیا، سلطان کی عنایتوں اور اپنی خدمتوں

کے پیشِ نظر کیا ہمیں امید رہتی تھی کہ حضور ہمیں مایوس نہ فرمائیں گے۔"

"اچھا جاؤ۔ وہیں واپس جاؤ۔ ہم نے تمہیں معاف کیا اور وہاں اُس احسان فراموش اور سازشی کو فوراً ہمارے پاس بھیج دو۔ اُس نے ما بدولت کو غلط سلط خبریں بھیجیں، اسے فوراً معزول کیا جاۓ۔"

اور مہامرزا خان ایک بار پھر خوش خوش وہیں واپس جا رہا تھا، جہاں وہ اپنی سیمکی کو چھوڑ آیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر معتمد بخش کو معزولی کا پروانہ دکھایا۔ مگر اسے اس کے عہدے پر فائز رہنے دیا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک مرتبہ رات کو وہ اپنے قابلِ اعتماد ساتھیوں کو لے کر سیمکی کی طرف روانہ ہو گیا، چھرا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پُراسرار خاموشی کی فضا میں سیمکی کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک شخص ہاتھ میں موم بتی کا چراغ لے کر باہر آ گیا۔ اور خوشی سے چیخا "سردار! تم آ گئے۔ خوب! ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔ آج ہم سب کی شادی ہو گئی!"

پھر وہ اسے مکان میں لے آیا۔ دونوں بھائی قریب قریب بیٹھے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مہامرزا کا ساتھی بھائی بھی اُنھی میں شامل ہو گیا اور اس سے بولا "سردار! تم بھی یہیں آ جاؤ!" اس کے بعد چیخ کر بولا "سیمکی! سردار تیرا چوتھا شوہر بھی آ گیا ہے۔"

سیمکی خوش ہو کر کمرے سے باہر آ گئی اور خوشی سے اس سے لپٹ گئی۔ بولی "مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ تم آ گئے۔ اپنا چھرا یہاں کمرے کی دہلیز پر گاڑ دو اور میرے ساتھ اندر چلو۔" پھر اپنے تینوں شوہروں کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا "پیارو! تم تو جانتے ہی ہو کہ میرا چوتھا شوہر سردار ہے اور سردار کو یہ عزت ملنی چاہیئے کہ اسے باری میں اوّل رکھا جائے۔"

تینوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا، مہامرزا خان نے اپنا چھرا کمرے کی چوکھٹ پر گاڑ دیا اور سیمکی کو لے کر کمرے میں چلا گیا۔ اور پھر اس کے دروازے بند ہو گئے۔

آج سیمکی ضرورت سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ مستی اور شباب میں ڈوبی ہوئی۔ از خود رفتہ، پاؤں رکھتی کہیں تھی، پڑتے کہیں تھے۔ پھولوں کی سیج پر خود جا بیٹھی اور اپنے سامنے مہامرزا خان کو بٹھا لیا۔ بولی "اب میں تمہاری ہوں جو چاہو کر لو!"

مہامرزا خان نے بجھے بجھے لہجے میں آہستہ آہستہ کہا "سیمکی! تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے ہم جس ماحول کے پروردہ ہیں وہاں یہ سب نہیں ہوتا، ہم ایک دوسری ہی دنیا کے آدمی ہیں ہم نے تمہارا چھرا محض اس لیے قبول کر لیا تھا کہ جب کبھی ہم واپس آئیں گے اور تم اپنے تینوں منگیتروں سے شادی کر چکی ہو گی۔ تو اس صورت میں ہم بدستور آزادی سے تم سے مل تو سکیں گے اور تمہاری دلچسپ دل میں اُترتی جانے والی آواز تو سُن سکیں گے ہم تم سے محبت کرتے ہیں، سیمکی لیکن افسوس کہ تمہیں پا نہیں سکتے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

"سردار ابیکی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دل پر رکھ لیے "جھوٹ مت بولو، اب تم میرے ہو اور میرے رہو گے۔ اپنے تینوں بھائیوں سے میل جول کر کے اکٹھے رہو، اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ سردار ابیری بات غور سے سنو، تمہارے قاعدے قانون جھوٹے ہیں کیونکہ وہاں طاقت ور کے قانون چلتے ہیں لیکن یہاں کمزور کا قانون چلتا ہے۔ میں عورت ہوں میں چار شوہر رکھ سکتی ہوں اور ورثے کی تنہا میں ہی وارث قرار پاؤں گی"

مہامرزا خان نے اُس پاگل لڑکی کے رخساروں، بالوں، پیشانی اور ہاتھوں کے اَن گنت بوسے لیے۔ اور اُسے انتہائی چھوڑ کر باہر آ گیا۔ اس کے نکلتے ہی ڈوگر آگے بڑھا اور مہامرزا خان سے کہا "سردار! اپنا چھرا اپنے قابو میں کر دو" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا چھرا دہلیز پر گاڑ دیا اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

مہامرزا خان نے منتظر دونوں بھائیوں سے کہا "دوستو! ہم اپنا چھرا یہیں چھوڑے جا رہے ہیں، سمیکی سے کہہ دینا اسے احتیاط سے رکھ لے اور جب کوئی مناسب آدمی ہماری جگہ لینے کے لیے میسر آ جائے تو یہ اُس کے حوالے کر دینا"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ قلعے میں چلا گیا۔

دوسرے دن صبح اس نے معتمد کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ بدستور اپنی جگہ کام کرتا رہے، وہ خود سرنگاپٹم واپس جا رہا ہے۔ معتمد اس کے اس غیر متوقع اور عجیب و غریب فیصلے پر ششدر رہ گیا اور شکر گزاری کے جذبے سے اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

مہامرزا خان سرنگاپٹم واپس چلا گیا اور سلطان کو موزوں انہ مطلع کر دیا کہ وہ کورگ میں نہیں رہ سکتا اور اپنی اس حکم عدولی کی ہر سزا بھگتنے کو تیار ہے۔ لیکن سلطان نے اُسے کوئی سزا نہ دی بلکہ ملک کے شمالی حصے کا نظم و نسق اس کے حوالے کر دیا۔

بعد میں جب سمیکی کو مہامرزا خان کے اس فیصلے کا علم ہوا تو بہت روئی۔ اس نے چھرا احتیاط سے یادگار کے طور پر جان سے زیادہ عزیز رکھا، وہ کورگ کی واحد عورت تھی جس کے ہمیشہ تین ہی شوہر رہے زندگی بھر مہامرزا خان کی جگہ کوئی مرد بھی نہ لے سکا وہ مہامرزا خان کو یاد کر کے اکثر رو دیتی اور اپنے قبیلے والوں سے کہتی:

"یہ شہری! سخت بد تہذیب اور جنگلی ہوتے ہیں، دو غلے، دل میں کچھ زبان پر کچھ، جھوٹے، حاسد، خود غرض کتنی شادیاں کر سکتے ہیں لیکن عورت کو یہ حق نہیں دیتے۔ خود غرض، ریاکار، مکار"

سمرقند کا مستقبل شناس

کی جامع مسجد کے ارد گرد جو دکانیں تھیں انہی میں محرابی در والی ایک دکان میری بھی سمرقند تھی۔ میرے آس پاس گھوڑوں کے سوداگروں، زین کے بیوپاریوں، نفیس اور رنگین برتن کے تاجروں اور بزہ فروشوں کی دکانیں تھیں۔ صبح سے رات گئے تک بڑی چہل پہل رہتی ریشمی عباؤں والے امراء جس انہماک سے خریداری کرتے وہ کچھ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ امراء میری دکان پر بہت کم آتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میرے فن پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

نام بھی اثرات رکھتے ہیں۔

یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اکثر ذی علم حضرات جب میری دکان کے سامنے سے گزرتے تو زیر لب مسکرا دیتے میں ان کی اس زہریلی اور تضحیک آمیز مسکراہٹ پر دل ہی دل میں کھول جاتا۔ میں اپنی جگہ یہ سوچنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ جب تک انہیں میرے علم کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا عملی تجربہ نہ ہو جاتے انہیں مجھ پر یا میرے علم پر ہنسنے اور مذاق اڑانے کا کوئی حق نہ پہنچتا تھا۔

ان امراء کے برخلاف اجڈ اور مشتعل مزاج، فوجی سادہ لوح کاشت کار اور پریشان حال دست کار

ہر وقت مجھے گھیرے رہتے ہیں ان کے نام پوچھتا اور پھر اس کی مدد سے اُن کی زندگی کے حالات اور واقعات فرفر بتانے لگتا۔ یہ لوگ میری باتوں پر اندھا اعتقاد رکھتے تھے میری بتائی ہوئی باتوں میں سے اکثر درست نکلتی تھیں۔

میں نے یہ فن کسی سے بھی نہ سیکھا تھا ایک تو یہ کہ میں واقعی بلا کا ذہین تھا۔ ذہانت سے پوری طرح کام لیتا تھا۔ دوسرے یہ کہ خدا نے کچھ غیر معمولی حسِ ادراک مجھے عطا کی تھی میں نے بنیادی طور پر یقین کی حد تک یہ فرض کر لیا تھا کہ ہر شخص کی زندگی میں عجیب و غریب تنوع ہوتا ہے اور اس تنوع میں معمولی اور غیر معمولی طور پر کچھ ایسی یک رنگی اور ہم ماثلت پائی جاتی ہے جس سے کسی ایک شخص کے حالات اور واقعات کے مطابق یا مماثل نکلتے ہیں انسان کے اس عالمگیر مماثلتی کلیئے پر عام تو خاص آدمی بھی غور نہیں کرتے چنانچہ جب میں اس کلیئے کو ذہن میں بٹھا کر پوچھنے والے کے چہرے کو بغور دیکھا اور پھر چہرے کی نرمی، درشتی ، وقار، طمانیت، مظلومیت یا سیدت، وضع قطع، عادات، رفتار کی سستی اور چستی پر غور کرنے کے ساتھ لباس کی قیمت کا تخمینہ لگا کر اپنا ماہرانہ فیصلہ سناتا تو اس میں کم ہی غلطی کا شکار ہوتا تھا اور یہ میں فخریہ کہتا ہوں کہ میں اپنے پیشے میں اتنا کامیاب رہا ہوں کہ اپنے اسی پیشے اور ذہانت کے طفیل میں امیر تیمور تک رسائی کر سکا، وہ امیر تیمور جس کی نظر میں بے مثل فوجی خدمات کے علاوہ کوئی اور خوبی اس کا قرب حاصل کرنے کا سبب نہ بن سکتی تھی۔

میں نے امیر تیمور کا قرب اور اس کے مزاج میں سرخ کس طرح حاصل کیا ہے یہ بڑی عجیب و غریب داستان ہے :

میں کوشش کروں گا کہ ان دلچسپ اور حیران کن واقعات کو اختصار کے ساتھ دلکش پیرائے میں بیان کر دوں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب امیر تیمور صرف تیمور تھا، اور اس کی شجاعت کا شہرہ ایک طرف افغانستان کی حدود میں داخل ہو چکا تھا تو دوسری طرف چغتائی کی نسل سنہری غول کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا اور تیمور کو سمرقند میں ایک بار آنے کے بعد واپس گئے ہوئے پورے دس سال گزر چکے تھے میں اپنی دکان میں بیٹھا ہوا لوگوں کے نام پوچھ پوچھ کر ان کے حالات اور واقعاتِ زندگی بتا رہا تھا کہ میری دکان سے دس قدم دور ایک نوجوان اور حسین لڑکی آ کر کھڑی ہو گئی کانوں میں قیمتی آویزے، صراحی دار گردن، گردن میں زمرد کا گلوبند، سر پر طلائی ٹوپی اور ٹوپی کے باہر شانوں سے گزرتے ہوئے پشت پر ریشم جیسے بال بکھرے ہوتے تھے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ ازراہِ مذاق میرا اور میرے گاہکوں کا مذاق اُڑا رہی ہے لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ نام کو بھی نہ تھی۔ میں نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں اپنے گاہکوں کی پروا کئے بغیر فوراً اُٹھ کر لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ میرے تمام گاہک بھی مڑ کر اس لڑکی کو دیکھنے لگے۔

لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اپنی دکان بند کرو اور میرے ساتھ چلو۔"

میں نے دریافت کیا "کہاں؟"

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا "جہاں میں لے چلوں"۔

لڑکی بے پروہ تھی جس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی تاتاری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

میں نے پوچھا "لیکن تم مجھے کہاں اور کس لئے لے جانا چاہتی ہو، یہ تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا"۔

لڑکی نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کیا تھا میں نے اس طرف دیکھا۔ ایک پن چکی کے نزدیک کئی گھڑ سوار کھڑے تھے ان کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے لمبے نیزے صاف نظر آ رہے تھے، گندمی چہرے، نوکیلی ڈاڑھیاں، گھوڑوں کے پیروں میں کتے بھی موجود تھے۔

انکار کے انجام سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ خاندانِ برلاس کا جنگی نسلی غرور مشہور تھا ان کی امارت اور سرداری فولاد اور آگ کی سرداری تھی۔ میں نے لڑکی کو جواب دیا۔

"جاؤ اپنے سردار سے جا کر کہہ دو کہ میں اپنے گاہکوں کو رخصت کر کے دکان بند کر کے ابھی حاضر ہوتا ہوں"۔

لڑکی نے کہا "میں یہیں کھڑی ہوں، تمہیں لے کر ہی جاؤں گی"۔

میں "بہتر ہے" کہہ کر دکان پر واپس چلا گیا۔ میرے گاہک لڑکی کو دیکھ دیکھ کر آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے میں نے انہیں رخصت کرنے کے انداز میں کہا "دوستو! برلاس خاندان کے سردار کا بلاوا آ گیا ہے اب آپ لوگ کل تشریف لائیں، اس وقت اجازت چاہتا ہوں"۔

ان میں کئی جھگڑالو بھی تھے لیکن برلاس خاندان کا رعب اتنا تھا کہ کوئی دم تک نہ مار سکا۔ سارے گاہک آہستہ آہستہ چھٹ گئے اور میں جلدی جلدی دکان بند کر کے لڑکی کے ساتھ ہو لیا۔

ہم جلدی ہی گھڑ سواروں کے قریب پہنچ گئے میں نے قریب پہنچتے ہی برلاس خاندان کے بوڑھے امیر جاکو پہچان لیا۔ یہ بوڑھا سردار بڑی شہرت کا مالک تھا اس کے آس پاس قبیلے کے شہسوار تھے جن کے چہروں سے شجاعت اور طبیعت کی بے چینی صاف عیاں تھی۔

میں نے امیر کو جا کر سلام کیا، اس نے گردن کی خفیف سی جنبش سے سلام کا جواب دیا اور ایک خالی گھوڑے پر سوار ہو جانے کا اشارہ کیا۔ میرے سوار ہونے سے پیشتر ہی لڑکی ایک دوسرے خالی گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو چکی تھی۔

ہم لوگ خاموشی سے چلتے ہوئے دریائے آمو کے ساحل پر پہنچ گئے یہاں دور تک اون کے سفید گنبد نما خیمے ایستادہ تھے لیکن امیر جاکو کا خیمہ پر تکلف اور حسین ایرانی قالینوں کا بنا ہوا تھا، سمرقند کی آبادی میں برلاس خاندان کے محلات اور مکانات موجود ہیں لیکن یہ لوگ اینٹ پتھر کے مکانات میں سہنا بزدلی تصور کرتے تھے ان میں

ایک نزل مشہور ہے۔

"وہ بزدلوں میں چھپ کر رہنے کے لیے قلعے اور مینار بناتا ہے"۔

چنانچہ ان کے محلات اور مکانات مہمانوں کی ضیافت کے کام آتے تھے یا پھر کبھی کبھی نازک حالات میں ان کی عورتیں وہاں منتقل ہو جایا کرتیں۔

اپنے خیمے کے در پر پہنچ کر بوڑھا امیر گھوڑے سے اتر پڑا۔ ہم سب بھی اس کے ساتھ ہی اپنے اپنے گھوڑے سے کود پڑے۔ غلاموں نے خالی گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں اور سب خاموشی سے بوڑھے امیر کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کے خیمے میں داخل ہو گئے یہاں زمین پر قیمتی قالینوں کے فرش بچھے ہوئے تھے بوڑھا امیر خیمے کے اندرونی در کے قریب گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور اپنے نوجوانوں کو واپس جانے کا حکم دیا۔ وہ سب فوراً واپس چلے گئے۔ میں کھڑا رہ گیا اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ "یہاں آؤ میرے قریب۔ اس وقت میں تم سے کچھ راز کی باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں"۔

میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ اس نے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔

اس نے بھاری آواز میں کہا "اے سمرقند کے مستقبل شناس! ہم سب بلخ جا رہے ہیں وہاں قوریلتائی منعقد ہو رہی ہے اور یہ فیصلہ ہونا ہے کہ قبائل کی سرداری کس کو سونپی جائے ہم برلاس خاندان کے لوگ تیمور کے حق میں ہیں کیا تم اپنے علم کے زور سے قبل از وقت ہمیں یہ بتا سکتے ہو کہ قوریلتائی تیمور کے حق میں فیصلہ کرے گی یا مخالفت میں؟"

میں نے ذہن پر زور دینا شروع کیا۔ تیمور، ترکی زبان میں لوہے کو کہتے ہیں۔ فولاد، دھاتوں میں سخت اور مضبوط ترین دھات جس کی زرہیں، تلواریں، شمشیریں، نیزے کی انیاں، تیر کی سنانیں اور خود بنتے ہیں ہر وہ ہتھیار جو میدانِ جنگ میں درکار ہوتا ہے، لوہے سے تیار ہوتا ہے فولاد یعنی تیمور ناقابلِ شکست ہے یہ سب کو زیر کرے گا"۔

میں نے فیصلہ سنا دیا۔ "خاندان برلاس کے معزز سردار! تیمور لوہے کی شکل ہے جو ناقابلِ شکست ہے قوریلتائی کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا"۔

بوڑھا امیر کھل اٹھا۔ اس نے مجھے حکم دیا۔ "ایک بار اور غور کر لو تیمور کو تیمور گورگان بھی کہتے ہیں"۔ اب میں نے لفظ گورگان پر غور کرنا شروع کر دیا۔ گورگان کا مطلب ہے "گرگِ عظیم" میں نے فوراً اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "امیر! تیمور گورگان شجاعت، بہادری، چالاکی اور دانائی میں بھی سب کو شکست دے گا۔ تیمور گورگان جیسا فاتح نہ تو اب تک پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ پیدا ہوگا"۔

بوڑھا جاکو میری پیشگوئی سے اتنا خوش ہوا کہ اسی وقت میری شاندار ضیافت کا حکم جاری کر دیا میری نظریں اس حسین لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں جو مجھے بُلا کر لائی تھی لیکن وہ معلوم نہیں کہاں گم ہو گئی تھی۔ بوڑھا جاکو میری قلبی وحشت کو بھانپ گیا۔ کہنے لگا۔ کچھ دنوں کے لیے صبر سے کام لینا ہوگا۔ تم میرے ساتھ بلخ چلو گے میں تمہیں تورِ یلتائی میں شریک کروں گا اگر وہاں تمہاری پیشگوئی کا ایک حصّہ سچ نکل گیا تو وہ لڑکی تمہیں بخش دی جائے گی اور اگر بات غلط ثابت ہوئی تو تمہیں سمرقند دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔"

بوڑھے امیر کے آخری فقرے سے میں لرز گیا لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خوش قسمتی کا آفتاب طلوع ہوگا تو اس کی ضیا پاشیاں میری زندگی کے کسی بھی گوشے کو تیرو تار نہ رہنے دیں گی اور اگر بدبختی کا گہن پڑا تو پھر زندگی اپنی تمام تر تابانیوں سمیت ایک اتھاہ اور مدام تاریکی میں گم ہو جائے گی۔

اس دن میں نے امیر جاکو کی صحبت میں ایک شاندار ضیافت اُڑائی۔ اس ضیافت میں برلاس خاندان کے اور معزز افراد بھی شریک ہوئے۔ دولت جس دیا دلی سے یہاں صرف کی گئی تھی اس پر مجھے حیرت ہو رہی تھی لیکن امیر جاکو نے میرے احساسات بھانپ کر مجھے لاجواب کر دیا اس نے کہا۔

"دوست تم نے صحرا کی ریت دیکھی ہے جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے اُڑ جاتی ہے انسان کی دولت تو اس سے بھی ہلکے جھونکے کی تاب نہیں لا سکتی۔"

ہم نے سمرقند چھوڑ دیا اور بلخ کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہیں تیمور تورِ یلتائی کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔

جب ہم بلخ میں داخل ہو گئے تو ہمیں وہاں حدِ نظر تک خیمے ہی خیمے نظر آئے بالکل بیوت النحل جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتوں کی طرح چنگیز خان کی نسل سے تعلق رکھنے والے تمام سردار اپنے کوہستانی مسکنوں سے نکل نکل کر یہاں پہنچ چکے تھے ان میں ہندوستان کے دروں سے لے کر شمالی سطح مرتفع کے مرغزاروں تک کے قبائلی سردار موجود تھے ان کے علاوہ ایران کے عمامہ پوش شہزادے بخارا کے علماء، باکمال اور معروف خطیب بھی جوق در جوق پہنچ رہے تھے انہی میں ماوراالنہر کا درویش عالم زین الدین اور اس کا ساتھی خواجہ بہاءالدین بھی شامل تھے لیکن تیموران سب سے الگ تھلگ خیمے میں اپنے نوعمر بیٹے سے دل بہلا رہا تھا۔

بوڑھے جاکو نے تیمور سے ملاقات کی اور اس سے میرا تعارف کرایا۔ ترچھی آنکھوں والے تیمور نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور پُر رعب آواز میں کہا۔ "غیب کا علم صرف خدا کو ہے پھر تو کس طرح دعویٰ کرتا ہے۔"

میں نے خوف زدہ لہجہ میں اپنے علم کی وکالت کی۔ "تیمور! شفا دینا خدا کا کام ہے لیکن، اطبا اس مقصد کے لئے دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح غیب کا علم تو خدا کو ہے لیکن میں اس خدا کے دیے ہوئے علم سے لوگوں کے مستقبل کے حالات بتاتا ہوں جن میں سے بیشتر خدا کے حکم سے سچ نکلتے ہیں۔"

شاید تیمور میری دلیل سے کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے بچے جہانگیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا "میرے بیٹے کے مستقبل کا حال تو بتانا"

جاکو برلاس مجھے ایسی نظروں سے دیکھنا لگا جیسے ان کی عزت آبرو داؤ پر لگ گئی ہو اس نے مجھے تاکید کی " دیکھو یہ مت بھولنا کہ جہانگیر تیمور کا چہیتا ہے۔"

میں نے جہانگیر کے معانی و مطالب پر جو غور کیا تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی یہ نام کسی عظیم فاتح یا حکمران ہی کا ہو سکتا تھا لیکن تیمور" فولاد اور گورگان گرگ عظیم کی موجودگی میں یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے لئے میرے پاس مناسب الفاظ نہ تھے جہانگیر کا مستقبل حد درجہ نازک، مشتبہ اور غیر یقینی سا تھا جو کچھ مجھے معلوم ہو چکا تھا اس کے اظہار کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

میں نے اسی طرح زبان کھولی جیسے میں خواب میں بول رہا تھا۔ میں نے کہا "جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اسی طرح ایک عہد میں دو فاتح کس طرح رہ سکتے ہیں؟ لیکن میرا علم مجھے یہی بتاتا ہے کہ جہانگیر یا تو ایک عظیم فاتح اور حکمران ہو گا یا پھر کچھ بھی نہ ہو گا"

"احمق!" تیمور کی آواز گونجی "کیا بکتے ہو؟"

میں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا اور کہتا رہا "تیمور! ہم سب تقدیر کا لکھا ہوا نہیں مٹا سکتے تم دونوں میں سے کوئی ایک ہی فاتح یا حکمران بن کر رہ سکتا ہے دونوں ایک ساتھ اور ایک عہد میں نہیں رہ سکتے اور رہا

تیمور گورگان! تو تیرا او ہے اور گرگ عظیم کا مستقبل جہانگیر کے مقابلے میں روشن اور دیرپا ہے!"

میں اتنا کہہ کر چپ ہو رہا۔ تیمور کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے خفگی آمیز لہجہ میں جاکو کو مخاطب کیا "جاکو! دیکھا تمہارا یہ سمرقندی مستقبل شناس کیا کہہ رہا ہے یہ کہتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہے گا اور میرے مقابلے میں جہانگیر کی زندگی کے امکانات بہت کم ہیں!"

بوڑھے جاکو نے تیمور کو تسلی دی "تیمور! تم فکر مت کرو، امید ہے کہ قوریلتائی کے فیصلہ کے بعد یہ بدگو مستقبل شناس اپنی بدگوئی کے لئے زندہ نہیں رہے گا"

تیمور نے پیار بھرے انداز میں جہانگیر کی طرف دیکھا اس کے بعد مجھ پر اچٹتی نظریں ڈال کر جاکو برلاس سے کہا۔

"لیکن یہ سمرقندی بھی درست ہی کہتا ہے کہ ہم تقدیر کا لکھا ہوا مٹا نہیں سکتے"

جاکو برلاس نے مجھے علیحدہ لے جا کر بہت ڈانٹا اس نے کہا "احمق! تجھے تیمور سے جہانگیر کی بابت ایسی باتیں نہیں کہنا چاہیئے تھیں جن سے تیمور کو دلی تکلیف پہنچی"

میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ جواب دیا۔ "لیکن میں جھوٹ بھی تو نہ بول سکتا تھا۔" اس نے ملامت سے دریافت کیا۔ "اچھا اب یہ بتاؤ کہ کیا واقعی جہانگیر کی زندگی خطرے میں ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "کئی باتیں ہیں ان میں سے کوئی ایک وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔"

جاکو برلاس نے دریافت کیا "مثلاً؟"

میں نے جواب دیا۔ "یا تو جہانگیر بڑا ہو کر اپنے باپ کے مقابل صف آراء ہوگا اور اس مقابلے میں دونوں میں سے کوئی ایک مارا جائے گا یا پھر ان دونوں میں سے کوئی ایک کسی اور طرح مر جائے گا اور اس بارے میں جہانگیر کی ہلاکت کا زیادہ امکان ہے۔"

بوڑھے جاکو نے مجھے ڈانٹ پلائی "چپ رہو اور بدشگونی کی منحوس بات منہ سے نکالتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر قورلتائی نے تیمور کے حق میں فیصلہ دے دیا تو بیگائی کو تجھے بخش دوں گا۔ لیکن اب مجھے سوچنا پڑے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ بیگائی اسی لڑکی کا نام ہے جس کی حصولیابی کی خواہش میرے دل میں آگ کی طرح پیدا ہو چکی ہے اور میں اس میں جل رہا ہوں۔ میں نے بوڑھے برلاس سے کہا "قرآن میں ہے کہ اے لوگو! تم جو وعدہ کرو اس کو پورا کرو۔ وعدے سے پھر جانے والوں کا ٹھکانا خراب ہے۔"

بوڑھا برلاس بے بس ہو کر چیخ پڑا۔ "او چرب زبان سمرقندی۔ تو بہت برا انسان ہے چالاکی اور حاضر جوابی تو تجھ پر ختم ہو گئی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے قورلتائی کے فیصلہ کے مطابق اس کو پورا کروں گا۔"

اس کے بعد شریر ہنسی ہنستا ہوا بولا۔ "دیکھو بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ ہمارے نوجوان اور ان کے صبا رفتار گھوڑے دنیا کے آخری سرے تک تیرا پیچھا نہ چھوڑیں گے یا تو تو نے لڑکی حاصل کر لی یا پھر میں نے تیری گردن لے لی۔"

قبائلی مجلس قورلتائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک بہت بڑے شامیانے کے نیچے قبائلی سردار جمع ہو چکے تھے انہی میں شیوخ اور علمائے کرام بھی موجود تھے۔

قورلتائی کا آغاز جاکو برلاس کی تقریر سے ہوا جس میں اس نے نہایت خوبصورتی سے تیمور کی نمائندگی کی اور حاضرین قورلتائی کو تیمور کی سرداری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بعض سرداروں نے جاکو برلاس کی مخالفت کی اور یہ رائے دی کہ جملہ علاقوں کو آپس میں بھائیوں کی طرح تقسیم کر لیا جائے۔

برلاس خاندان کے ایک سردار نے اس سے اتفاق کیا۔ لیکن اس تجویز میں اتنا اضافہ کر دیا کہ "ان بھائیوں کا بڑا بھائی تیمور رہے گا اور تمام چھوٹے بھائی اس کی اطاعت کے پابند ہوں گے۔"

طاقتور کوہستانی قبائل کے ایک سردار نے تجویز پیش کی "سب سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم اپنے آبائی قانون کی طرف لوٹ جائیں، چنگیز خان کے قانون میں بادشاہی کا کوئی وجود نہیں ہم یہ کر سکتے ہیں کہ چنگیز خان کی اولاد میں سے کسی کو اپنا حکمران مان لیں اور تیمور کو اس کا نائب مقرر کر دیں کیونکہ تیمور بذاتِ خود چنگیز خان کی شاہی نسل سے تعلق نہیں رکھتا۔"

اس مرحلے پر ایک عالم درویش اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اعلان کر دیا۔

"صاحبان! یہ قانون اسلام کے صریحاً خلاف ہے کہ اُمتِ محمدیؐ کسی غیر مسلم کی تابع ہو کر رہے۔ چنگیز خان صحرانشین تھا اور اس کو تلوار کی برتری حاصل تھی۔ لیکن تیمور کی تلوار بھی چنگیز کی تلوار سے کسی طرح کم نہیں۔"

اس کے بعد اس عالم نے اپنی طرف سے فیصلہ دے دیا "ہم تیمور کو پورے ماوراالنہار کا حکمران تسلیم کرتے ہیں درہاں توران کا بھی۔"

اس فیصلے کو حتمی اور ناقابلِ رد تیمور کے سپاہیوں نے بنا دیا اور اس طرح بلخ کی اس تاریخی مجلس ل چنگیز خان کی موت کے ایک سو چالیس سال بعد پہلی مرتبہ اپنی خوشی سے چنگیز خان کے قانون سے انحراف، ختیار کیا گیا۔ تیمور یعنی فولاد نے سب کو شکست دے کر اپنی برتری منوالی تھی اور گورکان یعنی گرگِ عظیم کی شخصیت نے چنگیزی قانون کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا تھا اس وقت میں بہت خوش تھا میری پیشگوئی حرف بحرف

پوری اُتر چکی تھی اور میں بوڑھے برلاس اور تیمور کے روبرو سرخرو ہونے کے ساتھ ساتھ حسین بیگائی کو حاصل کرنے کا مستحق قرار پا چکا تھا معلوم نہیں اتفاقیہ یا قصداً بوڑھے برلاس نے رات کو کھانا بیگائی کے ذریعہ بھیجا لیکن خود بیگائی مجھ سے کھنچی کھنچی اور افسردہ سی رہی۔

میں نے بیگائی کو روک لیا۔ "بیگائی ذرا بیٹھنا تو میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

بیگائی نے نفرت سے جواب دیا: "میں جانتی ہوں کہ تم کس قسم کی باتیں کرو گے اور وہ باتیں میں نہیں سننا چاہتی۔"

مجھ کو غصہ آ گیا۔ میں نے گرم ہو کر کہا "تم عورت ہو نا جو ناقص العقل ہے تجھے شاید معلوم نہیں کہ میں شرط جیت چکا ہوں اور بوڑھا برلاس اس پر مجبور ہے کہ وہ تجھے میرے حوالے کر دے۔"

بیگائی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "بوڑھا پاگل ہے وہ میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں حیران رہ گیا کہ بیگائی تو جا کو برلاس سے ذرا بھی مرعوب نہیں۔

کھانا کھا چکنے کے بعد میں خیمے سے باہر نکل گیا۔ میرا سارا جسم بیگائی کی مہر و وفا سے عاری گفتگو کی آگ سے دہک رہا تھا اس وقت مجھ کو بوڑھے برلاس کا انتظار تھا کیونکہ اب اس بات کا خدشہ پیدا ہو چکا تھا کہ اگر

بیگانگی کو فوراً حاصل نہ کیا گیا تو کسی قسم کی دشواری ضرور پیدا ہو جائے گی۔

جب کافی رات گزر جانے کے باوجود بوڑھا برلاس اپنے خیمے میں واپس نہ آیا تو مجھ کو تشویش ہوئی تقریباً نصف شب کے بعد میرے آس پاس کے خیموں میں ایک ہنگامی کیفیت پیدا ہو گئی برلاس ہتھیار بند اس طرح اپنے خیموں سے نکلنے لگے جیسے ان پر شب خون مارا گیا ہو۔ میں بھی تلوار سنبھال کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ میں نے دیکھا۔ بہت سے جوان اور بوڑھے کچھ گھوڑوں پر اور کچھ پیدل مشرقی سبزہ زار کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں اسی سبزہ زار کے ایک پہلو میں خیوا کے قبائلی خیمہ زن تھے میں ایک ایک سے دریافت حال کرتا پھر رہا تھا مشکل تمام بس اتنا معلوم ہو سکا کہ کسی بات پر جاکو برلاس کی خیوا کے قبائل والوں سے ان بن ہو گئی ہے جس کے نتیجہ میں دونوں میں تلواریں کھنچ گئی ہیں۔ میں خود بھی اس سبزہ زار کی طرف روانہ ہو گیا لیکن اتنی بات تو مجھے بھی معلوم تھی کہ برلاس خاندان کسی بھی قبیلے سے مار نہیں کھا سکتا کیونکہ تیمور بذاتِ خود اس قبیلے کا ایک فرد تھا۔

وہاں تیمور ہم سب سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا پورے سبزہ زار پر تیموری سپاہ کے لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ اور یہ لوگ برلاسیوں اور خیوا والوں کے درمیان حدِ فاصل بن چکے تھے۔ جب میں چند برلاسی معززین کے ساتھ تیمور کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ جاکو برلاس اپنے چند ساتھیوں سمیت کچھ لوگوں کا مدِمقابل بنا ہوا ہے اور تیمور نہایت درشت اور تحکمانہ انداز میں دونوں کو ڈانٹ رہا ہے۔

"ایک حقیر لڑکی ہم میں نااتفاقی اور فساد کا باعث ہرگز نہیں بن سکتی تم نے مجھے اپنا امیر بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے اب یہ میرا فرض ہے کہ تم میں یک جہتی اور اتحاد قائم کر کے تمہیں سیسہ پلائی دیوار کے مثل بنا دوں۔"

اس کے بعد اس نے جاکو برلاس کو مخاطب کیا۔ "کہاں ہے وہ لڑکی؟"

بوڑھے جاکو نے لغزیدگی سے جواب دیا۔ "میرے اہلِ خانہ کے ساتھ۔"

تیمور نے حکم دیا "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس کو اسی وقت خیوا کے قبائلی سردار کے حوالے کر دو۔"

بوڑھے برلاس نے مجبوری ظاہر کر دی۔ "لیکن میں نے اس لڑکی کو میدانِ جنگ میں فاتح بن کر حاصل کیا تھا۔"

خیوا کا بوڑھا سردار گرجا۔ "اب ہم میں نہ تو کوئی فاتح ہے اور نہ کوئی مفتوح۔ اب ہم امیر تیمور کے پرچم تلے ایک خاندان اور ایک قبیلے کے افراد بن چکے ہیں۔"

تیمور نے تائید میں سر ہلایا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے خیوائی بوڑھے۔"

جاکو برلاس نے دوسرا عذر پیش کیا۔ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں نے اس سمرقندی مستقبل شناس سے وعدہ کر رکھا ہے۔ کہ اگر قور یلتائی نے تیمور کو امیر منتخب کر لیا تو بیگائی اس کے حوالے کر دی جائے گی۔"

خیوا کے بوڑھے سردار نے کچھ کہے سنے بغیر تلوار نیام سے کھینچی اور مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ "میں اس کا کام تمام کیے دیتا ہوں۔"

میں نے پھرتی سے کاوا دیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر فوراً ہی تلوار کھینچ کر اس پر جوابی وار کر دیا لیکن تیمور کے سپاہیوں نے ہم دونوں کو بیچ بس کر دیا اور وہ ہمارے درمیان حائل ہو گئے۔

تیمور نے میری بابت اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "یہ یہاں کیوں آ گیا، اس کو فوراً اس کے خیمے میں پہنچا دیا جائے۔"

سپاہیوں نے تعمیل حکم میں مجھے زبردستی میرے خیمے کے اندر تک پہنچا کر ایک زوردار دھکا دیا جس سے میں لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا اور وہ واپس چلے گئے۔

مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ قیاس اور اندازے سے بس اتنا ہی سمجھ سکا تھا کہ معاملہ بیگائی سے تعلق رکھتا تھا۔ خیوا کا سردار بوڑھے برلاس سے اس کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا اور جاکو اس کی واپسی پر رضامند نہ تھا لیکن تیمور قبائل میں اتفاق اور یک جہتی قائم رکھنے کے لئے یہ چاہتا تھا کہ بیگائی کو خیوا والوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس وقت جس ذلت اور زیادتی کے ساتھ مجھ کو وہاں سے ہٹایا گیا تھا اس سے تیمور کے خلاف میرے سینے میں انتقام کی آگ جل اٹھی تھی۔ تیمور لاکھ فولاد تھا لیکن میں اپنے علم کی گرمی سے اس فولاد کو پانی کی طرح پگھلا کر تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ میرا خطرناک ذہن تخریبی منصوبے تیار کرنے لگا۔ بیگائی کے لئے میں ہر کام کرنے کو تیار تھا۔ میں دیر تک بوڑھے برلاس کا انتظار کرتا رہا۔ میری بے چینی کا یہ عالم تھا کہ میں کسی ایک جگہ چند لمحوں کے لئے بھی سکون سے بیٹھ نہ سکتا تھا آخر میں خیمے کے باہر نکل گیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر بوڑھے جاکو کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر بعد چاندنی میں میرے خیمے کی طرف کچھ لوگ آتے ہوئے دکھائی دیے قریب آنے پر پتا چلا کہ انہی میں بوڑھا برلاس بھی ہے میں اپنے دل میں یہ طے کر چکا تھا کہ کچھ بھی ہو میں اسی وقت بیگائی کو حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور جب اس کو حاصل کر لوں گا تو اس کو لے کر فوراً ہی سمرقند روانہ ہو جاؤں گا۔

جب وہ بالکل میرے قریب آ گیا تو میں نے اس کو سلام کیا اس نے گردن کی جنبش سے پُرتمکنت انداز میں سلام کا جواب دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہے۔ میرے کسی سوال سے پہلے ہی بوڑھے نے

کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے اس وقت میں تجھ سے اسی موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے بوڑھے کو آنا کانی کرتے ہوئے دیکھ کر جواب دیا۔ "برلاس سردار! اب بات کی بجائے تمہیں اپنا وعدہ پورا کر دینا چاہیئے۔"

بوڑھا سردار جھنجلا کر بولا۔ "تم عجیب بدعقل انسان ہو۔ تم بار بار مجھے میرا وعدہ یاد دلاتے ہو، کیا تم مجھ کو عہد شکن یا وعدہ خلاف سمجھتے ہو؟"

میں بوڑھے سردار کو اپنے خیمے کے اندر لے گیا۔ بوڑھے نے اپنے ساتھیوں کو رخصت کر دیا۔ یہاں میں بہت نرم پڑ گیا۔ بوڑھا بھی کچھ نرم ہو گیا کہنے لگا "تم تو مستقبل شناس ہو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ بیگائی تم کو مل بھی سکے گی یا نہیں اور اگر مل بھی گئی تو وہ تمہارے پاس رہ بھی سکے گی یا نہیں؟"

اور میں نے اب تک واقعی بیگائی کے بارے میں اپنے علم سے کچھ بھی نہ معلوم کیا تھا۔ میں نے سکوت اختیار کیا اور دیر تک بیگائی کے نام اور اس کے اثرات پر غور کرتا رہا۔

بیگائی کا مطلب تھا صحرائی۔ ایسا صحرا جہاں کی ریت سرخی مائل ہو اور تیز و تند ہواؤں کے جھونکے انہیں ادھر ادھر منتشر رکھتے ہوں۔ میں بیگائی کے معانی و مطالب اخذ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا:

"بیگائی صحرا کی مثل ہے اس کے دل میں کبھی بھی کسی شخص کی پائیدار محبت کا بیج پرورش نہ پا سکے گا سرخی مائل ریت کا یہ مطلب ہے کہ اس میں نفسانی خواہشات بلا کی ہوں گی اور تیز و تند ہواؤں کے جھونکوں سے ذرات کے ادھر ادھر منتشر ہوتے رہنے کا یہ مطلب ہے کہ بیگائی کبھی بھی کسی ایک شخص کی ہو کر نہ رہ سکے گی اور اس کی بے پناہ نفسانی خواہشات اس کو آدمیوں کے صحرا میں ادھر ادھر آوارہ و سرگرداں رکھیں گی۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے بوڑھے برلاس کو اپنے علمی نتیجے سے مطلع کر دیا۔ ڈر اس لئے رہا تھا کہ میں اب تک صحیح معنوں میں بیگائی کی اصل حیثیت سے آگاہ نہ تھا۔

بوڑھا برلاس میری باتوں سے خوش ہو گیا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو، تمہارا علم سچا معلوم ہوتا ہے۔" پھر کچھ تامل کے بعد کہا۔ "بیگائی کو میں نے خیوا کے صحرا سے پایا تھا۔ خیوا کے قبائل سے میری جنگ ہوئی تھی جب میں نے فتح پائی تو مال غنیمت میں بیگائی بھی ہاتھ آئی۔ یہ اس وقت ذرا سی تھی۔ میں نے اس کو اپنی بیٹی کی طرح رکھا ہے لیکن اب جب کہ امیر تیمور کے پرچم تلے ہم قبائلیوں میں اتحاد اور یگانگت کی داغ بیل ڈالی جا چکی ہے خیوا والے بیگائی کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں اور تیمور بھی خیوا کی طرفداری کر رہا ہے۔"

میں نے فوراً دل کی بات عرض کر دی "لیکن سردار! تمہیں بیگائی کو فوراً میرے حوالے کر دینا چاہیئے۔ میں

اسی وقت اس کو لے کر سمرقند روانہ ہو جاؤں گا۔"

بوڑھے جاکو نے مطمئن لہجہ میں کہا۔ "لیکن جب تک تیمور کو باقاعدہ امیر تسلیم کر لینے کی رسم نہ ادا کر لی جائے میں بیگائی کے معاملے میں اپنا وعدہ پورا کرنے کا پابند نہیں ہوں۔"

میں نے بے چینی سے جواب دیا۔ "قوریلتائی اپنا فیصلہ تیمور کے حق میں دے چکی ہے اب صرف رسم تاج پوشی باقی رہ گئی ہے جو کسی بھی وقت اور کہیں بھی انجام پا سکتی ہے بیگائی کے معاملے میں اصل چیز تو تیمور کی بحیثیت امیر نامزدگی تھی۔"

بوڑھا برافروختہ ہو گیا۔ "اگر اس وقت میں بیگائی کو تیرے حوالے کر بھی دوں تو کیا تجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ تو اس کو لے کر صحیح سلامت سمرقند پہنچ جائے گا؟"

اس کے بعد خود ہی اس کی نفی کر دی۔ ترش لہجے میں بولا۔ "کبھی نہیں۔ خیوا کے لوگ تجھ کو راستے ہی میں ہلاک کر دیں گے۔ کیا بوڑھے خیوائی کا وار تو بھول گیا ہے؟"

اور سب سے آخر میں جاکو یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ "ایک رات اور صبر کر اور دیکھ کہ پردۂ غیب سے تیرے حق میں کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔"

دوسرے دن تیمور کے شامیانے میں سرداروں اور قبائلی بزرگوں نے حاضری دی۔ وہ تیمور کے سامنے دوزانو ہو گئے۔ انہوں نے تیمور کا بازو تھاما، اور اس کو سفید نمدے کے فرش پر لے گئے مغلوں کی قدیم رسم کے مطابق نمدے کا سفید فرش حکمران کی نشست کے لئے مخصوص تھا اور قوریلتائی کے متفقہ فیصلے نے تیمور کو امیر تسلیم کر لیا تھا۔ ماوراالنہر کے درویش زین الدین نے تاج پوشی کی رسم اس طرح ادا کی کہ قرآن کریم کا نسخہ ہاتھ میں لیا اور سرداروں کو اس پر ہاتھ رکھ کر تیمور کی اطاعت اور فرمانبرداری کے حق میں قسم کھانی پڑی۔ ایک سرکش سردار نے تیمور کی اطاعت کو مشروط قرار دیتے ہوئے حلف کی رسم ان لفظوں میں ادا کی۔

"آج سے تیمور ہمارا امیر ہے اس کی اطاعت ہمارے لئے عزت اور وقار کا باعث اور اس سے غداری ہمارے لئے موجب شرم و خجالت ہو گی لیکن اس اطاعت کے عوض تیمور ہماری عزت، آبرو اور جائیداد کی حفاظت کرے گا ہمارے باہمی اختلافات دور کرے گا اور اگر تیمور ان فرائض کی انجام دہی میں ناکام رہے گا تو ہم بھی اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں گے اور دوسری قوریلتائی منعقد کر کے اپنا نیا امیر منتخب کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔"

تیمور نے اس سرکش سردار کو اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ "میں حلف فرمانبرداری کے بغیر بھی تم سب سے

اپنا حکم منوا سکتا ہوں اور میرے نزدیک اطاعت کا یہ حلف ایک فرسودہ رسم کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔"

جب حلفِ وفاداری کی رسم ادا کی جا چکی تو تیمور رمندے کے سفید فرش سے اٹھا اور ہاتھی دانت کے معمولی بلند تخت پر جا بیٹھا اس کے جسم پر زرہ اس وقت بھی موجود تھی۔ چہار آئینہ سجائے، بازو بند اور شانہ لگائے اور سر پر زریں کام سے جگمگاتا ہوا فولادی خود پہنے ہوئے جب وہ ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھا تو درویش عالم زین الدین نے آواز بلند اعلان کیا۔

"تیمور! مشیتِ ایزدی کو یہ منظور ہے کہ تم فاتح بنو اور طاقت حاصل کرو۔ میری وجدانی قوت مجھ کو بتا رہی ہے کہ تمہارے ذریعے اسلام کو بھی تقویت پہنچے گی۔"

لیکن اس وقت خود میرے دل میں تیمور کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات پوری شدت سے بیدار تھے گو اس وقت تیمور نے دل کھول کر سرداروں میں تحفے تحائف تقسیم کئے لیکن اس سے یہ نہ ہو سکا کہ وہ برملا بوڑھے برلاس کو یہ حکم دیتا کہ بیگائی کو مستقبل شناس سمرقندی کے حوالے کر دیا جائے۔

اس جشن و تقریب کے دوسرے دن نئے افسروں اور وزیروں اور مشیروں کی تقرری کا اعلان کیا گیا یہیں قبیلۂ برلاس کے بوڑھے سردار جاکو کو علمبرداری اور نقارہ باشی کی عزت بخشی گئی، اس اعزاز کے ساتھ ہی اس کو تاڑچی یعنی ایڈی کانگ کا رتبہ بھی عطا ہوا اور اسی دن بوڑھے برلاس نے مجھے بتایا کہ امیر تیمور تجھے اپنے قریب رکھنا چاہتا ہے وہ میری پیش گوئی کی صداقت سے متاثر ہوا تھا لیکن میں اس اعزاز سے خوش نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ دنیا کی سرکش ترین روح معلوم نہیں کب، کہاں اور کس طرح ناراض ہو کر میرے لئے فرشتۂ اجل ثابت ہو۔ دوسرے بیگائی کے بارے میں اس کے فیصلے نے مجھے اور زیادہ مکدر کر دیا تھا لیکن تیمور کی خواہش سے انحراف بھی میرے لیے ناممکن تھا۔ میں امیر تیمور کے خادموں میں پہنچا دیا گیا مجھے اب بھی بیگائی کا انتظار تھا کیونکہ میں اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ امیر منتخب کر لیے جانے کے بعد بوڑھا برلاس اپنے وعدے کے ایفا کا پابند ہے لیکن بوڑھا ابھی تک معنی خیز سکوت اختیار کئے ہوئے تھا۔

پھر خیموں کا شہر اجڑنے لگا۔ کوہستانی قبائل پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے جو باقی تھے وہ اب جا رہے تھے۔ امیر تیمور کی فوج کا بیشتر حصہ روانہ ہو چکا تھا۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے میدان میں جگہ جگہ جانوروں کی لید راکھ کے ڈھیر، بوں و براز کے آثار، زمین میں پیوست چوبوں اور میخوں کے نشانات بکھرے ہوئے تھے اندر تیمور کے خیمے میں کسی اہم مسئلے پر مشورت ہو رہی تھی۔ جاکو برلاس بھی مشورت میں شریک تھا۔ میں باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تقریباً تین گھنٹے بعد تیمور کے خیمے سے لوگ نکلنے لگے، یہ بھی اپنی صورت و شکل۔ وضع قطع اور قد و قامت کے اعتبار سے خونخوار اور سرکش نظر آتے تھے، انہی میں جاکو برلاس بھی تھا۔ بوڑھے کی نظریں جیسے ہی مجھ پر

پڑیں اسکے چہرے پر آثارِ تکدر پیدا ہو گئے۔ وہ میرے قریب آگیا اور بناوٹی خوشگوار لہجے میں بولا "افسوس کہ میں بیگائی کو تیرے سپرد کرنے سے قاصر ہوں۔"

میرے دل کو دھچکا لگا۔ تلملا کر جواب دیا "آپ جیسے معزز سردار اور متقی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنے وعدے سے منحرف ہو جائے۔"

بوڑھا جاکو تاسف انگیز لہجہ میں بولا "ٹھیک کہتے ہو لیکن خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد اپنے امیر کی اطاعت بھی از روئے قرآن ہم سب پر واجب ہے اور تیمور ہمارا امیر ہے ہم اس کا حکم نہیں ٹال سکتے۔"

پھر کچھ سکوت اختیار کر کے بولا "لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیگائی اچھی نسل کی نہ تھی اسی لیئے وہ کسی انتظار کے بغیر کسی کے ساتھ فرار ہو گئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خیوا والوں ہی کے ساتھ چلی گئی ہو۔"

میرے لئے تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ بوڑھے برلاس نے جو کچھ کہا تھا اس پر مجھے یقین نہ تھا یہ ساری مکر کی باتیں تھیں بیگائی کو امیر تیمور کے حکم اور بوڑھے برلاس کی مرضی سے خیوا والوں کے حوالے کر دیا گیا ہو گا میں کمزور تھا تیمور کے سیل آتشیں میں میری حیثیت ایک حقیر تنکے سے زیادہ نہ تھی لیکن طاقت کے اس عظیم فرق کے باوجود میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب میں اپنی پیشن گوئیوں میں ریاکاری اور مکر سے کام لے کر بوڑھے برلاس اور تیمور کو تباہ کر دینے کی کوشش ضرور کروں گا۔

کئی دن بعد ہم لوگ سمرقند روانہ ہو گئے امیر بنتے ہی تیمور نے اپنے آبائی وطن سبزوار کی جگہ سمرقند کو مستقر قرار دیا

تاتاریوں کا مرغوب رنگ نیلا تھا تیمور نے سمرقند کی پرانی مٹیالے رنگ کی اینٹوں کی جگہ کالنسی کی نیلی اینٹوں کے استعمال کا حکم دیا جس میں سفید اور سنہری میناکاری عجیب دلکشی پیدا کرتی تھی صبا رفتار گھوڑوں پر زرتیں اور نیلے ریشم کے لباسوں کی جھلکیاں اڑتی ہوئی گرد کے درمیان بے تحاشہ نظر آنے لگیں سمرقند بہت جلد، گرگ کند یعنی نیلا شہر بن گیا چنانچہ جب تیمور نے مجھ سے اپنی پسند کے نیلے رنگ کی بابت دریافت کیا تو میں نے اس کو جواب دیا "نیلا رنگ آسمان کی رفعتوں کا رنگ ہے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کا رنگ ہے۔"

تیمور میرے اس جواب سے خوش ہی ہوا ہو گا لیکن اپنی خوشی کا اظہار چہرے سے نہیں ہونے دیا۔

پھر اس نے ایک دن دریافت کیا "اچھا یہ تو بتا۔ یہ جاکو برلاس "نادا جی، (ایڈوائزر) کی حیثیت سے کیسا ہے گا؟" میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور نہایت ہوشیاری سے جاکو کے اعتماد کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

"جاکو میرا محسن ہے اس لیئے میں نہایت ادب اور احترام کے ساتھ اس کی بابت زبان کھولنا چاہتا ہوں۔"

تیمور نے سرزنش کی "میں ہر بات صاف اور واضح سننا چاہتا ہوں۔ راستی۔ رستی۔ صداقت میں طاقت ہے"

میں نے نہایت ادب و احترام سے عرض کیا "جاکو تنگ گلی کو کہتے ہیں اور امیر کی طبیعت ایک لامحدود دنیا

کی طرح ہے اس لامحدود دنیا میں جاکو جیسی تنگ گلی کا وجود ہو سکتا ہے کبھی امیر کے حق میں ندامت و خجالت کا باعث بن جاتے۔ امیر کو جاکو پر کلی اعتماد نہ کرنا چاہیئے"۔

تیمور نے کسی قسم کے بھی جذبات و احساسات سے عاری نظروں سے مجھے دیکھا اور لاپرواہی سے کہا۔ "جاکو بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کے حوصلے پست اور تمنائیں مردہ ہو چکی ہیں۔ ان حالات میں اس سے وفاداری کے سوا کسی بُرائی کی اُمید نہیں کی جا سکتی"۔

میرا نشانہ خطا کر گیا۔ تیمور خود سر اور خود رائے تھا لیکن میں ہار ماننے والا نہ تھا میں پھر کسی موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا اور میں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

جہانگیر جوان ہو چکا تھا اور تیمور کو اس کی شادی کی فکر تھی۔ خوارزم کے حکمران یوسف صوفی کی لڑکی خانزادی جہانگیر کے لئے نہایت موزوں تھی اور تیمور بھی اس رشتے کا خواہشمند تھا۔ تیمور نے یوسف صوفی کو نہایت قیمتی تحفے تحائف روانہ کئے اور اپنے لڑکے کے لئے خانزادی کا رشتہ مانگا۔ صوفی نے تیمور کی اس خواہش کو ذلت کے ساتھ مسترد کر دیا اور نتیجے میں تیمور آگ بگولا ہو گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ یوسف صوفی کو اس رکیک حرکت کی سزا دی جائے گی۔

یہ مجھے خوب معلوم تھا کہ خیوائی قبائل بھی یوسف صوفی کے زیر اثر ہیں اس لئے بیٹھے تھا کہ ان دونوں کی باہمی جنگ میں خیوا والے صوفی کے پرچم تلے تیمور کے خلاف جنگ لڑنے پر مجبور تھے چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ میں اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاؤں گا اور اہلِ خیوا پر وہ تباہی لاؤں گا کہ اس کی دُور دُور مثال نہ ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس دار و گیر میں بیگانی بھی مجھے مل جائے۔

روانگی سے پہلے تیمور نے مجھ سے دریافت کیا۔ "یوسف صوفی کا کیا حشر ہو گا؟ کچھ بتا سکتے ہو؟"

میں فوراً یوسف صوفی کے معانی و مطالب سے اس کا انجام اخذ کرنے لگا۔

میں اس نتیجے پر پہنچا کہ نام یوسف ایک نہایت حسین و جمیل پیغمبر سے نسبت رکھتا ہے ایک ایسا پیغمبر جو سراپا جمال تھا اور تیمور سراپا جلال ہے ظاہر ہے کہ جمال پر جلال غالب آئے گا۔ اسی طرح نام کا دوسرا جزو صوفی عزت نشینی اور بے عملی کی نشاندہی کرتا ہے جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سراپا جوش کردار اور پیکر عمل تیمور، عزلت نشین اور بے عمل صوفی پر غالب آئے گا۔ میں نے اپنے فیصلہ سے تیمور کو مطلع کر دیا۔

تیمور نے کہا۔ "بیشک یوسف صوفی ناعاقبت اندیش ہے اور عاقبت نااندیشی کی سزا مل کر رہتی ہے"۔

تیموری سپاہ خیوا کی طرف بڑھی، چنانچہ وہی ہوا جس کا میں نے قیاس کیا تھا۔ خیوا کے لوگ تیمور کی راہ میں حائل ہو گئے اور انہوں نے قلعہ بند ہو کر مزاحمت سخت کر دی۔ لیکن تیمور نے اس قلعے کو منجنیقوں کے بغیر ہی

سر کر لیا۔ خیوا کے معزز قبائل تیموری لشکر کے قلعے میں داخلے سے قبل ہی فرار ہو گئے انہوں نے بھاگ کر یوسف صوفی کے پاس اور گنج کے قلعے میں پناہ لی تھی تیمور نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ "فولاد اور آگ کو بے دریغ استعمال کیا جائے"

چنانچہ خیوا کی بیشتر آبادی تہہ تیغ کر دی گئی اور مکانات کو جلا کر خاک کر دیا گیا۔ اس ہنگامے میں ایک ادھیڑ عمر کا مضبوط الجثہ شخص میرے پاس آیا اور نہایت عاجزی سے درخواست کی "اے سمرقندی مستقبل شناس! اپنے امیر سے مجھے جان بخشی کا پروانہ دلوا دے"

میں نے حیرت سے دریافت کیا "لیکن تو مجھے کس طرح جانتا ہے جب میں تو تجھے پہچانتا تک نہیں"

اس نے گڑگڑا کر کہا "میں نے تجھے قور یلتائی کے اس ہنگامے میں دیکھا تھا جہاں خیوا کے ایک سردار نے بیگائی کی خاطر تجھ پر تلوار سے وار کیا تھا لیکن تو صاف بچ گیا تھا"

بیگائی کا نام آتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے بے چینی سے دریافت کیا "اچھا خیر، یہ تو بتا کہ اب بیگائی کہاں ہے؟"

اس نے جواب دیا "پہلے میری جان بخشی کا پروانہ ملنا چاہیئے اس کے بعد میں بیگائی کا پتا بتا دوں گا"

مزید پوچھ گچھ سے اس شخص کی بابت اتنا اور معلوم ہوا کہ وہ شاعر ہے میں نے ڈرتے ڈرتے اس کو تیمور کے روبرو پیش کر دیا اور اس کی جان بخشی کی سفارش کرتے ہوئے تیمور سے درخواست کی کہ اس شاعر کے مجھ پر کچھ احسانات ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ احسان کی جزا احسان کے سوا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس موقع پر اگر اس شاعر کی جان بخشی کر دی جائے گی تو میں اس کے احسان کا کسی حد تک بدلہ چکا سکوں گا"

تیمور کے لئے یہ کون سا بڑا کام تھا اس نے نہ صرف شاعر کی جان بخشی کی بلکہ اس کے پورے خاندان کو زندہ اور محفوظ رکھا گیا لیکن اس مسخرے شاعر نے بیگائی کی بابت صرف اتنی سی معلومات بہم پہنچائی کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ اور گنج یوسف صوفی کی پناہ میں پہنچ چکی ہے۔ مجھے شاعر پر غصہ تو بہت آیا لیکن یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ چلو اس سے اتنی بات تو معلوم ہو گئی کہ بیگائی زندہ ہے اور گنج میں موجود ہے۔

خیوا کی تسخیر کے بعد تیموری عساکر اورگنج کے قلعے کے سامنے پہنچ کر خیمہ زن ہو گئے ابھی قلعہ کے محاصرہ کے انتظامات جاری ہی تھے کہ قلعہ کے اندر سے تیمور کے نام یوسف صوفی کا ایک پیغام موصول ہوا۔

"ہم اپنے ساتھیوں کا خون کیوں بہائیں۔ کیوں نہ ہم دونوں آپس میں لڑ کر فیصلہ کر لیں پھر جس کے ہاتھ دوسرے کے خون سے رنگے جائیں وہی فاتح تصور کیا جائے"

مبارزت کے لئے قلعے کے صدر دروازے کے باہر کا میدان طے ہوا۔ تیمور کے سرداروں میں ایک ہلچل

مج گئی اور انہوں نے تیمور کو اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ خود یوسف صوفی کے مقابلے پر نہ جائے بلکہ اپنی جگہ کسی سردار کو بھیج دے لیکن تیمور نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تم سب احمق ہو۔ کیا تم صوفی کے پیغام پر غور نہیں کرتے کہ وہ خاص میرے نام ہے"۔

اس کے بعد اس نے صوفی کو جوابی پیغام روانہ کر دیا کہ "میں مبارزت کے لئے تیار ہوں اور مقررہ جگہ پر وقتِ معینہ پر تنہا پہنچ رہا ہوں"۔

اس مبارزت سے میں بہت خوش تھا۔ کیونکہ یوسف صوفی کا شجاعت اور فنِ سپاہ گری میں بے مثل مہارت رکھنے کا خاصا شہرہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس دست بدست مقابلے میں تیمور ضرور مارا جائے گا۔ اس کے بعد میرا پہلا کام یہ ہوگا کہ کسی طرح یوسف صوفی تک رسائی حاصل کروں گا اور پھر اس کو اپنے علم سے متاثر اور مسحور کر کے اپنے لئے بیگائی کو مانگ لوں گا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مبارزت کا وقت قریب آیا تو تیمور کے افسروں کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی لیکن خود تیمور ان سب سے بے نیاز مبارزت کی تیاری میں مشغول تھا اس نے ہلکی کڑی دار زرہ پہنی، بائیں بازو پر ڈھال ڈالی، کمر بند اور تیغ سے آراستہ ہو جانے کے بعد سر پر سنہری کلغی دار آہنی خود رکھا۔ جب وہ اس حالت میں لنگڑا کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور چہرے سے طمانیت عیاں تھی جب وہ گھوڑے پر سوار ہو چکا تو بوڑھے زین الدین کی

کی حالت غیر ہو گئی وہ پھرتی سے افسروں کی صف سے باہر نکلا اور تیمور کے گھوڑے کی رکاب تھام کر درخواست کی۔" میں درخواست کرتا ہوں کہ امیر ایک عام سپاہی کی طرح یوسف صوفی کے مقابلے پر نہ جائے"۔

تیمور نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ تلوار نکال کر چپٹی طرف سے زین الدین پر وار کیا۔ بوڑھا زین الدین وار سے بچنے کی غرض سے پیچھے ہٹا اور زمین پر گر گیا۔

تیمور منجنیقوں کی قطاروں کے بیچ سے گزرتا ہوا قلعے کے صدر دروازے پر پہنچ گیا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ تیمور نے انہیں مخاطب کیا "اپنے بادشاہ یوسف صوفی سے کہو کہ تیمور تمہارا منتظر ہے"۔

لیکن صوفی باہر نہ نکلا۔ تیمور تنگ آ گیا۔ للکار کر کہا۔ "جو اپنے عہد کا ایفا نہیں کرتا۔ اس کی سزا موت ہے"۔

اس نے تھوڑی دیر کھڑے رہ کر صوفی کا انتظار کیا۔ اس کے بعد گھوڑے کی باگ موڑی اور آہستہ آہستہ اپنے لشکر کی طرف واپس ہوا۔ تیموری سپاہ نے جوش میں نعرے لگائے نقاروں پر ضرب پڑی، ہزاروں گھوڑے ایک ساتھ ہنہنائے۔ سردار، امراء اور دوسرے افسر اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھے تیموری سپاہ پر تیمور کے اس عمل کا جو اثر ہوا وہ ہمیشہ کے لئے یادگار اور مثالی بن کر ان کے حافظوں میں محفوظ ہو گیا۔

تیمور کے الفاظ کہ جو اپنے عہد کا ایفا نہیں کرتا۔ اس کی سزا موت ہے" الہامی ثابت ہوئے۔ یوسف صوفی واقعی مر گیا اور شہریوں نے قلعے کے دروازے کھول دیئے۔ تیمور نے یوسف صوفی کی حسین لڑکی خانزادی کو جہانگیر سے منسوب کر دیا اور خوارزم کو ایک صوبہ قرار دے کر جہانگیر کو اس کا حاکم بنا دیا۔

یہیں میں نے پہلی بار تیمور کے دوسرے لڑکے میران شاہ کو دیکھا، یہ دوسری بیوی سے تھا۔ میران شاہ کو خیوا کے سرکش اور غدار قبائل کی سرکوبی اور گرفتاری کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ اس نوجوان شہزادے نے اس مشکل کام کو بڑی اچھی طرح انجام دیا۔ خیوا کے بوڑھوں اور بچوں کو ہلاک کر دیا گیا اور حسین عورتوں کو اسیر بنا لیا گیا۔

میں نے ایک بار پھر بوڑھے برلاس سے مدد چاہی۔ میں نے اس سے کہا "معزز سردار! خدا کے لئے میری مدد کرو اور خیوا کی اسیر عورتوں میں بیگائی کو تلاش کرو۔"

بوڑھا مجھ سے عاجز آ گیا تھا۔ کہنے لگا "احمق انسان، ایک معمولی سی لڑکی کے لئے تو اتنا پریشان رہتا ہے اگر تیمور کو تیرے اس احمقانہ شوق کا علم ہو گیا تو تجھے اپنی قربت سے محروم کر دے گا۔"

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ عجیب بات ہے کہ تیمور خود تو ایک لڑکی (خانزادی) کی خاطر صوفی کی مملکت تہ و بالا کر دے اور مجھے اس جذبے میں مبتلا دیکھ کر اپنی قربت سے دور کر دے۔

لیکن کافی رات گئے جاکو میرے پاس آیا اور چپکے سے اپنے ساتھ چلنے کی خواہش کی۔ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور بوڑھا برلاس مجھے اپنے ہمراہ لے کر شہر کے مشرقی حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد ہم دونوں ایک شاندار محل کے سامنے پہنچ گئے۔ محل کے دربانوں نے بوڑھے برلاس کو ادب سے سلام کیا اور وہ انہیں جواب دیتا ہوا محل کے اندر داخل ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ اندر ایک وسیع و عریض سبزہ زار تھا اور فانوس کی روشنی میں فواروں کی آب پاشی کسی طلسمی فضا کا احساس دلا رہی تھی۔

یہاں ہم دونوں اپنے اپنے گھوڑوں سے کود پڑے۔ دو خدمت گاروں نے ان کی لگامیں پکڑ لیں اور جاکو مجھے اپنے ہمراہ لے کر اس محل کے اندرونی کمروں کی طرف بڑھا۔

اس نے راستے طے کرتے ہوئے رازداری سے کہا "احمق انسان! یہاں جو کچھ بھی دیکھنے میں آئے اس پر زبان نہ کھولنا۔ اور طبیعت کو اپنے قابو میں رکھنا ورنہ یہ سمجھ لے تیری ذرا سی بے احتیاطی تجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دے گی۔"

میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا تھا اور بوڑھا برلاس مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔

جاکو مزید ہدایات دیتا ہوا بولا "اور مجھے یقین ہے کہ آج کے بعد تو پھر کبھی بھی مجھ سے بیگائی کی بابت کوئی

سوال نہ کرے گا۔"

اس کی اس بات پر میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور پھر بوڑھے جاکو نے مجھ کو حسین و جمیل عورتوں کے ہجوم میں اس طرح لے جا کر کھڑا کر دیا کہ میرے ہوش و حواس ہی جاتے رہے وہاں ایک سے ایک خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ جاکو نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ میراں شاہ کا انتخاب ہے شہزادے نے انہیں میرے سپرد کیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تیمور کے علم میں لائے بغیر انہیں سلطانیہ پہنچا دیا جائے انہی میں تیری بیگائی بھی ہے۔"

میں بے چینی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر ان میں بیگائی کو تلاش کرنے لگا۔

بوڑھے برلاس نے میرا شانہ دبایا اور آہستہ سے کہا۔ "احتیاط۔ احتیاط!"

ٹھیک اسی لمحے بیگائی سامنے سے گزری۔ ہمیں دیکھتی ہوئی۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر گویا مجھے پہچانے بغیر دوسری طرف چلی گئی۔

بوڑھا برلاس مجھے وہاں سے واپس لے آیا لیکن اس وقت میرا جو حال تھا بیان سے باہر ہے۔ بیگائی کی حصول یابی دشوار سے دشوار تر ہوتی جا رہی تھی اور اب تو اس کا حاصل کرنا محال ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا اب میرے دل میں میراں شاہ کے خلاف انتقام کی آگ روشن ہو گئی تھی۔ میں موقع کا انتظار کرنے لگا۔

اور گنج سے سمرقند واپس آنے کے بعد تیمور نے چند ماہ آرام سے گزارے اسی دوران ایک دن اس نے مجھ کو طلب کیا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ میراں شاہ سے باتیں کر رہا تھا۔

تیمور نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔ "او بدگو مستقبل شناس! ذرا میرے میراں شاہ کی نسبت تو کچھ بتانا۔"

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ موقع میسر آ چکا تھا۔ بس ایک جچا تُلا ماہرانہ نشانہ لگانے کی ضرورت تھی میں نے فوراً میراں شاہ کے معانی و مطالب پر غور کرنا شروع کر دیا۔

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اس نام میں امارت اور تعیش پسندی کے سوا کوئی بڑا پن نہ تھا۔ میراں میر کی جمع ہے اور یہ طے ہے کہ میر صاحبان داد عیش دینے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے اور یہ تو خیر سے میروں کے میر تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ میروں کے میر کے شاہ بھی۔ میرے علم کی رو سے میراں شاہ کو حد درجہ عیاش، عاقبت نا اندیش اور رکیک حرکات کا مرتکب انسان ہونا چاہیئے لیکن یہ تمام ایسی باتیں تھیں جنہیں تیمور کے روبرو بیان کرنے کے لئے خاص عقل اور مخصوص رمز و کنایے کی ضرورت تھی اور تیمور مجھے یوں ہی بدگو مستقبل شناس کے لقب سے نواز چکا تھا۔

جب مجھ کو پس و پیش کرتے دیکھا تو تیمور نے مجھ کو پُر جلال لہجہ میں حکم دیا۔ "جو کچھ جانتے ہو اسے صاف صاف

بیان کرنا۔ کوئی بات چھپانے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔"

میں نے عرض کیا "میراں شاہ کو ایک ایسا انسان ہونا چاہیے جس کے پاس غم اور دکھ کا نام و نشان تک نہ ہو۔ انہیں جتنا عیش نصیب ہو گا وہ بیان سے باہر ہے انہیں ہر امروز اور غم فردا سے آزاد ہونا چاہیے۔"

تیمور نے ایک لمبی ہنکاری بھری "ہوں تو تیرا یہ مطلب ہے کہ تیمور کی کمائی ہوئی دولت اور شہرت سے عاقبت نااندیشانہ لطف اندوزی میراں شاہ کا مقدر ہے یہ تو کوئی اچھی بات نہ ہوئی! اخیر اس کے مقدر میں یہی ہو گا شاید"

اس کے بعد یکایک تیمور کی آواز تیز ہو گئی "ویکن اور بد گو سمرقندی! کبھی تو کسی کے بارے میں اچھی باتیں بھی بتایا کر"

میں نے جواب دیا "امیر کا اقبال بلند رہے مجھے میرا علم جو کچھ بتاتا ہے وہ عرض کر دیتا ہوں۔"

تیمور نے گردن ہلائی "بیشک تو بھی صحیح کہتا ہے۔ تقدیر الٰہی سے کوئی کہاں بھاگ سکتا ہے۔" میراں شاہ مجھے قہر کی نظروں سے گھور رہا تھا۔

تیمور نے میراں شاہ کو کوہ قاف کی حکومت دے دی۔ میراں شاہ سلطانیہ چلا گیا۔ کنیزوں کا لشکر سلطانیہ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ مجھ کو میراں شاہ سے ڈر لگنے لگا تھا کیونکہ اس کی بابت میں نے جو کچھ بتایا تھا میراں شاہ کو سخت ناگوار گزرا تھا۔ بیگانی کی طرف سے بھی میں تقریباً مایوس ہو گیا تھا چنانچہ جب تیمور ختا کی مہم پر روانہ ہوا تو اس کے ساتھ میں بھی چلا گیا۔ قمر الدین وہ آخری مغل تھا جس نے تیمور کا مقابلہ کیا لیکن اس کی طاقت بھی ختم ہو چکی تھی تیمور کے مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا لیکن اس کا گھوڑا پکڑ لیا گیا اس موقع پر تیمور نے اپنے بیٹے جہانگیر کو ایک معنی خیز پیغام روانہ کیا "بیٹے! ہم پہلے چنگاریاں ہی بجھاتے رہے ہیں لیکن اس بار ہم نے پوری آگ کو سر کر دیا ہے۔"

جب ہم لوگ ختا کی ایک ہزار میل لمبی مسافت طے کر کے سمرقند کے قریب پہنچے تو اہل سمرقند نے امیر کا شہر کے باہر ہی باغوں میں استقبال کیا۔ ان سب کا لباس سیاہ تھا اور فضا میں اندوہناک خاموشی طاری تھی۔ امراء کا سردار اور جہانگیر کا مشیر سیف الدین سب سے آگے تھا ان سبھوں نے اپنے سیاہ لبادوں پر خاک ڈال رکھی تھی انہیں اس حال میں دیکھ کر تیمور نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی سیف الدین اپنے گھوڑے سے نیچے اتر پڑا۔ سر جھکائے پیادہ پا تیمور کی طرف بڑھا اور اس کی رکاب تھام لی۔

تیمور نے کرخت اور تحکمانہ لہجے میں دریافت کیا "کیا بات ہے سیف الدین؟ تم خوفزدہ کیوں ہو؟"

سیف الدین نے دبی زبان اور پُرملال لہجے میں کہا۔ امیر! اس نازک پھول کی طرح جسے باد تند کے جھونکے بیدردی سے اس کی شاخ سے جدا کر دیتے ہیں موت کے بے رحم ہاتھ نے شہزادے کو عین عالم شباب میں امیر سے چھین لیا ہے۔"

تیمور ایک لمحے کے لیے رکا اس کے بعد سیف الدین کو حکم دیا۔ "اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی جگہ پر واپس

جاؤ۔"

بوڑھا سیف الدین گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ تیمور نے لشکر کو روانگی کا اشارہ دیا اور ہم سب آہستہ آہستہ سمرقند کی طرف بڑھنے لگے۔

سمرقند میں قیام کرتے ہی تیمور نے جہانگیر کے طبل اور نقارے کو منگوا کر اپنے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا۔ جہانگیر اس کا سب سے زیادہ چہیتا بیٹا تھا وہ یہ نہیں برداشت کر سکتا تھا کہ جہانگیر کے طبل اور نقارے کسی اور سردار کے علم کے سائے میں بجائے جائیں۔ میں نے دیکھا تیمور کے ہونٹ بھنچ گئے تھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی وہ بہت بڑا بوجھ اٹھا لینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

کئی دن بعد اس نے بیزاری کے ساتھ مجھے مخاطب کیا۔ "او بابا گو مستقبل شناس! تیری پیش گوئی سچی نکلی۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں اور نہ ایک آسمان پر دو سورج چمک سکتے ہیں۔"

پھر کچھ توقف کے بعد خود ہی جواب بھی دے لیا۔ "لیکن اس میں تیرا کیا قصور ہے! تو تو وہی بتائے گا جو تیرا علم تجھے بتائے گا۔ خیر تقدیر میں ایسا ہی تھا کہ تیمور اپنے سب سے چہیتے جوان بیٹے کی موت دیکھے وہ میں نے دیکھ لی۔ بالکل آخر میں مجھے نظروں کے سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ "اب تو جا سکتا ہے آئندہ میں تجھ سے کچھ بھی نہ پوچھوں گا۔"

یکایک میراں شاہ کے بارے میں عجیب و غریب خبریں آنے لگیں تیمور کے خبر داروں نے اس کو مطلع کیا کہ میراں شاہ لہو و لعب میں اپنے ہوش و حواس تک گم کر چکا ہے ہر وقت شراب کے نشے میں مست رہتا ہے قصیدہ گو شاعروں، بے تکلف اور بے شرم ندیموں، حسین و جمیل کنیزوں اور گستاخ مسخروں کے درمیان میراں شاہ اپنے مرتبے اور منصب سے گری ہوئی حرکات کا مرتکب ہو رہا ہے ان خبروں سے مجھے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔

تیمور چند دن سمرقند سے باہر رہ کر واپس آیا تو اس کے سرداروں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ بڑی پر تکلف مجلس تھی۔ مختلف مہمات اور ممالک کا ذکر چھڑا ہوا تھا کہ تیمور کے حاجب نے اس سے عرض کیا۔

"امیر کا اقبال بلند رہے امیر کی بیٹی خانزادی سلطانہ تشریف لاتی ہے اور امیر سے تخلیے میں ملنا چاہتی ہے۔"

تیمور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حاضرین مجلس باہر چلے گئے۔ حاجب ایک گوشے میں مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔ حاجب کے بقول خانزادی نے اندر داخل ہوتے ہی اپنا نقاب الٹ دیا تھا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے تیمور کو ایک نظر دیکھ کر اس کے قدموں میں گر گئی تھی اس نے بھرائے لہجے میں کہا تھا "اے امیروں کے امیر! میں تمہارے بیٹے میراں شاہ کے شہر سے آئی ہوں۔"

تیمور کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا اس نے شفقت سے خانزادی کو دیکھا اور حکم دیا "بیان جاری رہے"
خانزادی نے نہایت دلیری سے بیان دیا۔ "امیر! جب میراں شاہ کا دماغ پھر گیا اور پوری طرح تخریب اور برائی میں مبتلا ہو گیا تو میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی جس کا اس نے مجھ کو یہ صلہ دیا کہ میرے غلاموں اور کنیزوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ میرے مال اور دولت کو لوٹ لیا گیا اور اس کے ذاتی مصاحبین اور ملازمین کے روکنے کے باوجود میراں شاہ مجھے زبردستی اپنے محل میں لے گیا اور وہاں مجھ سے اپنی نفسانیت کی بھوک کو مٹایا"
اتنا کہہ کر وہ ہچکیاں بھر بھر کے رونے لگی "اے امیر! اس نے گلوگرفتہ آواز میں کہا" میں تم سے پناہ کی درخواست کرتی ہوں اور امیر کے عدل کی بھیک چاہتی ہوں"
خانزادی کی یہ شکایت اس شخص کے خلاف تھی جو تیمور کا جانشین تھا زندہ بیٹوں میں سب سے بڑا تیمور نے اپنے حاجب کو حکم دیا کہ خانزادی کے نقصانات کی تلافی کی جائے اور چشم زدن میں اس کے تمام مالی نقصانات کی تلافی کر دی گئی خانزادی کو نئے غلام اور کنیزیں عطا ہوئیں۔
اس وقت تیمور تھکا ہوا تھا۔ وہ صبح ہی دور دراز کے سفر سے واپس آیا تھا۔ اس نے بوڑھے برلاس کو حکم دیا کہ نئے سفر کی تیاری کی جائے۔
اور وہ اسی وقت سلطانیہ روانہ ہو گیا میراں شاہ کے حال کی تحقیق کے لئے۔ وہ سب کچھ خود دیکھنا چاہتا تھا خود معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب تک جو کچھ معلوم ہوا تھا حرف بحرف درست تھا سلطانیہ سے واپس آتے ہی اس نے میراں شاہ کی معزولی گرفتاری اور اپنی بارگاہ میں حاضر کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔
اور پھر یہ تماشا عبرت ناک منظر بہتوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ تیموری ولی عہد کے گلے میں رسی پڑی ہوئی تھی اور وہ ایک عام مجرم کی طرح تیمور کی بارگاہ میں پیش کر دیا گیا اس کی جگہ میں وہ افراد تھے جنہوں نے میراں شاہ کے ہاتھوں شدید نقصانات اٹھانا پڑے تھے۔
تیمور نے لمحے بھر میں اپنا فیصلہ سنا دیا "میراں شاہ کو قتل کر دیا جائے"
فضا لرز گئی۔ لوگ کانپ گئے امراء کے دلوں پر تیموری فیصلے کا بڑا اثر پڑا اور پھر وہی امراء جنہیں میراں شاہ کی ذات سے نقصانات پہنچ چکے تھے شہزادے کی سزا معاف کر دینے کی سفارش کرنے لگے۔ بوڑھا سیف الدین اور حاجب برلاس بھی میراں شاہ کی جان بخشی کے لئے تیمور کی بارگاہ میں گڑگڑا رہے تھے۔
تیمور نے جان بخشی تو کر دی لیکن اس کے سارے اختیارات چھین لئے اور اس کی مملکت ایک دوسرے شخص کے حوالے کر کے میراں شاہ کو حکم دیا کہ وہ خود وہاں ایک آدمی کی طرح رہے۔
تیمور کا یہ فیصلہ میراں شاہ کی موت سے بھی بدتر تھا مضمحل اور افسردہ شہزادہ حکم کی تعمیل میں ایک عام آدمی

کی طرح سلطانیہ واپس چلا گیا۔
دوسرے دن امیر کی خدمت میں میراں شاہ کی ندیموں درباری شاعروں، کنیزوں اور مسخروں کی فوج حاضر کردی گئی۔ انہی میں بیگائی بھی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی جاکو برلاس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور میرے دل میں اس کی خفتہ محبت ایک بار پھر بیدار ہو گئی۔ تیمور نے سرسری سماعت کے بعد اپنا فیصلہ سُنا دیا۔
"انہیں قتل کر دیا جائے۔"
بیگائی نے جو ابھی تک مجھ سے نظریں چرا رہی تھی مجھ کو اس طرح التجا آمیز نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ خدا کے لئے بچا لو۔"
جاکو برلاس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "احمق! خبردار جو تم نے اس کی سفارش کی!" لیکن میں تیمور کے قدموں میں گر گیا "اے امیروں کے امیر! اپنی خدمات کی پہلی اور آخری درخواست کی اجازت چاہتا ہوں۔"
تیمور نے گرجدار آواز میں اجازت دی "او بدبخت، بدگو مستقبل شناس! بول کیا کہنا چاہتا ہے؟"
میں نے گڑگڑا کر عرض کیا۔ "اس لڑکی کی جان بخشی کی جائے اور یہ غلام کو مرحمت فرمائی جائے۔"
تیمور نے جھنجلا کر بیگائی کو معاف کر دیا اور حکم دیا "یہ لڑکی اس احمق مستقبل شناس کے حوالے کی جائے"
اس کے بعد مجھ کو حکم دیا "لیکن میری بارگاہ میں حاضری کا یہ تیرا آخری دن ہے اس لڑکی کو لے کر فوراً دفعان ہو جا۔ اب میں تیری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا کیونکہ تیری ساری پیشین گوئیاں خوش بختی کے بجائے بدبختی کی سمت لے جاتی ہیں۔"
جب میں بیگائی کو لے کر باہر نکلا تو باہر میدان میں میراں شاہ کے شاعروں، ندیموں، کنیزوں اور مسخروں کی گردنیں ماری جا رہی تھیں۔
ایک مسخرا یہاں بھی اپنے تمسخر سے باز نہ آیا۔ اپنے بلند مرتبت ساتھیوں کو جلاد کی طرف پہلے جانے کا اشارہ کرتا ہوا بولا "معزز ساتھیو! شہزادے کے دربار میں آپ کو مجھ پر فوقیت حاصل تھی اس لئے یہاں بھی پہلے آپ ہی آگے تشریف لائیں۔"
تیمور نے مجھے بخشش میں اتنا کچھ عطا کیا کہ میں فکرِ معاش کی طرف سے بے نیاز ہو گیا اور بیگائی کو اپنے گھر لے آیا اس کے بعد پھر کبھی بھی تیمور کی خدمت میں جانے کا موقع نہ ملا۔
بوڑھا برلاس جب بھی ملتا کہتا کہ "احمق! بیگائی سے ہوشیار رہنا کیونکہ اس کی بے پناہ نفسانی خواہشات اسے آدمیوں کے صحرا میں اِدھر اُدھر آوارہ و سرگرداں رکھیں گی۔" لیکن مجھے خود اپنی پیشین گوئیوں پر اتنا اعتماد نہ تھا چنانچہ اس کے بعد بیگائی نے میرے ساتھ کبھی دھوکا نہ کیا۔

لیلا ولی کی سرگذشت وفا

کوکن کے پہاڑی قطعات سے سرزمین برار اور ناگپور تک میں پھیلی ہوئی وہ قوم جو ہزاروں سال پہلے دراوڑی کہلاتی تھی حضرت مسیح کی ولادت سے کچھ عرصہ پہلے جب غیر ملکی فاتحین نے ان نسلوں کو متاثر کیا تو یہی دراوڑی تاریخ میں ترکو دراوڑی کے نام سے مشہور ہو گئے لیکن ہندوؤں کے معاشرتی نظام میں انہیں شودر کا پست درجہ ملا تھا۔ آہستہ رو زمانہ گھڑی کی منٹ کی سوئی سے زیادہ سستی اور غیر محسوس رفتار سے چل کر جب ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے دور میں داخل ہوا تو یہ شودر یا ترکو دراوڑی کاشتکاری کا پیشہ اختیار کر چکے تھے۔ زمانہ ان پر مہربان تھا۔ جب مغلوں نے دکن کی حکومتوں پر بار بار فوج کشی کی تو وہاں کے حکمرانوں کو مجبوراً ان کاشتکاروں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا پڑا اور پھر آہستہ آہستہ انہیں لوٹ مار کی چاٹ پڑتی گئی اب انہیں درانتی سے ذرا بھی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اور دکن میں مقامی ریاستوں کے زوال کے بعد وہ عرصے تک اسی بات کے خواہشمند رہے کہ مغل حکمران انہیں اپنی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے لے لیں۔ اور وہ درانتی کو پھینک کر ایک بار پھر تلوار سنبھال لیں لیکن مغلوں کی بے اعتنائی پر وہ دکن کی ایک مسلم ریاست کی فوج میں شامل ہو گئے۔ اور یہاں ان کے کچھ آدمی ترقی کر کے سرداری کے مرتبے تک پہنچ گئے۔ یہ لوگ محنتی اور جفاکش تو پہلے ہی سے تھے فوج کی نوکری اور سپاہ گری نے انہیں اور زیادہ چاق و چوبند کر دیا سپاہ گری کی لوٹ مار نے انہیں قزاقی پر مائل کر دیا اور یہ لوگ چھوٹے بڑے جتھے بنا کر ادھر اُدھر چھاپے مارنے لگے۔ شیواجی مرہٹہ انہی جتھوں کا سردار تھا۔

مرہٹوں کے عروج اور طاقت کو چالاک کوکنی برہمن نہایت غور سے دیکھ رہا تھا اسے مرہٹوں کے سروں پر ان کی یک جہتی مسپاہیانہ تنظیم اور جرأت مندانہ چستی میں ہندوستان کی بادشاہت کا ہلکا سا سایہ نظر آتا تھا۔ انہوں نے نہایت ہوشیاری اور دانائی سے مرہٹوں کا قرب حاصل کیا اور پھر آہستہ آہستہ ان کے مشیر اور منتظم بن کر بالآخر پیشوا بن گئے۔ مرہٹوں کا صدر مقام جنوبی ہند کا مغربی شہر ستارہ تھا لیکن برہمن پیشواؤں نے اپنے لئے پونا کو پسند کیا۔

شیواجی کو دنیا سے منہ موڑے ہوئے تقریباً اسی سال اورنگ زیب کو رحلت فرمائے تقریباً ترپین سال گزر چکے تھے۔ اس دوران مغل حکومت سمٹتے سمٹتے آگرہ اور دہلی تک رہ گئی تھی۔ اور مرہٹہ قوت پھیلتے پھیلتے دریائے نربدا سے پنجاب اور اُدھر ہمالیہ تک کو اپنے احاطے میں لے چکی تھی۔ پیشوائے پونا بالاجی راؤ کی نظریں مغل تاج و تخت پر لگی ہوئی تھیں جنوبی اور شمالی ہند کی جملہ مسلم ریاستیں آپس میں برسرِ پیکار تھیں۔ ان کے حالات اتنے ناگفتہ بہ اور غیر اطمینانی تھے کہ موقع شناس اور لالچی سردار ان سے منہ موڑ کر پیشوائے پونا کی ملازمت میں

چلا جانا ہزار درجہ بہتر سمجھتے تھے مشہور افغان سردار ابراہیم گاردی نے بھی صلابت جنگ کی ملازمت چھوڑ دی اور اچھی تنخواہ اور قدر دانی کے لالچ میں پونا کا رخ کیا پیشوائے پونا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی وہ قدر و منزلت ہوئی کہ ابراہیم گاردی اپنے پچھلے مسلمان آقاؤں کو یکسر بھلا بیٹھا۔ اسے رہنے کے لیے شاندار حویلی ملی اور اس کی کمان میں کئی ہزار مرہٹے دے دیئے گئے جو اس کے اشارے پر کسی بھی وقت اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے پیشوائے پونا کو اس کی دل جوئی بہت عزیز تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پورے ہندوستان میں اس سے بہتر گولہ انداز موجود نہیں ہے۔ اس نے گولہ اندازی کی تربیت فرانسیسیوں سے حاصل کی تھی۔ مرہٹے ابراہیم گاردی کی بہادری اور اس کے سپاہیانہ فن کو نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے مسلمانوں اور خاص کر مغل سپاہ کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ملی احساس اور قومی شعور مسلمانوں کے دلوں سے کافور کی خوشبو کی طرح نکل چکا تھا۔ انہیں کچھ پتہ نہ تھا۔ کہ ہندوستان کا چالاک برہمن کیا چاہتا ہے۔ ابراہیم گاردی اور اس جیسے دوسرے بہت سے مسلمان سپاہی بس اتنا ہی جانتے تھے۔ کہ یہ مرہٹے ان کی بہادری اور سپاہ گری کے زیادہ قدر دان ہیں اچھی تنخواہیں دیتے ہیں، مان دان خوب کرتے ہیں۔ رہنے کو اچھے مکان، کھانے کو اچھی غذا اچھے ہتھیار، اچھے مویشی، عمدہ گھوڑے اور روشن مستقبل، ان سب کی چمک دمک نے ان کے سوچنے سمجھنے کی بصیرت کو دھندلا دیا تھا۔ اور وہ آنے والے بھیانک مستقبل سے بے نیاز اپنے حال میں مگن تھے۔

بالاجی راؤ پیشوا اور سب سے تو مطمئن تھا لیکن ابراہیم گاردی کے نوجوان بھتیجے عرفان سے ذرا چوکنا تھا۔ اس نے اکثر یہ محسوس کیا تھا کہ اس نوجوان میں ملی حمیت جیسی خطرناک شے موجود ہے۔ وہ چاہتا تو اسے ناپسندیدہ قرار دے کر ٹھکانے لگا دیتا یا پونا کی حدود سے نکلوا دیتا لیکن بڑی مشکل تو یہ تھی کہ ابراہیم گاردی اسے بہت چاہتا تھا۔ اور پیشوائے پونا سردست ابراہیم گاردی کی ذرا سی بھی رنجش کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ ابراہیم گاردی کے ساتھ ہزاروں افغان سپاہی بھی تھے اور پیشوا محض عرفان کی وجہ سے ان سب کی خدمات سے محروم ہو جانا حماقت سمجھتا تھا۔

جب افغان سپاہی اپنے مخصوص قومی لباس میں سج دھج کر گھوڑوں پر اکڑے ہوئے گردن ٹیڑھی کر کے مرہٹوں کی آبادی میں سے گزرتے تو ان کی عورتوں کو یہ قد آور نوجوان اس لئے زیادہ پسند آتے کہ ان میں ان کے مرہٹہ جوانوں سے زیادہ وجاہت اور کرّ و فر نظر آتا تھا۔ مرہٹے جو عموماً دھوتیوں میں لپٹے ہوتے ان کے مقابلے میں نہایت حقیر اور کمتر درجے کے نظر آتے، افغان سپاہیوں کے آپس میں ٹکراتے ہوئے ہتھیاروں کی آوازیں مرہٹہ عورتوں کو دور ہی سے بتا دیتی تھیں، کہ ان کے دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دینے والے نوجوانوں کی سواریاں گزر رہی ہیں، بے ساختہ ان کی نظریں شہسواروں کی طرف اٹھ جاتیں اور وہ حسرت اور چاہت سے انہیں اس وقت تک دیکھتی رہتیں جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔ مرہٹے ان مناظر کو دل پر پتھر

رکھ کر دیکھتے۔ ان کی عصبیت کی آگ بھڑک اٹھتی لیکن مصلحت بینی کی سرد ہوائیں ان شعلوں کو سرد کر دیتیں۔ انہیں ان افغانوں سے مغل حکومت اور اسلام کی بیخ کنی کا کام لینا تھا۔ اتنے بڑے مقصد کے لیے ان معمولی باتوں کا برداشت کر لینا نہایت آسان کام تھا۔ لیکن وہ اپنے گھروں کی چار دیواریوں میں بالواسطہ اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم ضرور دیتے کہ مسلمان شودروں سے بھی بدتر ہیں۔ اور ان کا سایہ تک ناپاک ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں حتی الامکان ان سے دور اور محفوظ مزور رہنا چاہیئے۔ وہ یہ بھی بتلاتے کہ مسلمان عورتوں کی عزت نہیں کرتے اور اپنے گھروں میں کئی کئی عورتوں کو اس طرح رکھتے ہیں جیسے باڑوں میں جانوروں کی باڑ رکھی جاتی ہے۔

صبح نماز فجر کے بعد عرفان اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر کئی میل کا چکر لگا کر طلوع آفتاب کے وقت گھر واپس آتا۔ اسے پونا کے قرب و جوار کے مناظر بہت پسند تھے خصوصاً پونا کا وہ حصہ جو پہاڑی کی دشوار گزار راہوں پر مشتمل تھا۔ اسے اس لیے زیادہ پسند تھا کہ انہی میں سے چند راستے اس بلند و بالا پہاڑی کی چوٹی تک جاتے تھے جس پر مرہٹوں کے مضبوط ترین قلعے واقع تھے کبھی یہ جگہ راج گڑھ کہلاتی تھی۔ لیکن جب اورنگ زیب نے اسے فتح کر لیا تو اس کا نام نبی شاہ گڑھ رکھ دیا تھا۔ مگر اورنگ زیب کے بعد جب اس کے جانشین آپس کے اختلافات اور فتنہ و فساد کا شکار ہوئے تو یہ جگہ پھر ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور پھر راج گڑھ کہلائی جانے لگی، اوپر تک پہنچنے کی راہیں بڑی پیچیدہ اور دشوار گزار تھیں۔ عرفان اوپر کئی بار گیا تھا وہ جب مندروں اور شوالوں کے بیچ سے گزرتا ہوا راج گڑھ کی طرف جاتا تو پیچ در پیچ اور دشوار گزار راہیں اس کے گھوڑے کو قدم قدم پر روکتیں ان موقعوں پر عرفان مغلوں سے اپنی افغان عصبی نفرت کے باوجود اورنگ زیب کی اولوالعزمی اور شجاعت کا دل سے قائل ہو جاتا جو راج گڑھ کی دشوار گزار بلندی تک نہ صرف خود پہنچ گیا تھا۔ بلکہ اپنے لشکر کو بھی لے گیا تھا۔ ایک دن جب وہ اپنے انہی خیالات میں ڈوبا ہوا صبح صبح اوپر سے نیچے اتر رہا تھا تو مندروں اور شوالوں کے گھنٹے زور زور سے بج رہے تھے۔ اور بیدی کی باسکٹوں میں پھول لئے عورتیں اور مرد مندروں کی طرف جا رہے تھے۔ یہ پھول مندر کے دیوی دیوتاؤں کے چرنوں میں چڑھائے جاتے تھے ایک سادہ لوح بھولی بھالی زرد ساری میں ملبوس لڑکی کئی دن سے اسے ایک ہی جگہ مل رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ جب وہ ایک بلند و بالا گھنیرے پیپل کے نیچے سے گزرتا تو یہ لڑکی پیپل کی جڑ میں پانی ڈال رہی ہوتی۔ اسی عالم میں وہ ایک اچٹتی نظر عرفان پر ڈالتی اپنی خالی لٹیا سنبھالتی اور دوسرے ہاتھ سے پھولوں کی باسکٹ اٹھا کر مندر کی طرف چل پڑتی۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ لڑکی پلٹ پلٹ کے اسے دیکھتی بھی ہے۔ کئی دن تک تو اس نے لڑکی کی ان حرکات کو کوئی اہمیت نہ دی اور انہیں اس کی عادات اور معمولات میں شمار کرتا رہا لیکن

ایک دن جب وہ پیپل کے نیچے سے گزرا تو اس نے واضح طور پر یہ محسوس کر لیا کہ لڑکی اس کو دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ غیر ارادی طور پر عرفان بھی مسکرا دیا۔ اور آگے بڑھ گیا اس دن لڑکی دیر تک پیپل کی جڑ میں بیٹھی حسرت سے

اُسے دیکھتی رہی جب عرفان اس سے کافی دور ہو گیا تو اس نے مایوسی اور دل شکستگی سے باسکٹ کے پھولوں کو پیل کی جڑ میں الٹ دیا اور خاموشی سے ایک طرف چلی گئی لیکن اس کی چال میں رکاوٹ تھی ایسا لگتا جیسے کوئی اس کے قدم پکڑ رہا ہو، عرفان نے اس کی ان کیفیات کو شدت سے محسوس کر لیا۔ پھر عرفان کے قدم بھی رکنے لگے، یہ موہنی سی صورت اسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ اس نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی اور آہستہ روی سے لڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ لڑکی نے اسے اپنی طرف آتے جو دیکھا تو اس کی چال میں اور سُستی پیدا ہو گئی۔ عرفان اس کی طرف بڑھ تو ضرور رہا تھا لیکن چند خدشات اسے پریشان ضرور کر رہے تھے۔ وہ مسلمان تھا اور لڑکی ہندو، اور پھر سارا علاقہ مرہٹوں کے زیر اثر تھا جو بظاہر بے حد روادار اور فراخ دل تھے لیکن اندر سے سخت متعصب اور ہندو دھرم کے شیدائی تھے وہ یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کہ ایک مسلمان نوجوان کسی ہندو لڑکی سے ربط ضبط بڑھائے، انہی خیالات میں ڈوبا ہوا جب وہ لڑکی کے قریب پہنچا تو لڑکی ایک چٹان کی آڑ میں سمٹ سی گئی۔ عرفان نے گھوڑا روک دیا اور اپنے آس پاس دور دور تک نظریں دوڑائیں، راستہ سنسان پڑا تھا یا ہاں دور بہت دور ایک مندر کے آس پاس کچھ لوگ متحرک نظر آ رہے تھے۔ اس نے پہلی بار لڑکی کو بغور دیکھا وہ بہت شرما رہی تھی، اس کی ٹھوڑی پر تنھا سا تل عجب مزہ دے رہا تھا۔ ہلالی بھنوؤں کے نیچے لمبی لمبی پلکیں اور پلکوں کے درمیان بادامی نشے میں ڈوبی آنکھیں ایسی نہ تھیں کہ ایک نوجوان ان کا زخمی نہ ہو جاتا۔ رنگت ایسی تھی جیسے میدے کو قندھاری انار کے رس میں گوندھ دیا گیا ہو۔ اس سرخی میں حیا کی سُرخی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ساری کے آنچل سے کسی حد تک اپنے چہرے کو چھپانے کی کوشش کی۔

عرفان بلا پس و پیش گھوڑے سے اُتر پڑا اور چٹان کی آڑ میں اس کے قریب پہنچ گیا اور مرہٹی زبان میں دریافت کیا۔

"کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟ معاف کرنا میں نے یہ بات تمہارے طور و طریق سے محسوس کی ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو میں اسی وقت واپس چلا جاؤں گا۔"

لڑکی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن آواز حلق کے اندر ہی پھنس کر رہ گئی۔

عرفان چٹان کی آڑ میں بیٹھ گیا کہنے لگا۔ "تم بھی بیٹھ جاؤ تاکہ کوئی آنے والا ہمیں دیکھ نہ سکے۔"

لڑکی نے فوراً تعمیل کی اور دبک کر اس طرح بیٹھ گئی کہ چٹان کی آڑ میں اس کا وجود بالکل روپوش ہو گیا۔

عرفان پھر بولا۔ "جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہہ دو۔"

لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میں بہت دکھی ہوں، کیا تم میری مدد کرو گے؟"

"کس قسم کی مدد؟"

"تم مجھے یہاں سے نکال لے چلو!"

"کہاں؟"

"دور، بہت دور، دہلی کے اس پار، پنجاب سے بھی دور!"

عرفان سوچنے لگا یہ بات کیا ہوئی۔ اس نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"لیلاوتی!"

"لیلاوتی! کیا تم مجھ سے اچھی طرح واقف ہو؟"

"نہیں!" وہ لجا کر بولی "بس اتنا جانتی ہوں کہ تم مسلمان ہو اور شاید پٹھان بھی!"

"تم صحیح جانتی ہو لیکن تم یہاں سے فرار کیوں ہونا چاہتی ہو۔؟"

"خان! میں بہت دکھی ہوں!" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "چند دنوں بعد مجھ پر ایک ایسی آفت نازل ہونے والی ہے کہ میں اس کے خیال ہی سے مری جا رہی ہوں۔"

عرفان نے مردانہ وار جواب دیا "میں تمہیں لے کر فرار تو نہیں ہو سکتا لیکن ہاں اگر تم اپنے مصائب کا اظہار کرو تو بہت ممکن ہے کہ میں اس کا کوئی تدارک کر دوں"۔

لیلاوتی نے ساری کے ایک کونے کو اپنی انگلی پر لپیٹ لیا اور افسوس سے بولی "مرہٹواڑے کی حدود میں ہماری طرح تم بھی بے بس ہو"۔ اس کے بعد اس نے گردن اٹھا کر پیپل کے درخت کی طرف دیکھا اور بولی "تم نے دیکھا ہو گا کہ میں ہر روز صبح صبح برم دیو (برہما دیوتا) کے چرنوں میں جل پھول چڑھاتی ہوں یہ میری ایک منت کا عمل ہے، میرا خیال تھا کہ برم دیو میری مدد کریں گے اور میں چند دنوں بعد پاپ کے جس نرکھ میں گرنے والی ہوں اس سے بچا لیں گے لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ برم دیو نے میری منت قبول نہیں کی!"

عرفان نے پریشان ہو کے کہا "تم سب کچھ صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتیں!"

لیلاوتی نے جواب دیا "میں نے سنا ہے تمہاری قوم کا کوئی سردار کابل سے ہندوستان آ رہا ہے اور اس دیش کے مشہور میدان جنگ کرکیشتر میں کوئی خوفناک یدھ ہونے والا ہے!"

"ہاں!" عرفان نے جواب دیا "مشہور افغان جرنیل احمد شاہ درانی اپنی عظیم سپاہ کے ساتھ آنے والا ہے۔ لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"میرا اس سے کوئی سمبندھ نہیں!" لیلاوتی نے جواب دیا۔ ہم مرہٹوں میں معلوم نہیں کب سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ جب قوم پر کوئی برا وقت آتا ہے یا قوم کوئی بڑا کام کرنے والی ہوتی ہے تو ہمارے سردار قوم کی

کسی ایک کنواری کو سجا دسنوار کر دلہن بناتے ہیں اور اسے ایک رات کے لیے پنچائتی مندر میں چھوڑ دیتے ہیں یہ کنواری ساری رات مندر میں شیو کی مورتی کے سامنے تنہا رہتی ہے۔ کہتے ہیں کہ رات کے کسی حصے میں خود شیو جی اس کنواری کے پاس آتے ہیں اور اسے اپنے وجود سے صبح تک خوب اچھی طرح لطف اندوز کرتے ہیں اور پھر جب واپس جانے لگتے ہیں تو اس کنواری کو مستقبل کی وہ ساری باتیں بتا جاتے ہیں جو قوم پر خوشی یا مصیبت کی

شکل میں نازل ہونے والی ہوتی ہیں - یہ کہتے کہتے لیلاوتی آبدیدہ ہوگئی ذرا دم لے کر بولی سنتی ہوں ہمارا پیشوا مہابائی قوم کے سردار احمد شاہ درآنی سے کوئی بڑی جنگ کا ارادہ رکھتا ہے اس جنگ کے انجام کو جاننے کیلئے یہ طے پایا ہے کہ مجھے شیوجی کے چرنوں میں ایک رات کے لیے چھوڑ دیا جائے اور میں جانا نہیں چاہتی -"

عرفان حیران رہ گیا یہ عجیب بات معلوم ہوئی تھی - اس نے پوچھا "کیا سچ مچ تمہارے شیوجی مہاراج ان کنواریوں کے پاس آجاتے ہیں ؟"

لیلاوتی نے رُک رُک کر جواب دیا "پہلے تو میں بھی یہی سمجھتی تھی کہ شاید شیوجی سچ مچ آجاتے ہوں گے - لیکن جب سے میری ایک سہیلی شیوجی کے پاس ایک رات گزار کر آئی ہے میرا ان خرافات پر سے یقین جاتا رہا -"

"وہ کس طرح ؟"

میری ایک سہیلی سبھدرا ہے صورت شکل کی بڑی اچھی ہے اس پر ہمارے پیشوا کا بھتیجا عاشق ہو گیا لیکن خود سبھدرا نے اسے ناپسند کر دیا - پہلے کچھ دنوں تک تو وہ سبھدرا پر اپنا پریم جتاتا رہا پھر اپنے مرتبے کا رعب جمایا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ سبھدرا پر اس کی کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تو اس نے یہی شیوجی مہاراج والی چال چلی ، اور ایک دن سبھدرا کو جبراً شیوجی کے چرنوں میں ایک رات گزارنے کے لیے پنچائتی مندر میں بھیج دیا گیا - سبھدرا بتلاتی تھی کہ رات کے پچھلے پہر جب مندر کے پچھلے حصے کی ایک کھڑکی کھلی اور اس میں سے شیوجی مہاراج نمودار ہوئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ وہی خبیث ، پیشوا کا بھتیجا تھا - سبھدرا نے بہت بچنے کی کوشش کی ، بہت کچھ آس پاس بھاگنے کی کوشش کی لیکن نہ بھاگ سکی ، سارے راستے پہلے ہی سے بند کئے جا چکے تھے - بالآخر سبھدرا نے اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت بے بس اور مجبور ضرور ہے ، لیکن وہ شیوجی مہاراج کے اس بہروپ سے آگاہ ضرور ہو چکی ہے لیکن اس نے سبھدرا کو ڈانٹا اور اسے یہ یقین دلایا کہ وہ جو کچھ سمجھ رہی ہے - غلط ہے دراصل شیوجی مہاراج خود اس وقت پیشوا کے بھتیجے کے روپ میں نازل ہوئے ہیں !" اس کے بعد ذرا رُک کر بولی "میں بھی یہی ڈرتی ہوں کہ کہیں شیوجی مہاراج پیشوا کے سب سے بڑے لڑکے بسواس راؤ کے روپ میں نہ نازل ہو جائیں کیونکہ بسواس راؤ مجھ سے کئی بار اظہارِ عشق کر چکا ہے - لیکن میں اسے بالکل ناپسند کرتی ہوں -"

عرفان نے کہا "لیکن تم بسواس راؤ سے کیوں نفرت کرتی ہو ، شاید تم نہیں جانتیں کہ دہلی میں مغل تاج و تخت بسواس راؤ کا انتظار کر رہے ہیں اور عنقریب پورے ہندوستان میں اس سے بڑی کوئی دوسری شخصیت نہ ہوگی -"

لیلاوتی عرفان کی باتوں سے کچھ مایوس سی ہوگئی - ناامیدانہ بولی "شاید میں نے اپنی سہائتا کے لیے غلط آدمی کو چُنا ہے -"

عرفان جلدی سے بولا "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ہم مسلمان بھی ہیں اور افغان بھی۔ ہم جب کسی سے کوئی وعدہ کرتے ہیں تو بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور پھر جب وعدہ کر لیتے ہیں تو اس وقت جان رہے یا جائے کسی بات کی پروا نہیں کرتے اور سر دے کر اپنے وعدے کا ایفا کرتے ہیں۔"

لیلاوتی کچھ بولنے کے بجائے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

عرفان نے پوچھا "تمہیں کب شیوجی کے چرنوں میں بھیجا جائے گا۔"

"آج منگلوار ہے، شنی وار کو بھیجا جائے گا!"

"اچھا! وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ میں تم سے واقف نہیں کون ہو، کہاں رہتی ہو؟ تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟ بھائی کتنے ہیں؟ کچھ بھی نہیں جانتا اس کے باوجود میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم نے مجھ سے مدد چاہی ہے تو میں بھی تمہیں مایوس نہ کروں گا۔ لیکن تم مجھے ایک دن اور ایک رات سوچنے کا موقع ضرور دو، پرسوں اسی وقت مجھے تم یہیں اسی جگہ مل جانا میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔"

لیلاوتی کے ہونٹوں پر امید کی خوشی سے مسکراہٹ کھیلنے لگی "بہتر ہے میں ویشوں کی بستی میں رہتی ہوں میرا باپ ایک سال پہلے دہلی کے آس پاس کی جنگ میں مارا گیا، میرا ایک ہی بھائی ہے جس کی عمر تین سال ہے۔ چاچا چاچی ہم سب کی پرورش کرتے ہیں۔"

عرفان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں چلتا ہوں تم تھوڑی دیر یہیں رکی رہو، جب میرے گھوڑے کی ٹاپیں دور بہت دور نکل جائیں تو تم یہاں سے نکل کر چپ چاپ سیدھی اپنے گھر چلی جانا اور ہاں میری ایک بات ضرور یاد رکھنا۔" اس کے بعد اس نے پیپل کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کل سے تمہیں برم دیو سے مدد مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شیوجی مہاراج کے مقابلے میں شاید وہ تمہاری کوئی مدد نہ کریں گے۔ ہاں اللہ ضرور مدد کرے گا۔"

لیلاوتی نے ساری باتیں اس طرح سنیں گویا اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اس کی دلچسپی عرفان کی واپسی میں تھی، ایسی دلچسپی جس میں سوگواری کی آمیزش تھی جدائی کا صدمہ، علیحدگی کی کوفت اور دوری کی اذیت، لیلاوتی اس نوجوان سے نجانے کیسی امیدیں لگا بیٹھی تھی۔

عرفان نے لیلاوتی کے کلیجے کے آر پار ہو جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور مسکراہٹ کے تیر چھوڑتا ہوا اپنے گھوڑے کی طرف چلا گیا۔ گھوڑا اسے دیکھتے ہی ہنہنایا اس نے اس کی پشت تھپتھپائی اور اچک کر اس پر سوار ہو گیا، چلنے چلاتے ایک بار پھر اس نے لیلاوتی کی طرف دیکھا وہ پتھروں کی آڑ سے ذرا سی گردن نکالے اس کی رخصتی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ گرد کا ایک بادل اٹھا اور دم بدم دور تک اٹھتا ہی چلا گیا اور عرفان لمحہ بہ لمحہ مختصر ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ نقطے سے نقطۂ موہوم بن گیا، لیلاوتی کے دل میں ایک کسک سی ہوئی اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ گئی، کچھ دیر بعد وہ بھی چٹانوں کی آڑ سے نکل کر عام شاہراہ پر آ گئی، دور سے چند پجاری خالی بالٹیں لیے اس کی طرف چلے آ رہے تھے۔

عرفان کے چچا ابراہیم گاردی کو دس ہزار افغان سپاہیوں کی کمان حاصل تھی اور یہ وہ منتخب اور جری سپاہی تھے جو مرہٹہ افواج کی طرف سے میدان جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ پیشوائے پونا نے بیس ہزار مرہٹہ سپاہی بھی ابراہیم گاردی ہی کی کمان میں دے رکھے تھے۔ بظاہر یہ اس کے چچا کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور ابراہیم گاردی پیشوائے پونا کی اس قدر دانی اور عزت افزائی کو تحسین و تشکر گزاری کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن عرفان کو اپنے چچا کے نقطۂ نظر سے اختلاف تھا۔ ان بیس ہزار مرہٹہ سپاہیوں کی بابت یہ سمجھتا تھا کہ چالاک پیشوا نے خطرناک افغان کو قابو میں رکھنے کے لیے ان کے ارد گرد بیس ہزار مرہٹے لگا دیئے ہیں، اس طرح جہاں ایک طرف محض سپاہی اور سادہ لوح ابراہیم کے دل کو جیت لیا تھا، وہیں اجڈ اور خطرناک افغانوں کے خطرے کا سدباب بھی کر دیا تھا۔

عرفان اپنے ان خیالات کا اظہار اپنے چچا پر کئی بار کر چکا تھا

لیکن ابراہیم گاردی ہمیشہ اسے جھڑک دیتا اور یہی کہتا کہ "مخلص غیر متعصب اور فراخ دل پیشوائے پونا کی بابت اس انداز میں نہیں سوچنا چاہیئے۔" عرفان کہتا کہ "مرہٹے پورے ہندوستان پر حکومت کا خواب دیکھ رہے ہیں۔" ابراہیم گاردی جواب دیتا کہ "حکومتوں کی تبدیلی سے ہم پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان پر مغل حکومت کریں یا مرہٹے، ہمیں تو ان دونوں کی ملازمت ہی کرنا ہے۔ میرے نزدیک مغلوں سے مرہٹے زیادہ اچھے ہیں یہ خدمات کا صحیح معاوضہ تو دیتے ہیں خاطر خواہ ہماری عزت افزائی کرتے ہیں۔"

عرفان گستاخی پر اتر آتا۔ کہتا: "چچا جان! مرہٹوں کی نوکری پر میرا ضمیر مجھ پر ملامت کرتا رہتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب عاقبت نااندیشی سے مرہٹوں سے مل کر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔

ابراہیم گاردی نے اسے ڈانٹ دیا۔ "بھتیجے! تم ابھی بچے ہو، اسلام کی حفاظت کا خدا نے وعدہ کیا ہے یہ کس طرح مٹ سکتا ہے؟ جو اسے مٹانا چاہے گا خود مٹ جائے گا۔"

عرفان اندرونی کرب کو چھپانے کے لئے جبراً مسکرایا، مایوس لہجے میں جواب دیا۔ "میں خدا کے وعدے کی تکذیب تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اسلام اگر ہندوستان سے مٹ گیا تو دنیا میں کہیں نہ کہیں تو زندہ ہی رہے گا۔ اور دنیا کے کسی ایک شہر یا بستی میں بھی اگر اسلام سمٹ کر موجود رہا تو گویا خدا اپنے وعدے میں سچا رہا لیکن سوچیے تو سہی کہ وہ اسلام بذاتہ خود کتنا مظلوم اور محکوم اسلام ہو گا۔ ہمیں ہندوستان کی مغلیہ حکومت کا تحفظ کرنا چاہیئے محض اس لیے کہ مغل ناکارہ اور عیش و عشرت میں کھوکھلے ہو جانے کے باوجود مسلمان ہیں اور مرہٹے انہیں مسلمان ہونے کے ہی جرم میں دہلی کے تاج و تخت سے ہی محروم کر دینا چاہتے ہیں۔"

ابراہیم گاردی نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "ہم نمک حرامی نہیں کر سکتے ہم مرہٹوں کے نمک خوار ہیں۔"

عرفان دل برداشتہ ہو کر چپ ہو رہا۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ اپنے چچا کا ساتھ چھوڑ دے۔ اور خاموشی سے دہلی چلا جائے اور وہاں مغل فوج میں شامل ہو کر مرہٹوں کا مقابلہ کرے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مغل درباری

اُمرا کی باہمی رقابتوں اور آویزشوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے مغل فوج میں سخت ابتری اور انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ اس کے دل و دماغ تاریکی میں ڈوبتے چلے گئے اسے ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک اور عبرتناک نظر آرہا تھا۔ یہ قوم ملّی اور سیاسی شعور، اتفاق اور غیرت و حمیت کھو چکی تھی۔ کئی سالوں سے ہندوستانی افق پر احمد شاہ درانی کا نام بھی ابھر اتھا لیکن اس فاتح میں خرابی یہ تھی کہ یہ دہلی یا اس کے نواح تک آیا اور اپنی پسند کے امراء کو دہلی دربار یا پنجاب کی صوبے داری دے کر افغانستان واپس چلا جاتا تھا۔ عرفان نے سوچا کہ احمد شاہ درانی کی ملازمت مرہٹوں یا مغلوں کی ملازمت سے ہزار درجہ بہتر رہے گی یہ فیصلہ کر کے وہ فرار ہونے ہی والا تھا کہ لیلاوتی کا واقعہ پیش آگیا، وہ اس کے بارے میں بہت کچھ سوچتا رہا ایک آدھ بار دل میں یہ خیال بھی آیا کہ وہ لیلاوتی کو بھی اپنے ساتھ لیتا جائے لیکن جب وہ اس کے مابعد اثرات پر غور کرتا تو مارے ندامت اور خجالت کے پسینہ آجاتا، لوگ اس کے پیچھے کیسی کیسی بُری بُری شرمناک افواہیں اڑائیں گے۔ اور خود اس کے باپ فتح خان گاردی اور چچا ابراہیم گاردی کو کتنی رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا وہ اس کے تصور ہی سے کانپ گیا۔ لیکن اس کے باوجود دل کے اندر سے یہی آواز آرہی تھی کہ کچھ بھی ہو لیلاوتی کی مدد ضرور کرنی ہے۔ اس نے پوری رات اس فکر میں گزار دی لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا اگر یہ معاملہ کسی مسلمان لڑکی کا ہوتا تو اس کی تدبیریں کی جاسکتی تھیں، لیکن معاملہ ہندو لڑکی کا تھا۔ اور واقعات یہ بتاتے تھے کہ وہ خالص مذہبی ہیں جس میں عرفان کی ذراسی بھی دخل اندازی مداخلت فی الدّین کے معنی رکھتی تھی۔

صبح حسب معمول نماز فجر کے بعد وہ اس سمت چل دیا جہاں پیپل کا درخت واقع تھا اور جس کی جڑوں میں لیلاوتی جل پھول چڑھایا کرتی تھی، آج وہ جگہ ویران تھی، راستے اکّا دُکّا پجاریوں سے آباد تھے۔ مختلف سمتوں سے مندروں کی گھنٹیوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں، انہی میں سنکھ کی آوازیں بھی شامل تھیں، پیپل کے نیچے پہنچ کر اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ آہستہ سے گھوڑے سے نیچے اترا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا پیپل کی جڑ کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں ایک دن پہلے کے پڑے ہوئے پھول بُری طرح مُرجھا چکے تھے۔ اور پانی کا تو کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

اس کی چشم تصوّر نے لیلاوتی کو نہایت عقیدت سے لٹیا کے پانی کو جڑ میں انڈیلتے دیکھا اور پھر ہاتھ باسکٹ کے پھولوں کو برہم دیو کے چرنوں میں نچھاور کرنے لگے، زرد ساری میں لجایا شرمایا جسم کمان کی طرح جھکا ہوا دزدیدہ نگاہی سے اسے بھی دیکھ رہا تھا ان میں ایک پیام تھا۔ اشتیاق تھا خواہش تھی اور غالباً چاہت بھی، عرفان نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ اس کم گو اور ادا اس لڑکی نے معلوم نہیں کس طرح اس کے دل کو مسل کے رکھ دیا ہے۔ اور چپکے چپکے کچھ بتائے بغیر اس کے دل پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسے لیلاوتی میں کچھ ایسی چیزیں محسوس ہو رہی تھیں جو مسلمان لڑکیوں میں نہیں پائی جاتیں، مظلومیت اور خود سپردگی کا بے پناہ تقاضا، جیسے لیلاوتی کہہ رہی ہو "مجھے اپنے دل میں بسالو، مجھے اپنے دل میں رکھ لو۔ مجھ سے محبت کرو، میں محبت کی بھوکی ہوں" عرفان نے محسوس کیا کہ یکایک اس کا دل کچھ اتنا گداز ہو چکا ہے کہ وہ لیلاوتی کے لئے اس کی چاہت سے سرشار ہو کر کافرانہ عمل پر مائل ہو رہا ہے، بے اختیار اس کا جی چاہا کہ

وہ کہیں سے لٹیا بھر پانی اور کچھ پھول حاصل کر کے لیلاوتی کی طرف سے برم دیو کے قدموں میں چڑھا دے لیکن جب یہ دونوں چیزیں میسر نہ آئیں تو وہ یوں ہی پیپل کی جڑ کی طرف جھک گیا اور مرجھائے ہوئے پھولوں کو ہاتھ میں لے کر سونگھنے لگا اسے ان میں سے پھولوں کے بجائے لیلاوتی کی خوشبو نکلتی محسوس ہوئی وہ ابھی معلوم نہیں کتنی دیر تک اور یوں ہی دیوانگی میں مبتلا رہتا کہ کسی کی آہٹ نے اسے چونکا دیا اس کا دل دھڑکنے لگا اس نے سوچا یہ ضرور لیلاوتی کی آہٹ ہے لیکن جب مڑ کے پیچھے دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا یہ پیشوا کا بڑا لڑکا بسواس راؤ تھا جو نہایت تمکنت سے گھوڑے پر سوار اس کے سر پر موجود تھا۔ دونوں کی ایک دوسرے سے نظریں چار ہوئیں اور دونوں ہی مسکرا دیئے بسواس راؤ نے ہنس کر حاکمانہ انداز میں کہا۔ "خان صاحب! برم دیو کے چرنوں میں جھکے۔ کیا کر رہے ہو؟"

عرفان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ افغانی اکھڑ پنے سے جواب دیا۔ "راؤ جی! میں جڑ میں پڑے ہوئے سوکھے پھولوں کو دیکھ کر آدمی کی نادانی اور سادہ لوحی پر غور کر رہا تھا۔ سوچتا ہوں ان درختوں میں کیا رکھا ہے جو انسان اپنی تمنائیں ان سے وابستہ کر دیتا ہے۔"

بسواس راؤ عرفان کی صاف گوئی کا دل سے قائل ہو گیا۔ مسکراتا ہوا بولا۔ "یہ باتیں تم مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں ہم درختوں کی پرستش نہیں کرتے بلکہ انہیں کسی اعلیٰ وارفع ذات کا مظہر سمجھتے ہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتلاؤ تم یہاں کتنی دیر سے موجود ہو؟"

"تھوڑی دیر سے!" عرفان نے جواب دیا۔ "کوئی خاص بات؟"

بسواس راؤ اس طرف دیکھنے لگا۔ جدھر سے لیلاوتی آیا کرتی تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "وہ ابھی تک نہیں آئی شاید۔" پھر عرفان سے مخاطب ہوا۔ "خان صاحب تم لوگ گوشت کھاتے ہو، تمہیں برم دیو کے چرنوں سے دور دور رہنا چاہیئے، تم چاچا گاروی کے بھتیجے ہو اس لیے تمہاری عزت کرتا ہوں لیکن دھرم کے معاملہ میں سارے رشتے بھلا دیئے جاتے ہیں، آئندہ تمہیں بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

سوکھے ہوئے پھول اب بھی اس کی مٹھی میں تھے۔ اس نے انہیں نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے جیب میں ڈال لیا اور کوئی جواب دیئے بغیر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے لگام کی ہلکی سی جنبش سے گھوڑے کا رخ بسواس راؤ کی طرف کیا اور اس کے قریب پہنچ کر پرجوش آواز میں کہا۔ "راؤ جی! تم پیشوا کے بیٹے ہو، یہ علاقہ تمہارے زیر نگیں ہے۔ اور ہم لوگ تمہاری عملداری میں تمہاری رعایا یا ملازم بن کر رہ رہے ہیں۔ ان حالات میں تم جیسا چاہو حکم دو۔ رہا ان کی تعمیل کا سوال تو یہ افغان سرشت کے خلاف ہے، میں کل پھر یہاں آؤں گا۔ اگر یہاں آنے سے روک سکنا تو روک لینا۔" یہ کہہ کر گھوڑے کے رخ کو موڑا ایڑ لگائی اور عام شاہراہ پر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا ہوا ہو گیا۔ بسواس راؤ دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

آگے جا کے اس نے اپنے گھوڑے کا رُخ دیشوں کی بستی کی طرف کر دیا۔ اس کی نظریں اپنے سامنے دور تک لیلاوتی کو تلاش کر رہی تھیں، لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ جب وہ دیشوں کی بستی کے نکڑ پر پہنچا تو اسے ذرا دور سڑک میں ملبوس ایک عورت جاتی ہوئی نظر آئی اس کی پشت عرفان کی طرف تھی۔ اس کے ہاتھ میں لٹیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں پھولوں سے بھری ہوئی تھالی، اسے شبہ گزرا کہ یہ ضرور لیلاوتی ہے۔ بے اختیار ہی دل چاہا کہ گھوڑے کو تیزی سے بڑھا کر اس کے آگے پہنچ جائے اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے لیکن پھر یہ سوچا کہ اس کی یہ حرکت کہیں خود لیلاوتی کو اس سے متنفر نہ کر دے، اس نے گھوڑے کی رفتار اور سست کر دی اور وہ آہستہ آہستہ اس کا پیچھا کرنے لگا۔ گھوڑے اور عورت کی رفتار میں بڑا فرق تھا۔

عورت نے گھوڑے کی ٹاپ پر گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور ذرا اور کنارے ہو گئی۔ عرفان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی یہ لیلاوتی نہیں تھی، کوئی اور عورت تھی معمولی شکل صورت کی ایک عام سی عورت، ناامیدی نے اس کے دل کو کچل دیا۔ کچھ دور جا کر اس نے گھوڑے کا رخ بدلا اور ایک دوسرے ہی راستے پر ہو لیا لیکن اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ عورت اسے بار بار گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھی۔

اسے کچھ پتا نہ تھا کہ اس بستی میں لیلاوتی کہاں رہتی ہے۔ یہاں کچے پکے مکانات کا بے ڈھنگا سلسلہ دور تک پھیلا چلا گیا تھا۔ کہیں کہیں چوڑے راستے تھے لیکن زیادہ تر چھوٹی چھوٹی پیچ در پیچ اور تنگ گلیاں تھیں، ایک جگہ اس نے بہت سی عورتوں کا ہجوم دیکھا وہ اس طرف بڑھ گیا۔ آگے جا کر پتا چلا کہ یہ پنگھٹ تھی۔ جہاں بستی کی عورتیں پانی بھرنے جمع ہوئی تھیں، وہ پنگھٹ کے قریب پہنچ گیا۔ کنوئیں سے ذرا آگے ایک چرہی بنی ہوئی تھی۔ جس میں پانی بھرا ہوا تھا اور اس سے جانور اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ عرفان نے سوچا کہ چلو گھوڑے کو پانی پلانے کے بہانے کچھ وقت یہیں گزار دیا جائے ہو سکتا ہے اس درمیان کسی طرف سے لیلاوتی نمودار ہو جائے۔ اور وہ اسے ایک نظر دیکھ لے لیکن چرہی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی چند ہندو نوجوانوں نے اس کا راستہ روک دیا اسے بتلایا کہ وہ چونکہ مسلمان ہے اس لئے اس کا گھوڑا اس چرہی میں منہ ڈال کر اسے ناپاک نہیں کر سکتا۔ عرفان کو غصہ تو بہت آیا۔ نوجوانوں کا لہجہ اور سلوک ایسا تھا جیسے وہ اچھوت ہو۔ وہ غصہ پی گیا۔ کیوں کہ یہاں غصہ بے سود تھا، یہ مرحلہ عملداری تھی۔

ایک نوجوان نے تو آگے بڑھ کر یہاں تک پوچھ لیا کہ وہ یہاں کس سے ملنے آیا ہے؟ لیکن عرفان نے اس کا جواب نہ دیا ایک اچٹتی نظر پنگھٹ کی عورتوں پر ڈالی وہ سب گھونگھٹ نکالے اسے دیکھ رہی تھیں، ان میں بھی لیلاوتی موجود نہ تھی۔ اس نے اپنے گھوڑے کو اور آگے بڑھایا اور پنگھٹ سے کافی دور نکل گیا۔ ذرا سی دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی حویلی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس حویلی کے آس پاس دیواروں پر نارائن اور پاربتی کی مورتیں بنی ہوئی تھیں، اور دروازے کی پیشانی پر اوم کا نشان تھا۔ اسی لمحے حویلی کے اندر سے ایک چھوٹا سا بچہ بھاگتا ہوا

نکلا۔ اس کے پیچھے ہی کوئی پیچھا کرتا ہوا باہر آگیا بچہ حویلی سے نکل کر دیوار کے سہارے سہارے بھاگنے لگا۔ اس کے پیچھے ساری میں ملبوس ایک لڑکی نکلی اور بچے کے پیچھے بھاگنے لگی تھوڑی دور جا کر اس نے بچے کو پکڑ لیا اور اسے زبردستی گود میں اٹھا کر واپس لانے لگی۔ بچہ تلملا رہا تھا، مچل رہا تھا اور بری طرح ہاتھ پیر چلا رہا تھا۔ رو بھی رہا تھا اور لڑکی اسے پکڑ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ واپسی میں اچانک دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں دھک سے رہ گئے یہ لیلاوتی تھی، لیلاوتی کی ہنسی کافور ہو چکی تھی۔ اس کے قدم ایک دم رک گئے۔ اور اس نے عرفان کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ "تم یہاں کیسے آگئے ہو؟"

عرفان کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا "لیلاوتی! آج تم جل پھول چڑھانے نہیں گئی تھیں!"

لیلاوتی نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اجنبیوں کی طرح جواب دیا "تم نے منع جو کر دیا تھا۔"

بچہ اب بھی تلملا رہا تھا۔ عرفان نے کہا "اسے اندر چھوڑ آؤ۔"

لیلاوتی ایک لمحے کے لیے رکی پھر پریشان ہو کر جواب دیا "یہاں سے فوراً واپس جاؤ۔ کل اس جگہ مل جانا جہاں کا وعدہ ہے۔"

اور وہ غڑاپ سے حویلی کے اندر چلی گئی اور اپنے پیچھے حویلی کا دروازہ بھی بند کر لیا۔ دروازے کے بند ہونے کی چوٹ عرفان نے اپنے دل پر محسوس کی۔ وہ کچھ دیر وارفتہ کھویا کھویا سا وہیں کھڑا حویلی کے دروازے کو تکتا رہا اس کا خیال تھا کہ کچھ بھی ہو ایک بار لیلاوتی باہر ضرور نکلے گی لیکن کافی دیر گزر جانے کے باوجود وہ واپس نہ آئی۔ پھر اس کے کانوں میں لیلاوتی کے آخری کلمات گونجنے لگے "یہاں سے فوراً واپس جاؤ۔ کل اسی جگہ مل جانا جہاں کا وعدہ ہے۔"

اس نے دل شکستگی سے گھوڑے کا رخ موڑا اور آہستہ آہستہ جدھر سے آیا تھا واپس ہوا۔ وہ مڑ مڑ کر حویلی کے دروازے کو دیکھتا جاتا تھا اس کے جاتے ہی حویلی کا دروازہ کچھ کھلا اور اس میں سے سرخ رنگ جھلکنے لگا۔ لیلاوتی اس کی واپسی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ عرفان نے بڑی کوشش کی کہ یہ سرخ جھلک نمایاں طور پر نمودار ہو کر لیلاوتی بن جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔ سارے جسم کی جان آنکھوں میں آ گئی تھی۔ دل ڈوبنے لگا تھا اسی عالم میں ایک بار پھر اس کا بسواس راؤ سے سامنا ہو گیا وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا اس کے پاس سے گزرا اور دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں، بسواس راؤ نے پوچھا۔

"خان صاحب! تم یہاں کیسے؟"

عرفان نے کوئی جواب نہ دیا۔ گونگوں کی طرح اپنی راہ چلتا رہا۔ بسواس راؤ نے بھی دوسرا کوئی سوال نہ کیا۔ بس دیکھتا ہوا لیلاوتی کی حویلی کی طرف بڑھ گیا۔ عرفان نے ایک بار پھر حویلی کے دروازے میں نظر آنے والی سرخ جھلک کو دیکھنا چاہا لیکن اب وہاں کچھ بھی نہ تھا، ہاں تھوڑی دیر بعد اس نے یہ ضرور دیکھا کہ بسواس ... اندر داخل

ہو گیا۔ اندر سے ایک آدمی نمودار ہوا جس نے بسواس راؤ کے گھوڑے کی لگام تھام لی، عرفان کے دل کو ایک دھچکا اُ لگا۔ اس نے سوچا لیلاوتی کا خیال فضول اور احمقانہ ہے۔ اسے اس انمل جوڑ کی تلخ صداقت کو تسلیم کر لینا چاہئیے

عرفان کی بھوک پیاس اڑ گئی، پونا کی فضا اسے راس نہیں آرہی تھی۔ اس سے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ پونا کو چھوڑ دینے کا خیال شدت سے گھر کرتا جا رہا تھا ذراسی دیر کے لیئے لیلاوتی نے اس کے قدم پکڑ لیئے تھے۔ لیکن بسواس راؤ کے وجود نے درمیان میں آکر دونوں کو علیحدہ کر دیا۔ وہ ایک ہندو لڑکی سے محبت کا خیال تک نہ لا سکتا تھا اگر لیلاوتی اسے چاہنے بھی لگے تب بھی ہندو یہ برداشت نہ کریں گے کہ ایک ہندو لڑکی کسی مسلمان سے محبت کرے، ایسی محبت کا گلا گھونٹ دیا جانا یقینی تھا۔ ایک بار پھر خیال احمد شاہ درانی کی طرف گیا اور عین اس وقت جب کہ وہ یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ اسے پونا سے فرار ہو کر درانی افواج کی راہ لینا ہے۔ لیلاوتی کی آواز گونجنے لگی۔ وہ کھڑی کہہ رہی تھی "واپس جاؤ۔ کل اسی جگہ مل جانا جہاں کا وعدہ ہے!" اس نے سوچا کہ لیلاوتی سے وعدے کے مطابق ایک بار مل ضرور لینا چاہیئے۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہیئے۔

دوپہر کے بعد پیشوا کا آدمی آیا اور ابراہیم گاردی کو بلا کر لے گیا۔ عرفان کا ماتھا ٹھنکا، وہ سمجھ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے اور یہ گڑبڑ بسواس راؤ کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ اسے شرم سی محسوس ہوئی کہ ہو سکتا ہے لیلاوتی کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جائے اور معلوم نہیں کیا کچھ کہا جائے۔ اسے چچا گاردی سے شرم سی محسوس ہونے لگی، اس نے سوچا کہ چچا واپس آنے کے بعد اسے بلائیں گے ضرور، اور پھر معلوم نہیں کیسی کیسی باتیں کریں

اسے تو چچا گاردی کے سامنے جانے ہی سے ڈر سا لگنے لگا۔

دوسرا دن بھی قریب ہی تھا اور وہ ساعتیں بھی تیزی سے قریب آرہی تھیں جن میں لیلاوتی سے مل کر اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا تھا۔ یک بیک حالات جیسی شکل اختیار کر رہے تھے ان میں لیلاوتی سے کوئی وعدہ کرنا بہت مشکل تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ ایک افغان سپاہی ہے۔ جسے محبت وغیرہ سے بچنا چاہیئے۔ ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر بزدلی اختیار کرنا کم از کم ایک افغان کو بالکل زیب نہیں دیتا محبت عورت سے نہیں ہتھیاروں سے کرنا چاہیئے۔ دل کو سکون عورت کی آغوش میں نہیں میدان جنگ میں ملتا ہے۔ اسے لیلاوتی سے کراہیت سی ہونے لگی وہ اس بھولی بھالی معصوم سی شکل صورت کی ہندو لڑکی کے لیے اپنے نسلی اوصاف کا خون ہرگز نہ کر سکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب وہ لیلاوتی سے ہرگز نہ ملے گا لیکن اس خیال کے ساتھ ہی ذہن میں دو باتیں ایسی ابھریں جنھوں نے اس ارادے کو شکست دے دی، پہلی بات یہ کہ اس نے لیلاوتی سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور وعدہ خلافی ایک ایک افغان سپاہی کو زیب نہیں دیتی۔ دوسری بات یہ کہ اسے بسواس راؤ نے حکماً منع کیا تھا کہ اب وہ پیپل کے درخت کے نیچے کبھی نہیں جائے گا اور اس نے جواب میں یہ کہا تھا کہ وہ ضرور جائے گا جو روک سکتا ہو روک لے، بالآخر وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ لیلاوتی کے پاس ضرور جائے گا لیکن یہ الگ بات ہے۔ کہ وہ اس سے آئندہ کے لیے کوئی

عہد و پیمان نہ کرے۔

مغرب سے ذرا پہلے ابراہیم گاردی نے اسے طلب کیا اور اسے سختی سے حکم دیا کہ وہ اپنے گھومنے پھرنے کے پروگرام میں تبدیلی پیدا کرے۔ اسے ہر اس جگہ جانے سے گریز کرنا چاہیئے۔ جہاں جانے سے ہندوؤں کی بے عزتی یا تحقیر ہوتی ہو۔ اشاروں میں آسے یہ بات بھی بتا دی گئی کہ ایک ہندو لڑکی سے راہ و رسم بڑھانے سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے۔ کہ وہ پیشوا کی حدودِ سلطنت سے کہیں دور چلا جائے۔ عرفان کو چچا کی یہ باتیں بالکل پسند نہ آئیں اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ چچا کے حکم کے خلاف ایک بار لیلاوتی سے ملے گا ضرور اور اس سے معذرت کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پونا سے چلا جائے گا۔

پوری رات کرب و اضطراب میں گزر گئی۔ پورا جسم ایک ایسی آگ میں جلتا رہا جسے بخار نہیں کہہ سکتے۔ کسی کروٹ چین نہ ملتا۔ بس وہ اس رات چچا گاردی کی باتیں، دیشنوں کی بستی۔ چہرہ پر ہندو نوجوانوں کا تحقیر آمیز سلوک، پیپل کا درخت اس کی جڑ میں مرجھائے ہوئے پھولوں کا خیال، یہی مجموعہ خیال تھا جس میں اذیتیں بھی تھیں اور لذتیں بھی انہی خیالوں میں جب لیلاوتی سرخ ساری میں ملبوس ایک بچے کے پیچھے بھاگتی ہوئی اپنی حویلی سے باہر نمودار ہوئی۔ تو لطف و لذت میں ایک عجیب سرور آمیز اضافہ ہو جاتا، پھر دروازے کی درز سے نظر آنے والی سرخ جھلک تو قیامت ہی ڈھا جاتی، دل تیزی سے دھڑکنے لگتا اور اس میں سے ایک ہوک سی اٹھتی، اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ شاید وہ لیلاوتی کو چاہنے لگا ہے۔ لیکن اسی دل کے کسی گوشے میں ضدی اور اجڈ پٹھان کی عصبیت بیٹھی اسے یہ تنبیہ کر رہی تھی کہ وہ ایک عورت کے معاملے میں مجبور اور بے بس ہرگز نہیں ہو سکتا وہ ایک ہندو لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں ہمدردی ضرور کر سکتا ہے اسی کش مکش اور اضطراب میں فجر کی اذان ہونے لگی،

نماز سے فراغت کے بعد وہ حسب معمول اصطبل میں گیا وہاں سے گھوڑا لیا اور اس کی پشت پر سوار ہو کر روانہ ہونے ہی والا تھا کہ ابراہیم گاردی اس کے گھوڑے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ترش روئی سے دریافت کیا۔ "بھتیجے! کہاں جا رہے ہو؟"

عرفان نے ذرا جھجھک کے جواب دیا۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پیشوا کی حدودِ سلطنت سے کہیں دور چلا جاؤں۔"

ابراہیم گاردی نے پریشان ہو کے پوچھا۔ "کیا اسی وقت؟"

"نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "لیکن شاید آج ہی کسی وقت۔"

"اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

"میں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا، آپ راستہ نہ روکیے۔"

"میں نے بھی پیشوا سے یہ وعدہ کر لیا ہے۔ کہ عرفان اب کبھی اس دیش لڑکی کے کوچے میں نہیں جائے گا۔"

عرفان نے جواب دیا "آپ اپنے وعدے میں جھوٹے نہیں ثابت ہوں گے!"

ابراہیم گاردی راہ سے ہٹ گیا کہنے لگا "ہاں اس کا خیال رکھنا کہ ہم سب پیشوائے پونا کے نمک خوار ہیں ہمیں اپنے کسی عمل سے بھی یہ نہیں ثابت کرنا چاہیئے کہ ہم نمک حرام ہیں۔"

عرفان کو اپنے چچا کی یہ باتیں بہت ناپسند تھیں ان میں اسے قومی اور اسلامی عزت کی موت نظر آتی تھی۔

جب وہ اپنے گھوڑے کو اڑاتا ہوا پیپل کے درخت کے نیچے پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ یہاں سے وہ اس چٹان کی طرف چلا گیا۔ جہاں لیلاوتی سے ملنے کا وعدہ تھا وہ گھوڑے سے نیچے اترا اور اس جگہ جاکر بیٹھ گیا۔ جہاں دو دن پہلے وہ دونوں یکجا ہوئے تھے۔ یہاں اسے ان مرجھائے ہوئے پھولوں کا خیال آیا جنہیں اس نے پیپل کے درخت کی جڑ سے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اس نے انہیں جیب سے نکال لیا۔ ان کی پتیاں بکھر کر جیب ہی میں رہ گئیں، بکھری ہوئی پتیوں کو چٹکی سے نکال کر سونگھنے لگا لیکن پھر فوراً ہی کسی احساس نے اسے سخت کر دیا اور اس نے ان پتیوں کو بے دردی سے ہوا میں منتشر کر دیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد اس شدید احساس پر ایک دوسرے جذبے نے غلبہ کر لیا اور بچوں کی طرح اٹھ کر بکھری ہوئی پتیوں کو پھر چننے لگا، شدت جذبات سے اسکی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے اور دل بھر آیا وہ گردن ٹیڑھی کر کے بے دلی سے راہ گزر کو تکنے لگا۔

جدھر سے لیلاوتی آنے والی تھی، دور بہت دور چند گھڑسوار آتے ہوئے دکھائی دیئے، وہ تیز رفتاری سے بھاگے چلے آرہے تھے۔ اور لمحہ بہ لمحہ قریب آتے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے جسموں کی دھونیاں صاف نظر آنے لگیں، یہ تین سوار تھے اور عرفان کی تیز نظروں نے پہچان لیا کہ ان میں سے ایک بسواس راؤ ہے، یہ تینوں گھڑسوار پیپل کے درخت کے نیچے پہنچ کر رک گئے۔ بسواس نے متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھا پھر جیسے ہی اس کی نظر عرفان کے گھوڑے پر پڑی اس نے اپنے گھوڑے کی باگ اسی طرف موڑ دی اور پھر تینوں آن کی آن میں عرفان کے سر پر پہنچ گئے۔ عرفان چٹان کی آڑ سے باہر نکلا اور نہایت پھرتی سے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو حرکت دی اور ذرا سی دیر میں وہ بسواس راؤ کے مقابل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بسواس راؤ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، اور للکارا۔

"بسواس راؤ! کل تم نے مجھے یہاں آنے سے منع کیا تھا لیکن میں نے تم سے کہا تھا کہ میں ضرور آؤں گا۔ اگر روک سکنا تو روک لینا: چنانچہ میں دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اب کیا کہتے ہو؟"

بسواس راؤ ہنس دیا۔ ایسی ہنسی جس میں طنز و استہزا پایا جاتا تھا۔ "تم ضدی ہو لیکن پھر بھی ہمیں اس کا احساس ہے کہ تم سب ہمارے دربار سے وابستہ ہو۔ پتا جی کہتے تھے۔ ہمیں اپنی پرجا کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

عرفان کو ایک کوڑا سا لگا۔ یہاں تو قدم قدم پر بے عزتی ہو رہی تھی۔ اس کی ضد اور آن بان کو اس برہمن زادے نے کتنی ہوشیاری سے بے عزتی اور ذلت میں بدل دیا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔

عرفان کو لاجواب دیکھ کر بسواس راؤ بہت خوش ہوا۔ بولا۔ خان صاحب! پریشان نہ ہو۔ ان حالات سے ہندو قوم صدیوں سے گزرتی آرہی ہے۔ آج بھگوان نے اگر ہمیں اس لائق کیا ہے کہ تم مسلمان ہماری پرجا کہلاؤ تو تمہیں بھگوان کے اس فیصلے کو ہنسی خوشی فراخ دلی سے قبول کر لینا چاہیئے۔"

عرفان کا غصّے سے چہرہ سرخ ہو گیا دلیری سے جواب دیا۔ "لیکن ہم تمہارے بھگوان کے اس ذلیل فیصلے کو ماننے پر تیار نہیں، میں عنقریب یہاں سے چلا جاؤں گا یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

بسواس راؤ نے ایک اور طنز کا تیر چھوڑا۔ "اور ساتھ لیلاوتی کو بھی لے جاؤ گے؟"

"یہ مہمل اور فضول خیال تمہارے ذہن میں کیونکر پیدا ہوا؟"

بسواس راؤ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "خان صاحب! ہمیں دھوکا نہ دو کیا یہ غلط ہے کہ تم لیلاوتی سے محبت نہیں کرتے۔"

"بالکل غلط میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"

"اس کے یہ معنی ہیں کہ تم ہم سب کے علاوہ خود کو بھی دھوکا دے رہے ہو، اگر تم لیلاوتی سے محبت نہیں کرتے تو اس پیپل کے درخت کے نیچے چکر کیوں لگاتے رہتے ہو؟ پھر وہ کونسا جذبہ تھا جو تمہیں لیلاوتی کے کوچے میں کھینچ کر لے گیا تھا اور اس وقت جو تم یہاں نظر آرہے ہو سچ کہنا۔ میرے لیئے آئے ہو یا لیلاوتی کا انتظار کر رہے ہو؟"

عرفان کی ساری طرّاری جواب دے گئی۔ ممکن ہے وہ جھوٹ بول جاتا لیکن بسواس راؤ کے آخری وار نے اسے بالکل بے بس کر دیا۔ اس نے کہا۔ "خان صاحب! تم مسلمان ہو اور پٹھان بھی، مسلمان جھوٹ نہیں بولتے تمہیں جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ سچ بتانا کیا تمہیں اس وقت لیلاوتی کا انتظار نہیں ہے؟"

عرفان سچ بولنے پر مجبور ہو گیا تھا، ہارے ہوئے سپاہی کی طرح ہتھیار ڈال دیئے کہنے لگا۔ "بسواس راؤ! تم سچ کہتے ہو، ہم مسلمان ہیں اور افغان بھی، ہمیں واقعی جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔" پھر ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ "لیلاوتی پر تمہاری جانب سے جو مصیبت نازل ہونے والی ہے وہ اس میں میری مدد کی طالب ہے، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ آج میں اپنے فیصلے سے اسے آگاہ کروں گا۔"

"کیسا فیصلہ؟" بسواس راؤ نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہی کہ میں اس کی کوئی مدد کر سکوں گا یا نہیں۔"

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"میں ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا کہ اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

بسواس راؤ نے دل میں اتر جانے والی نظروں سے عرفان کو دیکھا اور پوچھا۔ "اگر اس وقت میری جگہ لیلاوتی

ہوتی تو تم اسے کیا جواب دیتے؟"

عرفان نے سادگی سے جواب دیا "میں اس سے کچھ وقت اور لیتا!"

بسواس راؤ پھر ہنس دیا۔ "دو دن بعد تو اسے شیوجی کی خدمت میں حاضری دینا ہی پڑے گی۔ اب تم اطمینان سے سوچتے رہو کہ کیونکہ لیلاوتی اب تم سے کبھی بھی نہ مل سکے گی۔"

عرفان کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ سوالیہ نظروں سے، بے بسی سے بسواس راؤ کو دیکھنے لگا۔

بسواس راؤ نے کہا "لیلاوتی ہندو کنیا ہے تمہیں ہمارے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے!"

عرفان نے درخواست کی "لیکن بسواس راؤ! میں تم سے انسانیت کے نام پر درخواست کرتا ہوں کہ لیلاوتی پر وہ ظلم نہ توڑنا جس کا اس نے خدشہ ظاہر کیا ہے!"

بسواس راؤ نے سنجیدگی سے کہا "انسانیت ہندیت سے اعلیٰ کوئی چیز تو نہیں ہے، ہم وہی کریں گے جس کی ہندو دھرم اجازت دیتا ہے ہمیں تم مسلمانوں کے ایک بڑے جرنیل درانی سے اپنی آخری اور فیصلہ کن جنگ لڑنا ہے، چنانچہ ہم قبل از وقت یہ جان لینا چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گی یا ناکامی؟"

عرفان نے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ شنی وار کی رات کو تنہا لیلاوتی کے پاس واقعی شیوجی آئیں گے اور اسے آنے والے واقعات سے مطلع کریں گے؟"

بسواس راؤ نے اکڑ کر جواب دیا "اس میں ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہے جو اس پر شبہ کرے وہ ظالم اور جھوٹا ہے۔"

عرفان نے کہا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کام کے لئے کسی اور لڑکی کا انتظام کیا جائے۔"

"نہیں"! بسواس راؤ نے جواب دیا "تمہیں لیلاوتی سے بڑی ہمدردی ہے؟"

عرفان نے کہا۔ بات ہمدردی کی نہیں ہے، بسواس راؤ! اگر تم لیلاوتی کو پسند کرتے ہو تو تمہیں کم از کم یہ سوچنا ہی چاہیے کہ تم برہمن ہو اور لیلاوتی دیش، تم اپنی ذات کے اعتبار سے لیلاوتی سے بہت اونچے ہو پھر کیا تمہارا دھرم تمہیں اس بات کی اجازت دے گا کہ تم ایک معمولی اپنے سے کمتر ذات کی لڑکی سے محبت کرو؟"

بسواس راؤ نے پوری خود اعتمادی سے جواب دیا "تم ہندو جاتی کے رسم و رواج اور قوانین سے مجھ سے زیادہ تو نہیں واقف ہو میں اگر چاہوں تو اس سے الونوم وواہ کر سکتا ہوں۔"

"یہ الونوم وواہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

بسواس راؤ نے جواب دیا "جب کوئی اونچی جاتی کا لڑکا اپنے کمتر جاتی کی لڑکی سے وواہ کرنا چاہتا ہے۔ تو ایسے وواہ کو الونوم وواہ کہتے ہیں۔"

عرفان نے سوچا کہ لیلاوتی کے معاملے میں بسواس راؤ سے اُلجھنا بیکار ہے یہاں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، اس نے سوچا لیلاوتی سے دستبردار ہونا ہی پڑے گا۔ اس کا خیال فضول ہے بآواز بلند بولا "اچھا میرے دوست بسواس راؤ! مجھے معاف کردو مجھے احساس ہے کہ میں واقعی غلطی پر تھا۔ اب تم مجھے کسی ایسی جگہ نہیں پاؤ گے جو تمہارے لیے قابل اعتراض ہو، اور ہو سکتا ہے کہ میں عنقریب تم سب سے جدا ہو جاؤں۔"

بسواس راؤ نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا "نہیں خان صاحب! تم سب کے درمیان رہو، ہم تمہاری بے حد عزت کریں گے، ہمیں تمہاری شجاعت پر ناز ہے اور ہم سب کی یہ دلی خواہش ہے کہ احمد شاہ درانی کے مقابلے پر تم لوگ اپنی خاندانی شجاعت کا مظاہرہ کرو، یہ ہمارا وعدہ ہے کہ اگر ہم تمہاری مدد سے درانی سپاہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں ہندو راجہ میں اعلیٰ منصب حاصل ہوں گے۔"

عرفان نے اپنے دلی ارادوں کو ظاہر نہیں کیا۔ جواب دیا "بسواس راؤ! ہم دونوں صدیوں سے اس طرح ایک ساتھ رہتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلمان کی دیوار کا سایہ ہندو کے صحن میں پڑتا ہے تو ہندو کی دیوار کا سایہ مسلمان کے صحن میں، لیکن اس قربت اور یگانگت کے باوجود دلوں کا بُعد برابر بڑھتا جا رہا ہے!"

بسواس راؤ نے پوچھا "ایسا کیوں ہے اور کس کی طرف سے ہے؟"

عرفان نے افسردگی سے جواب دیا "تم ہندوؤں کی طرف سے۔"

بسواس راؤ تلملا گیا تڑپ کر بولا "یہ تم مسلمانوں کی طرف سے ہم ہندوؤں پر بہتان ہے، تہمت ہے، الزام ہے۔"

عرفان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا "یہ بہتان یا الزام نہیں ایک تلخ حقیقت ہے، ہم مسلمان تمہاری طرف دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تم سے سودا سلف خریدتے ہیں تمہارے پکوان بشوق کھاتے ہیں لیکن تم ہماری اس فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی کا یہ جواب دیتے ہو کہ اگر تمہارے کھانے پینے کی چیز پر ہم مسلمانوں کا سایہ بھی پڑ جائے تو وہ چیز ناپاک ہو جاتی ہے۔"

بسواس راؤ کے ایک ساتھی نے ترش لہجے میں کہا "تم مسلمان کچھ جھوٹے ہوتے ہو!"

بسواس راؤ نے اسے ڈانٹا "یہ موقع ان باتوں کا نہیں ہے تم چپ رہو!" پھر عرفان سے مخاطب ہوا "خان صاحب! اس مورکھ کی بات کا کوئی خیال نہ کرنا، ویسے ہم ہندو اس بات کی کوشش کر رہے ہیں، کہ تم مسلمانوں جیسی فراخ دلی خود میں پیدا کریں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں ہندوستان کی حکومت حاصل ہو، جب ہم دہلی کے تاج و تخت سے مغل بادشاہ کو محروم کر دیں گے اور پورا ہندوستان ہمارے زیر نگیں ہو گا اس وقت ہم بذریعہ قانون اور بذریعہ طاقت اپنی ہندو جاتی میں فراخ دلی اور اعلیٰ ظرفی پیدا کر دیں گے۔ اور ساری چھوت چھات جو اس وقت نظر آتی ہے دور کر دیں گے!"

عرفان کو بسواس راؤ کی کسی بات کا یقین نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک اس قوم کے فرد کا وعدہ ہے جو صدیوں سے غلام اور محکوم چلی آرہی ہے۔ اور جس کی طینت اور فطرت میں کمزور، غلام اور ایک محکوم کی ریاکاری اور سازشی عادت رچ بس گئی ہے۔ جس کا وعدہ کسی آزاد اور بہادر قوم کا وعدہ نہیں، جس کا عہد ایک محکوم فطرت انسان کا عہد ہے۔

بسواس راؤ نے کہا "ہم یہاں کھڑے کھڑے کہاں تک باتیں کریں گے، تم ہمارے پتاجی کے پاس آؤ۔ وہ تمہیں اچھی طرح مطمئن کر دیں گے"

عرفان نے کوئی جواب نہ دیا۔

بسواس راؤ نے اچانک اپنے گھوڑے کی باگ موڑ دی، اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی اس کی اتباع کی، بسواس راؤ لگام کو کھینچ کر ڈھیل دیتا ہوا بولا "اچھا خان صاحب! چلتا ہوں، اور ہاں چلتے چلتے ایک بار پھر یہ بتائے جاتا ہوں کہ لیلاوتی اب یہاں کبھی بھی نہ آئے گی تم اس کا انتظار نہ کرنا"

اس کے بعد جس طرح اور جدھر سے وہ آیا تھا۔ اسی طرح، اسی طرف واپس چلا گیا۔

عرفان افسردہ دل شکستہ آہستہ آہستہ گھوڑے کو چلاتا ہوا جب واپس ہوا تو مندروں کے پجاری اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے، اس کا دل اب بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ لیلاوتی نہیں آئے گی۔ کوئی دل میں بیٹھا برابر یہ ڈھارس بندھا رہا تھا کہ لیلاوتی ضرور آئے گی۔ اس نے وعدہ کیا ہے، وہ اپنا وعدہ پورا کرے گی۔ بسواس راؤ نے یقیناً اس سے دھوکا کیا ہے اس سے جھوٹ بولا ہے۔ اس کے دل کو پھر ذرا تقویت ملی لیکن اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر لیلاوتی واقعی آگئی تو وہ اس سے بات کیا کرے گا۔ ذراسی دیر کے لیے یہ بات جی میں آئی کہ وہ اس سے کہے گا "لیلاوتی تم میرے ساتھ بھاگ چلنے کو تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لے چلوں گا۔ تم کوئی فکر نہ کرو" لیکن ایسا کرنے میں اس کی عزت آبرو پر پانی ضرور پھر جائے گا، بڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو پتا چلا کہ وہ دیشیوں کی بستی میں داخل ہو چکا ہے۔ اور اس کا گھوڑا لیلاوتی کی حویلی کی طرف خود بخود بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور بہ عجلت واپس ہو لیا۔

ایک دن اور گزر گیا۔ دل کی خلش دور ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ایک آرزو ایک تمنا سرمایۂ حیات بن چکی تھی۔ کسی طرح صرف ایک بار اور لیلاوتی سے ملاقات ہو جاتی تو دل کا بوجھ اتر جاتا۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے اس کے بعد کسی وقت وہ اس پہاڑی چٹان کے پیچھے پہنچی ہو اور عرفان کو نہ پا کر مایوس واپس گئی ہو، اس خیال کے بعد اس نے اس چٹان کے کئی چکر لگائے لیکن سارے چکر بے سود رہے، ہاں بیل کی جڑ میں تازے پھولوں کی موجودگی یہ ضرور بتاتی تھی کہ وہاں کوئی آیا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا اور وہ خود پر خوب لعنت ملامت کرتا رہا کہ

وہ بسواس راؤ کی باتوں میں آکر خواہ مخواہ بے وقوف بن گیا ورنہ لیلاوتی وہاں ضرور پہنچی تھی۔ دوسرے دن شنی وار تھا اس نے سوچا کچھ بھی ہو وہ علی الصبح یہاں ایک چکر ضرور لگائے گا اسے یقین تھا کہ اس چکر میں اس کی لیلاوتی سے ضرور ملاقات ہو جائے گی۔

شنی وار کی صبح جب وہ پیپل کے درخت کے نیچے پہنچا تو وہاں ایک بوڑھا درخت کی جڑ میں پانی انڈیل رہا تھا اور اس کے بعد انگلیوں سے پھول بکھیرنے لگا۔ عرفان دور سے یہ تماشا دیکھتا رہا اس کے دل پر اوس پڑ گئی کیونکہ وہ سمجھ گیا کہ ایک دن پہلے پیپل کی جڑ میں جو پھول اس نے دیکھے تھے وہ بھی اسی بوڑھے کے ڈالے ہوئے ہوں گے۔

بوڑھا جب جل اور پھول چڑھا کر واپس ہوا تو اس کی نظر عرفان پر پڑ گئی اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو بھینچ کر عرفان کو بغور دیکھا اور ہاتھ سے رکے رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا عرفان کے پاس پہنچا اور اس نے پوچھا "کس کی تلاش میں آئے ہو نوجوان؟"

عرفان سٹپٹا گیا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بوڑھے نے کہا "تم گھبراؤ نہیں، میں کل بھی تمہاری تلاش میں آیا تھا۔ لیکن کل شاید تم ادھر نہیں آئے تھے!"

عرفان کی سمجھ میں اب بھی یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ بوڑھا کون ہے۔ اور کہنا کیا چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، معلوم نہیں آپ مجھے کیا سمجھ کر ایسی باتیں کر رہے ہیں؟"

بوڑھا تکلیف دہ انداز میں ہنسا "کیا تم لیلاوتی کے لیے یہاں کے چکر نہیں لگا رہے ہو؟"

"بڑے میاں ایسی کوئی بات نہیں، معلوم نہیں آپ کون ہیں اور مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟"

بوڑھے نے بالکل اس کے قریب پہنچ کر نہایت غور سے اسے دیکھا اور کہا۔ "میں لیلاوتی کا چاچا گرودیال ہوں، لیلاوتی نے مجھ سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ بیٹے! بسواس راؤ لیلاوتی کے ساتھ جیسا ظلم ڈھانے والا ہے۔ اس سے بچنے کی راہ کوئی نظر نہیں آتی، مثل مشہور ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بدحواسی اور مایوسی میں لیلاوتی کو جب تم نظر آئے تو وہ معلوم نہیں کیوں تم سے یہ آس لگا بیٹھی کہ اس مصیبت میں تم اس کا ساتھ دے سکتے ہو اس نے اس سلسلے میں شاید تم سے کوئی بات بھی کی تھی۔ اور معلوم نہیں تم نے اسے کیا جواب دیا۔"

بوڑھے کی باتوں سے اپنائیت کی بو آ رہی تھی۔ عرفان کو ایک گونا خوشی محسوس ہوئی کہ بوڑھا اس کو اپنا ہمدرد سمجھ رہا تھا عرفان نے جواب دیا "ہاں بات تو ہوئی تھی لیلاوتی سے، لیکن میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ میں اس کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔"

گرودیال نے راہ گزر پر ایک نظر ڈالی اور بولا "باتیں کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ کسی

ایسی جگہ چلو جہاں لوگوں کی آمد و رفت کم ہو اور ہم بلا خوف و خطر اطمینان سے دل کی باتیں کر سکیں۔"

عرفان نے راہ گزر سے ہٹ کر دائیں جانب دور کی ایک چھوٹی سی پہاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں وہاں جاتا ہوں، وہاں ایک برساتی نالہ ہے جو آج کل خشک پڑا ہے۔ اس میں اتر کے اطمینان سے باتیں ہو جائیں گی۔ میں وہیں پہنچتا ہوں، میرے پیچھے ہی آپ بھی آ جائیں۔"

بوڑھے گردیال نے خاموشی سے اُدھر دیکھا اور نظروں سے اس تجویز کی تائید کر دی، عرفان دم کے دم میں وہیں پہنچ گیا۔ گھوڑے کو چرنے کے لیے ایک طرف چھوڑ دیا۔ اور گھاس پر بیٹھ کر گردیال کا انتظار کرنے لگا

کچھ دیر بعد گردیال بھی وہیں پہنچ گیا پھر وہ دونوں خشک نالے میں اتر گئے۔

نیچے اترتے ہی گردیال بولا "ہاں اب بتاؤ کہ تم لیلاوتی کی کس طرح مدد کر سکتے ہو؟"

عرفان نے جواب دیا "میں پہلے ہی آپ سے یہ عرض کر چکا ہوں کہ لیلاوتی کے معاملے میں میرا ذہن صاف نہیں ہے، آپ خود ہی کوئی مشورہ دیں کہ میں کس طرح لیلاوتی کی مدد کر سکتا ہوں۔"

بوڑھا آنکھیں مچمچاتا ہوا بولا "ایک ترکیب ہے بشرطیکہ تم اس پر عمل کرو۔"

عرفان نے پوچھا "وہ کیا؟"

بوڑھے نے جواب دیا "افغان سردار ابراہیم گاردی سے تو تم اچھی طرح واقف ہو گے؟"

"وہ میرے چچا ہیں، میں ان کا بھتیجا ہوں۔"

گردیال کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ یہ تو بہت اچھا ہے۔ تم یقیناً میرے اور لیلاوتی کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہو بشرطیکہ تم اس کا ارادہ کر لو۔"

"فرمائیں تو سہی کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

تم اپنے چچا گاردی کو اس پر آمادہ کر لو کہ وہ پیشوا سے ملیں اور اس سے لیلاوتی کے سلسلے میں بات کریں، پیشوا سے کہیں کہ وہ لیلاوتی کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کو اس کام کے لیے منتخب کر لیں، میرا خیال ہے اس وقت پیشوا کی نظروں میں گاردی سے زیادہ صاحب توقیر اور باعزت دوسرا کوئی سردار نہیں۔"

لیکن خود عرفان کو اس ترکیب کو عملی جامہ پہنانے میں سخت تامل تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر غلطی سے بھی گاردی نے یہ یقین کر لیا کہ میں لیلاوتی کی راغب ہوں تو وہ یہ کام کسی قیمت پر بھی انجام نہ دے گا۔

گردیال نے فکرمند لہجے میں پوچھا "سوچ کیا رہے ہو؟"

عرفان نے جواب دیا "چچا گاردی یہ سفارش قطعی نہ کریں گے!"

گردیال نے کہا "تم کہہ کے تو دیکھو!"

عرفان نے کہا "اس سے ہٹ کے کوئی ترکیب؟"

گردیال نے بے دلی سے جواب دیا "اس کے علاوہ دوسری ترکیب یہ ہے کہ میں لیلاوتی کو تمہارے حوالے کردوں اور تم اسے لے کر دہلی کی طرف فرار ہو جاؤ۔"

عرفان پریشان ہو گیا "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

گردیال نے تلخی سے جواب دیا "یہ ہر طرح ممکن ہے، ضروریات زندگی کا ضروری سامان لو۔ کچھ نقدی سنبھالو، تیز رفتار گھوڑے پر آگے لیلاوتی کو بٹھاؤ اس کے پیچھے خود بیٹھ جاؤ اور پھر اس طرح گھوڑے کو دہلی کی طرف سرپٹ دوڑا دو جس طرح پرتھوی راج سنجوگتا کو لے کر فرار ہوا تھا۔"

عرفان نے سوچا یہ بوڑھا کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہے ذرا سی دیر کے لیے اس کا دل طمع کا شکار ہو گیا اور دل نے کہا کہ بوڑھے کی اس پیش کش کو فوراً قبول کر لینا چاہیئے۔ اس نے آہستہ سے کہا آپ کی تجویز پر تھوڑی دیر غور کرنا چاہتا ہوں، کہ آخر یہ کس حد تک ممکن العمل ہے اور اس میں میری ذات کے حق میں کتنے فائدے اور کتنے نقصان ہیں!"

بوڑھے نے طنزیہ کہا "صاحب زادے! اس ترکیب میں فائدے ہی فائدے ہیں۔ نقصان کا دور دور کوئی نشان تک نہیں، جگوان کا نام لیکر ہمت کر ڈالو۔"

عرفان جھنجھلا گیا "میں تیار ہوں!"

"میں تیار ہوں!" بوڑھے نے طنزیہ اس کا فقرہ دہرایا "تم مسلمان ہو تمہیں ایسی بات سوچنی تک نہ چاہیے اب میرے دل کی بات بھی سن لو، میں اپنے ہاتھوں سے لیلاوتی کا گلا تو گھونٹ سکتا ہوں لیکن ایک مسلمان کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہیں دے سکتا۔"

امید اور خوش آئندگی کے سارے محل ڈھ گئے خوش فہمیوں کے قصر مسمار ہو گئے۔ گردیال نے اس کی سخت بے عزتی کر دی تھی، بوڑھے نے ایک پلٹا اور کھایا، کہنے لگا "ہاں ایک صورت ہے، تم میرے ساتھ لیلاوتی کے پاس چلو، اور اس سے خود ہی باتیں کر لو۔ وہ جیسا کہے گی، میں اسے منظور کر لوں گا۔"

عرفان کے جی میں آئی کہ وہ انکار کر دے کہ اب وہ اس معاملے میں نہیں پڑے گا۔ لیکن لیلاوتی سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے کے لالچ نے اس کی زبان کو تالا لگا دیا۔ اس نے پژمردگی سے پوچھا "لیکن آپ کی حویلی تک میرا جانا آپ کی ہندو جاتی کو ناگوار نہ گزرے گا کیا؟"

گردیال نے فوراً جواب دیا "نہیں میں تمہیں وہاں نہیں لے جاؤں گا۔ میں نے لیلاوتی کو ایک دوسری جگہ پہنچا دیا ہے۔ جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے، تم یہیں موجود رہو میں اسے لے کر یہیں آ رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں اس پر ضرور آمادہ کرے گی کہ تم لیلاوتی کی خاطر اپنے چچا کا روی سے بات کرو اور وہ پیشوا سے بات کر کے لیلاوتی کا اس مصیبت سے پیچھا چھڑا دیں۔"

عرفان نے کہا "بہتر ہے۔ میں یہاں آپ دونوں کا منتظر رہوں گا۔"

گردیال نالے سے باہر نکلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ایک طرف چلا گیا۔

عرفان بھی باہر آگیا، یہاں آس پاس دور تک خودرو جنگلی پودوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اس نے جنگلی گلاب کے کئی پھول توڑ کر جیب میں رکھ لئے اور سوچا کہ اگر موقع ملا تو وہ یہ پھول چوری سے لیلادتی کی نذر کرے گا۔ اسے بوڑھے گردیال کی باتوں پر غصہ بھی آرہا تھا کہ اس نے کتنی بے ہودگی سے اسے ذلیل کیا تھا اس نے سوچا کہ بوڑھے کے اس رویے کی وہ لیلادتی سے شکایت ضرور کرے گا۔ اور اس کے ردعمل پر غور کرے گا۔

کافی انتظار کے بعد دور پگڈنڈی پر گردیال اور لیلادتی آتے نظر آئے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیلادتی آج بھی سرخ ساری پہنے ہوئے تھی، وہ بے چینی سے سبزے پر لیٹ گیا۔ جب وہ دونوں قریب آگئے تو بوڑھا گردیال چکر مکرا دھر اُدھر دیکھنے لگا۔ عرفان سمجھ گیا کہ لیٹے ہونے کی وجہ سے وہ دونوں اسے دیکھ نہیں سکے ہیں، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گردیال اس کی طرف بڑھتا ہوا ہنس کر بولا "واہ میاں جی مسخری کرتے ہو، میں تو ڈر گیا خفا کہ کہیں تم چلے تو نہیں گئے!" اس کے بعد لیلادتی سے بولا "بیٹی لیلادتی! میں یہیں اوپر کھڑا رہوں گا۔ تم ان میاں جی کے ساتھ نالے میں اُتر جاؤ اور انہیں کسی طرح ابراہیم گاردی والی ترکیب پر راضی کرلو۔"

لیلادتی آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور دونوں ہاتھوں کو ملا کر ماتھے پر رکھ کر پرنام کیا وہ دونوں جب نالے میں اتر گئے تو ان کے سروں پر گردیال سائے کی طرح کھڑا ہوگیا۔ ان دونوں کو گردیال کی گردن صاف نظر آرہی تھی۔

عرفان نے کہا "لیلادتی! تم آئیں نہیں، میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔"

لیلادتی نے لجا کر جواب دیا "کیسے آتی، بسواس راؤ نے پہرے جو بٹھوا دیئے تھے۔"

"پھر آج کس طرح آگئیں؟"

لیلادتی نے جواب دیا "دو تین دنوں میں بسواس راؤ کو یہ یقین ہوگیا کہ اب میں کہیں نہ جاؤں گی، آج میں ماسی سے ملنے سامنے کی بستی میں آگئی تھی کہ چاچا جی مجھے تمہارے پاس لے آئے۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟" عرفان نے سرگوشی میں پوچھا۔

"میں کیا بتا سکتی ہوں، تم نے کیا سوچا؟"

"میری تو کچھ سمجھ میں آنہیں رہا، تم جیسا کہو کرنے کو تیار ہوں۔"

"چاچا جی یہ کہتے ہیں کہ تم افغان سردار گاردی کے بھتیجے ہو اور وہ راستے بھر مجھے یہ پڑھاتے لائے ہیں کہ میں تمہیں پیشوا کی خدمت میں تمہارے چاچا کی سفارش پر آمادہ کرلوں۔"

"اس میں خرابیاں ہیں"۔ عرفان کہنے لگا "ایک تو یہ کہ چچا گاردی اس سفارش سے یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ ہم

دونوں کے آپس میں ضرور کچھ تعلقات ہیں اور وہ یہ بات قطعی برداشت نہ کریں گے اور سفارش سے صاف صاف انکار کر دیں گے اور اس میں دوسری برائی یہ ہے کہ چچا جان سفارش کے سرے سے قائل ہی نہیں ہیں۔"

لیلا وتی فکرمند ہو گئی، آرزو گی سے بولی۔ تب پھر بات ہی ختم ہو گئی۔ مجھے آج رات شیو جی کی خدمت میں چلا جانے دو۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

عرفان نے اداس ہو کر پوچھا "کیا سفارش کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی؟"

لیلا وتی نے چڑ کر جواب دیا۔ اس کے علاوہ وہی ترکیب ہے جس پر پرتھوی راج نے سنجوگتا کے سلسلے میں عمل کیا تھا۔

بات اتنی جلدی ختم ہو جائے گی عرفان کو اس کا اندازہ تک نہ تھا۔ اس نے ایک نظر نالے کے باہر گردیال پر ڈالی، اس کی گردن کی پشت صاف نظر آ رہی تھی۔ عرفان نے جیب سے جنگلی گلاب کے پھول نکالے اور نہایت عاجزی سے لیلا وتی کی طرف بڑھا دیئے، آہستہ سے بولا "انہیں تو قبول کر لو، میں چچا سے بات کر دوں گا اور پُر زور انداز میں کر دوں گا۔"

لیلا وتی نے ذرا سے تامل کے بعد پہلے چاچا جی کو دیکھا اس کے بعد پھول لے کر ساری کے نیچے چھپائے رقت زدہ لہجے میں بولی "اگر تم ہندو ہوتے تو میں تمہیں کو پسند کرتی، خواہ تم چاروں برنوں میں سے کسی بھی برن سے تعلق رکھتے یہاں تک کہ اگر تم شودر ہوتے تب بھی میں تمہی کو پسند کرتی۔

"اور اب؟" عرفان نے ہمت کر کے پوچھا۔

"افسوس کہ تم مسلمان ہو، میں تمہیں کس طرح پسند کر سکتی ہوں۔"

عرفان نے غصے سے کہا "اگر میں شودر ہوتا تب بھی تم مجھے پسند کرتیں لیکن میں مسلمان ہوں جو شاید شودر سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے۔ اور اسی لیے تم مجھے پسند نہیں کر سکتیں!"

لیلا وتی چپ ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگی، عرفان نے المیہ لہجے میں کہا "یہ عجیب سی بات ہے کہ میں مرہٹوں کی سرزمین میں روزانہ ہی ذلتوں اور بے عزتی سے دوچار ہوتا رہا ہوں اور میں نے تنگ آ کے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ مرہٹواڑے کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا لیکن لیلا وتی یہ بھی حقیقت ہے کہ جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے میرے سارے ارادے متزلزل ہوتے جا رہے ہیں اور آج بھی میں اس شرمناک حالت میں چوروں کی طرح یہاں جو موجود ہوں تو اس میں بھی تمہاری ہی ذات سے وارفتگی شامل ہے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہنے لگا۔ "ایک پٹھان کو عورت کے لیے آنسو نہیں بہانا چاہئیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب دل پر چوٹ لگتی ہے تو آنکھیں نم ہو ہی جاتی ہیں۔"

لیلا وتی اس کی باتیں بغور سنتی رہی عرفان کی باتوں سے وہ بھی متاثر ہو رہی تھی، اس نے اپنا داہنا ہاتھ

عرفان کی طرف بڑھایا۔ اس میں ایک چھوٹا سا رومال تھا۔ سرخ رومال جس کے ایک کونے میں انگوٹھی بندھی ہوئی تھی۔ "لو اسے رکھ لو۔ وہ کہنے لگی "یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تم شدھی ہو گئے تو میں تمہارے ساتھ فرار ہو جانے تک پر آمادہ رہوں گی۔"

عرفان نے نفرت سے ہاتھ کھینچ لیا "یہ کس طرح ہو سکتا ہے"۔ وہ کرب سے بولا "ایک خدا کو ماننے والا سینکڑوں بتوں کی پرستش کس طرح کر سکتا ہے۔"

اوپر سے آواز آئی "بیٹی لیلاوتی! کیا دیر ہے؟"

لیلاوتی نے اپنا رومال جبراً اس کی جیب میں ڈال دیا "اسے نشانی کے طور پر رکھ لو، چاچا جی بلا رہے ہیں!"

عرفان نے مزاحمت نہ کی۔ بولا۔ اچھا لیلاوتی! اب تم جا سکتی ہو، میں کوشش کروں گا کہ تمہیں شیوجی کی خدمت میں جانے سے روک لوں، لیکن اگر میں ناکام رہوں تو تم مجھے معاف کر دینا" پھر ذرا دیر تک اس کے حسین و ملیح چہرے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا اور بولا "یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں کی یہ آخری ملاقات ہو!"

"کیوں؟ کہاں چلے جاؤ گے؟"

عرفان نے جواب دیا "میں اپنے اصل وطن کی طرف واپس چلا جاؤں گا۔ اگر تم مرہٹہ افواج کے ساتھ دہلی آئیں تو وہاں مجھے احمد شاہ درانی کی افواج میں مرہٹوں کے مقابل صف آرا پاؤ گی۔"

اوپر سے پھر آواز آئی۔ اب آجاؤ لیلاوتی، دیر ہو رہی ہے!"

لیلاوتی باحسرت و یاس باہر نکلی اور جاتے جاتے اس نے عرفان کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "میں فیصلہ بدل سکتی ہوں، میں تمہاری ہوں تم بے فکر رہو اسی لیے تو رومال اور انگوٹھی کی نشانی دی ہے تمہیں۔"

راستے میں گردیال نے پوچھا "لیلاوتی! کیا کہا اس افغان نوجوان نے؟"

لیلاوتی نے جواب دیا "اس نے وعدہ کیا ہے کہ اپنے چاچا کو پیشوا کی خدمت میں سفارش پر مجبور کر دے گا۔"

گردیال زور زور سے ہنسنے لگا۔ بولا "مسلمان ہے نا، ناری مسلمان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، مجھے پہلے ہی یہ معلوم تھا کہ جو کام بڑے سے بڑا آدمی کسی مسلمان سے نہیں کرا سکتا ایک عورت چشم زدن میں کرا سکتی ہے۔"

لیلاوتی نے بددلی سے ہاں میں ہاں ملائی "ہاں چاچا لیکن یہ مسلمان کسی اور ہی قسم کا معلوم ہوتا ہے!" اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو اس کی آنکھوں کے سامنے اس غیرت مند نوجوان کی شکل تھی جو شدھی کا لفظ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا تھا اور پھر یہی شکل مرہٹہ افواج کے سامنے صف آرا نظر آئی۔

عرفان کا یہ آخری فیصلہ تھا کہ وہ چچا ابراہیم گاردی سے لیلاوتی کے سلسلے میں بات کرے گا۔ اگر چچا نے یہ بات مان لی تو خیر ورنہ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پونا چھوڑ دے گا۔

جب وہ دل شکستہ اور اداس اداس گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ چچا پیشوا کے چچازاد بھائی سداشیو بھاؤ سے کچھ ضروری باتیں کر رہا ہے۔ اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ گفتگو بہت دیر تک جاری رہی یہاں تک کہ جب گفتگو ختم ہوئی تو۔ ابراہیم گاردی سداشیو بھاؤ کے ساتھ ہی کہیں چلا گیا۔ ان حالات میں وہ لیلاوتی کے لیے کوئی بات کس طرح کر سکتا تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ سخت کرب اور اضطراب میں گزر رہا تھا۔ اس طرح شام ہو گئی۔ اور ابراہیم گاردی واپس نہ آیا۔ مغرب کے بعد پیشوا کا ایک آدمی آیا اور عرفان کے باپ فتح خان گاردی اور عرفان کو بھی بلا لے گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی مجلس مشورت منعقد ہے۔ جس میں صلاح مشورے سے مستقبل کے بہت سے فیصلے کرنے ہیں۔ عرفان کے جی میں آئی کہ جانے سے انکار کر دے لیکن یہ سوچ کر ایسا کرنے سے باز رہا کہ ممکن ہے وہاں کوئی موقع مل جائے اور وہ لیلاوتی کی سفارش کر سکے وہ اپنے باپ کے ساتھ جب پیشوا کے دربار میں پہنچا تو وہ معزز مرہٹہ اُمرا اور سرداروں سے بھرا ہوا تھا۔ بالاجی راؤ پیشوا ایک اونچی سی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے برابر اس کی رانی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بائیں ہاتھ پر خوبصورت بسواس راؤ براجمان تھا۔ پیشوا سے ایک گز دور اس کا چچازاد بھائی اور مرہٹہ افواج کا سپہ سالار اعلیٰ سداشیو بھاؤ کھڑا تھا۔ سداشیو بھاؤ کے برابر ابراہیم خان گاردی کو جگہ دی گئی تھی۔ فتح خان گاردی اور عرفان کو ان دونوں سے ذرا ہٹ کر پیچھے جگہ دی گئی۔ پیشوا کے بالکل قریب مالوے کا ملہر راؤ بیٹھا تھا۔

پیشوا نے کچھ توقف کے بعد حاضرین دربار پر پُروقار نظر ڈالی اور کارروائی کے آغاز کا حکم دیا۔

سب سے پہلے سداشیو بھاؤ نے اپنی زبان کھولی "معزز مہارانی، پیشوائے پونا و حاضرین دربار! آج ہم سب یہاں کچھ ایسے فیصلوں کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ جو ہندوستان کے مستقبل پر شاندار طور پر اثر انداز ہوں گے۔" اس کے بعد ایک لمحہ توقف کیا، پھر جوش میں بولا "ہم نے اس کماری سے لے کر دریائے اٹک تک اپنے ہندو دھرم اور رام راج کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ لیکن ابھی تک دہلی کے لال قلعے میں مغل بادشاہ شطرنج کے شاہ کی طرح تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اسے اٹھا کر جمنا جی میں پھینک دیں۔ اور پورے ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیں۔"

پیشوا نے کہا "ہم نے کچھ اس سے بھی زیادہ سوچا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو افغانستان سے وقتاً فوقتاً مدد ملتی رہتی ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم ایک شاندار لشکر جرار تیار کریں اور اسے لے کر افغانستان کے ان ٹھکانوں کو تہس نہس کر دیں۔ جہاں سے ہندوستانی مسلمانوں کو مدد ملتی رہتی ہے۔ اس کے بعد بلاشبہ پورے بھارت ورش پر رام راج کا جھنڈا لہرائے گا

اور ہم اپنی سرزمین سے اسلام اور مسلمانوں کا ایک ایک نقش مٹا دیں گے۔"

حاضرین دربار کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔ سداشیو بھاؤ نے اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ "بیشک ہمارے دل محمود غزنوی کے لگائے ہوئے زخموں سے ابھی تک دکھ رہے ہیں۔ جب ہم افغانستان کو تباہ کر چکیں گے تو محمود غزنوی کی قبر سے اس کی لاش نکال کر اس کے دانت توڑ دیں گے اور لاش کو جلا کر اس کی راکھ کو ہوا میں بکھیر دیں گے۔ اس کے بعد سومنات کی مقدس مورتی کو دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر نصب کر دیں گے۔"

سداشیو بھاؤ کے آخری فقروں نے ابراہیم گاردی کے چہرے کو غصے سے سرخ کر دیا۔ لیکن وہ خاموش رہا، بولا نہیں۔

رانی ابھی تک خاموش تھی۔ اسے شبہ گزرا کہ فوج کے سارے اختیارات سداشیو بھاؤ کے ہاتھ میں ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ فتحمندی اور طاقت کے نشے میں پورے ہندوستان کا حکمران بن جائے اس نے اس خطرے کا سدباب کرنا چاہا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور پرجوش لہجے میں بولی "سداشیو بھاؤ کے ساتھ بسواس راؤ بھی دہلی جائے گا۔ وہاں جیسے ہی مغل بادشاہ کو تخت سے اتارا جائے۔ سداشیو بھاؤ اس کی جگہ بسواس راؤ کو تخت نشین کر دے گا۔ تاکہ یہ بھارت ورش کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور خود سداشیو بھاؤ پنجاب کو روندتا کچلتا افغانستان میں گھس جائے اور وہاں ان تمام مرکزوں کو تباہ و برباد کر دے جہاں سے ہندوستانی مسلمان طاقت و توانائی حاصل کرتے ہیں۔"

عرفان اور بسواس راؤ کی نظریں ٹکرائیں۔ بسواس راؤ ہندوستان کی حکمرانی کے خیال سے شاداں و فرحاں تھا اور اس کا انگ انگ، خوشی میں پھڑک رہا تھا۔

مالوے کے ملہر راؤ نے کہا "ہمیں سردست زیادہ خوش فہمیوں کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ احمد شاہ درانی کے افغان سپاہی عیش و عشرت کے خوگر، ہمت چور مغلوں سے بالکل مختلف ہیں، ان کے ساتھ جنگ کرنے میں ہمیں اپنی شجاعت اور تعداد پر ہی بھروسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اعلیٰ درجے کی فراست اور سیاست کو بھی کام میں لانا پڑے گا۔ ہمیں کوشش اور تدابیر سے ہندوستان کی مسلم ریاستوں کا بھی تعاون حاصل کرنا چاہئے۔ اودھ کا شجاع الدولہ ضرور ہمارا ساتھ دے گا۔"

سداشیو بھاؤ نے طاقت کے گھمنڈ میں حقارت سے ملہر راؤ کی تجویز رد کر دی "تم بکریاں چرانے والے کیا جانو کہ میدان جنگ میں تعداد اور شجاعت ہی فیصلہ کن معرکے کے لیے کافی ہوتی ہے۔"

ملہر راؤ نے پیشوا کی بڑی خدمت کی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ ایک غریب گھرانے کا تھا اور بچپن میں بکریاں چرایا کرتا تھا لیکن اب اسے جو کچھ حاصل تھا وہ اس کی دانشمندی اور سپاہ گری کے طفیل تھا۔

سدا شیو بھاؤ کی تحقیر آمیز باتوں نے اس کا دل توڑ دیا۔ وہ چپ ہو رہا۔

سب کے آخر میں ابراہیم خان گاردی نے زبان کھولی۔ اس نے اپنی بات کا آغاز آہستہ سے کیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے بات بڑھتی گئی اس کا لہجہ پرجوش اور آواز بلند ہوتی گئی۔ اس نے کہا "معزز پیشوا اور عزت دار سردارو! میں نے تمہاری تجویزیں سن لیں، ٹھیک ہے اگر تم لوگ میرے وطن افغانستان کو روند ڈالنے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ بخدا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جب تم کابل اور غزنی پر یلغار کر رہے ہو گے تو ان میں پیش پیش میں اور میرے ساتھی ہوں گے۔ یہاں تک کہ ہماری توپیں دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گی۔ میں اپنے وطن افغانستان میں بھی آپ کا وفادار رہوں گا۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے چنانچہ میں ہر جگہ اپنی نمک حلالی کا مظاہرہ کروں گا لیکن" یکایک اس کی آواز بھرا گئی۔ اور آواز بہت اونچی ہو گئی پیشوا کا دربار اس کی آواز سے گونج اٹھا۔ "لیکن اگر آپ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ تسخیر ہند اور سقوط دہلی کے بعد جامع مسجد کی بے حرمتی کریں اور اس کے منبر پر سومنات کی مورتی سجائیں تو میں آپ سب کو قبل از وقت مطلع کر رہا ہوں کہ ہم سب اس حرمت پر اپنی جانیں دے دیں گے۔ اور جامع مسجد کے منبر پر سومنات کی مورتی ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی رکھی جا سکے گی"۔

پورے دربار کو سانپ سونگھ گیا پیشوا دم بخود رہ گیا۔ سدا شیو بھاؤ بھی پریشان ہو گیا۔ رانی اور بسواس راؤ کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ عرفان کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

آخر اس سکوت اور سناٹے کو ایک بوڑھے مرہٹہ سردار نے توڑ دیا۔ وہ دربار کی تیسری قطار میں بالکل کنارے داہنی جانب کھڑا تھا۔ اس نے کہا "ابراہیم گاردی نے جو کچھ کہا وہ بالکل سچ ہے۔ ہمیں محمود غزنوی کی سزا آج کے مسلمانوں کو نہیں دینی چاہیے۔ محمود غزنوی نے جو کچھ کیا وہ شکر کے پرجوش مسلمانوں سے کام لینے کے لیے کیا ورنہ شاید محمود غزنوی خود یہاں کے بتوں کو نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اسی طرح ہمیں اورنگ زیب سے سخت نفرت ہے لیکن ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ دہلی کی جامع مسجد اورنگ زیب نے نہیں اس کے باپ شاہجہان نے بنوائی تھی اور شاہجہان کو اورنگ زیب نے قید کر دیا تھا۔ اس لیے دہلی کی جامع مسجد کی بے حرمتی اور اس کے منبر پر سومنات کی مورتی کو نصب کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور پھر یہ سب کچھ راج نیتی کے بھی خلاف ہے"۔

پیشوا نے مرہٹہ سردار کی تائید کی، وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور ٹھہر ٹھہر کر بولا "مرہٹے سردار نے جو کچھ کہا درست ہے۔ اور سدا شیو بھاؤ نے جو کچھ جوش میں کہا وہ بھی پورے بھارت ورش کے ایک ایک ہندو کے دل کی آواز ہے لیکن راج نیتی کے تقاضے کچھ اور ہی ہیں۔ ہمیں اپنے مسلمان بھائیوں سے فراخ دلی کا سلوک کرنا پڑے گا۔ اس وقت ہمیں ہر اس بات سے بچنا چاہیے جس سے ہم میں اختلاف و انتشار اور ہمارے دشمنوں

میں اتحاد اور جوش پیدا ہو۔ قبل از وقت باتیں بنانے سے یہ بہتر ہے کہ مستقبل کے بارے میں کوئی لب کشائی نہ کریں۔"

سب کے آخر میں سداشیو بھاؤ کو پیشوا نے حکم دیا کہ فوراً ایک لشکر جرّار تیار کرے اور بسوراس راؤ کو ساتھ لے کر دہلی کی طرف کوچ کر جائے۔ دہلی کے مغل بادشاہ کو معزول کر کے تخت پر بسواس راؤ کو بٹھا کر افغانستان روانہ ہو جائے۔

ابراہیم خان گاردی، فتح خان گاردی اور عرفان دربار سے فکرمند، ملول اور افسردہ واپس ہوئے۔ عرفان نے محسوس کیا کہ اب وقت نہیں رہا کہ چچا سے لیلاوتی کی بابت بات کی جائے۔

لیلاوتی کو آخری سانسوں تک یہی یقین تھا کہ عرفان اس کی مدد کرے گا۔ لیکن جب رات کو اُسے دلہن بنا کر بستی کے عظیم الشان پنچایتی مندر روانہ کر دیا گیا تو آنے والے بدترین اور شرمناک لمحات سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ مندر کے برہمن جس طرح یہ رسم اپنی نگرانی میں ادا کر رہے تھے اس میں خودکشی کی راہ بھی مسدود ہو گئی تھی۔ گرد بال اررو گی سے لیلاوتی کو شیوجی کی دلہن بنتے دیکھتا رہا لیلاوتی کا تین سالہ بھائی اُسے البتہ بہت خوش تھا۔ اس کی جیبجی رنگ برنگے اچھے اچھے کپڑے جو بہن اُسی تھی۔

بستی کا عظیم الشان پنچایتی مندر دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا اس کے چاروں گوشوں پر چار چھوٹے چھوٹے مندر تھے۔ اور اندر باہر کی دیواریں اور دروازے طرح طرح کی مورتیوں سے منقوش تھے۔ چند دیوداسیوں کی مدد سے وہ مندر میں پہنچا دی گئی۔ مندر کو بالکل خالی کر دیا گیا تھا۔ اس وقت صرف بڑا پجاری وہاں موجود تھا جو بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے لیلاوتی کو شیوجی کی ترتی مورتی۔ کے سامنے فرش پر بٹھا دیا اور نہایت شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "لیلاوتی! تھوڑی دیر بعد میں بھی یہاں سے چلا جاؤں گا، رات کے کسی بھی حصے میں اور کسی بھی راستے سے شیوجی کسی بھی روپ میں تیرے پاس آئیں گے تو گھبرانا نہیں، ہمت اور ہوش و حواس سے کام لینا، شیوجی کو تجھ پر پورا حق تصرف حاصل ہو گا۔ یہاں یہ تیرا فرض ہو گا۔ کہ تو ہر حال میں راضی خوشی رہ، اس ناٹک کا آخری منظر نہایت اہم ہو گا۔ آج بھارت ورش کی پوری ہندو جاتی یہ جاننا چاہتی ہے۔ کہ وہ عنقریب جو قدم اٹھانے والی ہے اس میں اسے کس حد تک کامیابی حاصل ہو گی شیوجی جب تجھ سے اچھی طرح لطف اندوز ہو چکیں گے۔ تو سب سے آخر میں ترنگ میں آکر تجھے مستقبل کی ساری وہ باتیں بتا دیں گے جو اس بھارت ورش میں پیش آنے والی ہیں۔"

دیوداسیاں واپس گئیں۔ بڑا پجاری بھی چلا گیا اور تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ اس نے آہستہ سے گھونگھٹ ہٹایا اور گربھ گرہ کی طرف دیکھا یہ گربھ گرہ اُس سنگھاسن کو کہتے ہیں۔ جس پر بت براجمان ہوتے ہیں۔ اس نے دیکھا تین چہروں والے شیوجی، نہایت تمکنت سے بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے

دیوار پر شکر، سینچر، راہو اور کیتو کی مورتیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ان میں بعض کی شکلیں نسوانی تھیں۔ ایک کے چہرے پر مزعونوں جیسی داڑھی تھی۔ اور دو داڑھی مونچھ سے محروم تندرست و توانا مرد تھے۔ ان کے سروں پر مختلف قسم کے تاج رکھے ہوئے تھے۔ اور تاجوں کے اوپر دیوار کی سطح پر سورج مکھی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ادھر سے نظریں ہٹا کر دوسری طرف جو دیکھا تو یہاں بھی ایک گرجھ گرہ بنا ہوا تھا اور اس پر ایک مرد کی گردن پر لکشمی اور نارائن اس طرح سوار بیٹھے تھے کہ ننگے نارائن کا ایک پیر تو اس کے سینے پر ٹکا رہا تھا۔ اور دوسرا پیر اس کے کاندھے پر اس طرح مڑا ہوا رکھا تھا کہ پیر کے تلوے کے دباؤ سے اس کی گردن کرب کے عالم میں ایک طرف جھک گئی تھی اور اس پیر کی ران پر برہنہ لکشمی نارائن سے چمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔

اس مورتی نے لیلاوتی کو شرم سے پانی پانی کر دیا اور اس نے حیا سے گردن جھکا لی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے پیچھے کی دیوار پر دیکھا یہاں شیو جی ایک لیٹے ہوئے انسان کے سینے پر تانڈو رقص (مجنونانہ رقص) میں مصروف تھے۔ لیلاوتی کا رواں رواں لرزنے لگا۔ کیا اس کے دیوی دیوتا بھی آدمیوں ہی کی طرح دیوانے اور وحشی ہیں اسے ان سے بڑی مایوسی ہو رہی تھی۔

اس ویران اور تنہا ماحول میں آدھی رات سے زیادہ وقت گزر گیا۔ کسی بھی قسم کی آہٹ کا وجود نہ تھا۔ منڈپ کی فضا موی شمعوں اور تیل کے بڑی بڑی فانوسوں سے اتنی روشن تھی، کہ دیواروں کے ننھے ننھے نقوش بھی اچھی طرح دیکھے جا سکتے تھے۔ یکایک کسی نے شیو جی کے تانڈو رقص کے برابر والی کھڑکی کو دھکا دیا وہ لرزنے لگی، ذرا سی دیر بعد ایک جھٹکے سے کھڑکی کھل گئی اور اس کے اندر سے ایک نوجوان اندر پھاند پڑا۔ لیلاوتی نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا یہ بسواس راؤ تھا اس کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی اور ایک ہاتھ میں کانٹوں دار کوئی پھل تھا۔ سر پر پروں اور کانٹوں کا تاج تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کسی پاگل کی طرح ڈری سہمی لیلاوتی کی طرف بڑھا۔ لیلاوتی پیچھے ہٹنے لگی۔ بسواس راؤ جو بالکل شیو کا روپ دھار کے آیا تھا اپنے ہاتھ کا نٹوں دار پھل پھینک کر آغوش وا کئے اس کی طرف بڑھتا رہا۔

لیلاوتی بے بسی سے رو دی "بسواس راؤ، رحم، مجھے معاف کر دو"

بسواس راؤ کے چہرے پر غصے کی سختی نمودار ہوئی اور بھیانک آواز میں بولا "بسواس راؤ نہیں شیو جی کہو، میں شیو ہوں۔ اومورکھ کنیا"

لیلاوتی نے لجاجت سے کہا "مجھے دھوکا نہ دو، تم بسواس راؤ ہو۔ مجھے معاف کر دو۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

بسواس راؤ بالکل اس کے سر پر پہنچ گیا۔ لیلاوتی نے پہلے تو اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن جب بسواس راؤ نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تو لیلاوتی اس کی آغوش میں آ گئی

بسواس راؤ نے نہایت پھرتی سے اُس کے دونوں ہاتھ چھوڑ کر کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ لیلاوتی نے بے تحاشا اس کے سینے پر مکّے رسید کرنے شروع کئے۔ اس نے مدد کے لیے بے طرح چیخیں بھی بلند کیں۔ لیکن اسکی چیخیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ مدد کے لیے کوئی بھی نہ آسکا۔ لیلاوتی نے بھرائی آواز میں کہا۔ "اگر تم باز نہ آئے تو میں مندر کو آگ لگا دوں گی۔!"

بسواس راؤ نے ڈانٹ کر کہا۔ "تو ایسا نہیں کر سکتی۔" اس کے بعد اس نے ایک عجیب سی آواز منہ سے نکالی جس کے جواب میں ایک دیو داسی اندر داخل ہوئی۔ بسواس راؤ نے اسے حکم دیا۔

"ساری شمعیں بجھا دو، بس ایک وہ اونچی والی قندیل جلتی رہے۔"

لیلاوتی ایک دم نرم پڑ گئی۔ جسم ڈھیلا چھوڑ دیا، بولی۔ "بسواس راؤ شمعیں مت گل کرو مجھے اندھیرے سے وحشت ہوتی ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب مزاحمت نہ کروں گی۔"

بسواس راؤ فاتحانہ انداز میں مسکرا دیا۔ داسی کو سر کے اشارے سے باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ داسی چلی گئی۔

بسواس راؤ نے اسے بھینچ لیا، بولا۔ "میں بسواس راؤ نہیں، شیو ہوں۔!"

لیلاوتی کا دم گھٹنے لگا۔ اُس نے کہا۔ "شیو جی مہاراج! میں جب یہ کہہ چکی ہوں کہ میں مزاحمت نہ کروں گی تو مجھے ذرا دم لینے دیجئے۔ بہر کام دھیرج سے ہو تو زیادہ اچھا ہے۔"

بسواس راؤ نے جب یہ دیکھا کہ لیلاوتی آمادۂ خود سپردگی ہے تو اس نے اسے چھوڑ دیا لیکن ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھا اسے شیو جی کی تری مورتی کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔ "اب ہم دونوں یہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے!"

کانٹوں دار مچھل سامنے فرش پر پڑا ہوا تھا، لیلاوتی نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ بسواس راؤ نے ہنس کر پوچھا۔ "اس کا کیا کرے گی؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ "میں اسے شیو جی مہاراج کا پوتر دان سمجھ کر اپنے پاس رکھوں گی۔"

بسواس راؤ ترنگ میں بہکنے لگا۔ "میرا روپ دیکھ۔ مورکھ کنیا میں بسواس راؤ کے روپ میں تیرے سامنے آیا ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آج میں سب سے زیادہ بسواس راؤ پر مہربان ہوں، بسواس راؤ عنقریب بھارت ورش کا حکمران ہوگا۔ نہ صرف بھارت ورش کا بلکہ کابل و قندھار بھی اس کے زیر نگین ہوں گے۔"

لیلاوتی کے جو عزائم تھے۔ انہیں کسی طرح ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ بیٹھ گئی۔ بسواس راؤ بھی بیٹھ گیا۔ وہ ایک خاص وقت کے لئے اسے باتوں میں الجھا کر غافل رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بسواس راؤ کے

ہاتھ کو آہستہ سے دبایا اور دریافت کیا "شیوجی مہاراج! آنے والے دنوں میں بھارت ورش کا نقشہ کیا ہوگا۔"

بسواس راؤ نے مہا گیانی کی طرح بولنا شروع کیا "جلد ہی پورے بھارت ورش سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ غزنی پر رام راج کا جھنڈا لہرائے گا۔ افغان بادشاہ احمد شاہ درانی قتل کر دیا جائے گا۔ دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر سومنات کی مورتی رکھ دی جائے گی۔ اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں رام راج قائم ہو جائے گا۔"

لیلاوتی نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور بے پناہ خوشی کا اظہار کیا "خوب، تب پھر تو مزے ہی مزے رہیں گے۔"

لیلاوتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بسواس راؤ نے حیرت سے پوچھا "کہاں چلیں؟"

لیلاوتی نے خوشامدانہ عرض کیا "مہاراج! اگر اجازت ہو تو میں تمہاری تری مورتی کی پوجا کر لوں، اس کے بعد تمہیں پورا حق حاصل ہوگا۔ کہ اپنی اس داسی کو جس طرح چاہو اپنی محبتوں سے نوازو۔"

بسواس راؤ نے شان بے نیازی سے جواب دیا "اجازت ہے۔"

لیلاوتی تری مورتی کے سامنے جھک گئی اور زار و قطار رونے لگی، اس کا دل اُچھل اُچھل کر آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے زیر لب اشلوکوں کا ورد کر رہی ہو۔ کانٹوں دار پھل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک نظر اس پر ڈالی۔ پھر ساڑی کے اوپر جو چادر سی لپیٹ رکھی تھی۔ اُسے جسم سے الگ کیا اور اسے سمیٹ کر بغل میں داب لیا، بسواس راؤ اس کی ایک ایک حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر لیلاوتی کی نظریں مندر کے کونے میں کھڑے ہوئے اس بانس پر گئیں جس کے سرے پر لگے ہوئے ہک سے فانوسوں کی بتیاں اُکسائی جاتی تھیں۔ اس کا تیز دماغ نہایت ہوشیاری سے منصوبہ بنانے میں مشغول تھا۔ اس نے ایک نظر جلتی ہوئی فانوسوں پر ڈالی کچھ کی بتیاں چھوٹی ہو چکی تھیں انہیں اُکسانے کی ضرورت تھی۔ بسواس راؤ نے پوچھا "کیا بات ہے لیلاوتی؟"

لیلاوتی نے جواب دیا "بعض فانوسوں کی بتیاں چھوٹی ہو گئی ہیں۔ انہیں اُکسانے کی ضرورت ہے۔" اس کے بعد وہ بانس اٹھا لائی اور ایک بتی اُکسانے لگی۔ بسواس راؤ نے بانس لینے کی کوشش کی۔ بولا "لاؤ میں اُکسا دوں بتیاں۔"

لیلاوتی نے مزاحمت کی۔ چھینا جھپٹی میں فانوس کی چند بتیاں ان کے کپڑوں پر آ گریں۔ لیلاوتی نے اپنی چادر کو آگ دکھا دی اور اسے بسواس راؤ پر اچھال دیا۔ بسواس راؤ کے منہ پر آگ کا چپا کا لگا۔ وہ بدحواس ہو کر پیچھے ہٹا۔ لیلاوتی نے پاگلوں کی طرح فانوس پر بانس کی بارش کر دی۔ پورے منڈپ میں آگ ہی آگ پھیل گئی، بسواس راؤ نے کوشش کی کہ وہ لیلاوتی سے بانس چھین لے لیکن اس کوشش میں وہ اپنی۔

دھوتی کو آگ لگا بیٹھا، وہ چیختا چلاتا مندر کے باہر نکل گیا۔ لیلاوتی دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی وہ آگ سے بال بال بچ گئی تھی۔ مندر کا منڈپ آگ کی نذر ہو گیا چاروں طرف سے ایک شور سا بلند ہوا اور لوگ آگ بجھانے دوڑ پڑے۔ لیلاوتی نے اس افراتفری اور بدحواسی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مندر سے باہر نکلتے ہی وہ ایک طرف بھاگنے لگی۔ تاریکی اتنی غضب کی تھی کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ کافی دور جا کر اس نے پلٹ کر مندر پر نظر ڈالی۔ وہاں کی پوری فضا روشن تھی اور اب شعلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ اس کی روشنی میں وہ پکڑی جا سکتی تھی۔ اس نے بھاگنے کے لئے ایک ایسے راستے کا انتخاب کیا جس کے کنارے کنارے گنجان درختوں کا طویل سلسلہ چلا گیا تھا۔ لیکن اسی لمحے کسی نے اس کا راستہ روک لیا اور دریافت کیا "تم کون ہو؟"

آواز جانی پہچانی تھی۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی "مجھے یہاں سے نکال لے چلو افغان نوجوان۔"

"بات کیا ہے لیلاوتی؟ تم خیریت سے تو ہو؟" یہ عرفان کی آواز تھی۔

"ہاں میں خیریت سے ہوں، لیکن یہاں سے جلدی بھاگ چلو۔ وہ ہمارا پیچھا کریں گے۔ میں جانتی ہوں وہ ہمارا ضرور پیچھا کریں گے۔"

عرفان نے پوچھا۔ کیا تم میرے ساتھ گھوڑے پر اس طرح بیٹھنے پر آمادہ ہو جس طرح سنجوگتا پرتھوی راج کے ساتھ بیٹھی تھی؟"

"میں تیار ہوں، بالکل تیار ہوں۔ اب دیر نہ کرو۔"

عرفان اسے لے کر ایک گھنیرے املی کے درخت کی طرف بڑھا۔ "تب پھر ادھر آؤ میرے ساتھ۔"

اب لیلاوتی کو کچھ قرار آ چلا تھا۔ عرفان جیسا ساتھی جو مل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑے کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے مجبوراً بادل نخواستہ لیلاوتی کو آگے بٹھایا، خود پیچھے بیٹھ گیا۔ اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں کہنے لگا "خدا مجھے معاف کرے، میں نے تمہیں مجبوراً اس طرح بٹھایا ہے۔"

لیلاوتی نے آہستہ سے کہا "میں جانتی ہوں۔"

"تمہیں کہاں پہنچا دوں؟"

"جہاں چاہو لے چلو، میں تمہارے ساتھ چلوں گی؟"

"نہیں ایسا مشکل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میں اس وقت پونا کو چھوڑ دینے ہی کی نیت سے نکلا تھا۔ لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"کیوں آخر کیوں؟ مجھے یہاں کے لوگ مار دیں گے، میں نے بس اس راؤ سے بچنے کے لیے مندر

کو آگ لگادی ہے۔"

"کچھ بھی ہو!" عرفان نے اٹل لہجے میں کہا۔ "میں دہلی جارہا ہوں وہاں میں احمد شاہ درانی کے لشکر میں شامل ہو جاؤں گا۔ ایسی حالت میں میں تمہیں کہاں لئے لئے پھروں گا۔"

لیلادتی نے مایوسی سے کہا۔ "تب پھر تم مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کرتے جاؤ۔"

"یہ بھی ناممکن ہے۔" عرفان نے کہا۔ "آخر تم اتنی مایوس کیوں ہو؟"

لیلادتی نے جھنجھلا کر کہا۔ "تم معلوم نہیں کیسی باتیں کرتے ہو، میں جو کچھ کہتی ہوں اسے کیوں نہیں سمجھتے!"

"تم کیا کہتی ہو؟"

"میں یہ کہتی ہوں کہ میں نے اپنی عزت بچانے کے لیے مندر کو آگ لگادی ہے۔ اگر تم نے مجھے یہیں چھوڑ دیا تو لوگ مجھے ہلاک کر دیں گے۔"

"لیلادتی!" عرفان نے افسوس سے کہا۔ "میں تمہیں تمہارے چچا کے پاس پہنچائے دیتا ہوں، وہ تمہیں کہیں بھی چھپا دیں۔ پھر جب مرہٹہ افواج دہلی آئیں تو کسی طرح ان کے ساتھ تم بھی آجانا۔"

"بہتر ہے!" اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ "مجھے میرے چاچا جی کے پاس پہنچا دو، میں اپنے ہر حشر کے لیے تیار ہوں۔"

عرفان خاموش رہا۔ گھوڑا آہستہ آہستہ دیشوں کی بستی کی طرف چلا جارہا تھا۔

ذرا دیر بعد عرفان نے سکوت توڑ دیا۔ "لیلادتی! شاید تم یہ سوچو کہ میں تم سے بالکل لاتعلق ہوں اور میرے دل میں تمہارے لیے کوئی گنجائش نہیں، پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن جب میں تم سے جدا ہوا اور میں تمہاری کوئی مدد بھی نہ کر سکا تو میرا دل اپنی بے بسی پر خون کے آنسو روتا رہا اور میں نے شاید پہلی بار یہ محسوس کیا کہ میرے دل میں تمہارے لئے عام انسانوں جیسی ہمدردی نہیں ہے۔ تمہارے لیے میرا دل بھی بے اختیار دھڑکا ہے۔ اور اپنی بے بسی پر میری آنکھیں بے اختیار نم ہوتی رہی ہیں۔" لیلادتی کے دل کی حالت بھی کچھ عجیب سی ہو رہی تھی، اس کے جی میں آئی کہ وہ گھوڑے سے پھاند کر خودکشی کر لے۔ عرفان کہتا رہا۔ "اسوقت بھی میں یہاں اسی ارادے سے آیا تھا کہ رات کے پچھلے حصے میں، میں مندر میں داخل ہو کر کسی طرح بسواس راؤ کو ٹھکانے لگا دوں، اور مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی کہ ایسا کرتے ہوئے میں خود بھی قتل کیا جا سکتا ہوں۔"

لیلادتی چپ رہی، اندھیرے میں ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ عرفان اب بھی بول رہا تھا۔ "ایک افغان کو عورت کی محبت میں گرفتار ہو کر بے بس نہیں ہو جانا چاہیے۔ لیلادتی میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تم سے محبت تو ضرور کرتا ہوں لیکن بے بس نہیں ہوں۔ میں تم سے یہ بھی نہیں کہوں گا۔ کہ تم اسلام قبول کر لو اور ہمیشہ کے لیے مجھ سے وابستہ ہو جاؤ۔ جس طرح مجھے شدھی ہو جانا پسند نہیں اسی طرح محبت کی خاطر تمہارا مسلمان

ہو جانا بھی مجھے گوارا نہیں۔"

لیلادتی نے بدقت سوال کیا۔" کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم دونوں اپنے اپنے دھرم پر قائم رہیں اور پوری زندگی ایک ساتھ رہ کر گزار دیں۔"

"یہ کس طرح ممکن ہے؟" عرفان نے جواب دیا۔" میں مسلمان ہوں اور اسلام ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک ایسے مذہب کی لڑکی سے جو اہل کتاب میں سے نہیں ہے کوئی جذباتی پائیدار رشتہ استوار کریں۔"

لیلادتی بے چین ہوئی۔ چیخ کر بولی" مجھے یہیں اتار دو، میں تنہا گھر چلی جاؤں گی۔ تم میری بے عزتی کیوں کر رہے ہو۔"

عرفان گھبرا گیا۔ لیلادتی اس طرح مچلنے لگی گویا پھاند پڑے گی۔" مجھے اتار دو، یہیں اتار دو میں تنہا گھر چلی جاؤں گی۔"

عرفان نے خوشامد سے کہا۔ میں تمہیں تمہارے گھر تک پہنچاؤں گا تم یہاں اترنے کی ضد نہ کرو۔ اگر میری بات سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔"

لیلادتی زور زور سے سانسیں لے رہی تھی مارے غصے کے وہ ہانپنے لگی تھی۔ جب اس کا کسی بات پر زور نہ چلا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سسکیاں لیتی ہوئی بولی۔" تم یقین کرو تمہارے لیے میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر تم نے شدھی ہو جانا پسند نہ کیا تو میں خود مسلمان ہو جاؤں گی لیکن اب تم یہ کہتے ہو کہ میرے محبت میں مبتلا ہو کر اسلام اختیار کرنا تمہارے نزدیک اچھی بات نہیں ہے یہ سب فضول باتیں ہیں تم مجھ سے صاف صاف یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ورنہ محبت تو وہ شے ہے جو پانی میں بھی آگ لگا دیتی ہے۔"

عرفان بدستور خاموش رہا، لیلادتی راستے بھر ہذیان میں مبتلا رہی، جو منہ میں آیا بکتی رہی۔ جب گھر بالکل قریب آگیا تو جدائی کے خیال سے عرفان نے کہا۔" لیلادتی! اب ہم دونوں جدا ہو جائیں گے اگر مناسب سمجھنا تو مرہٹہ افواج کے ساتھ دہلی چلی آنا وہاں شاید پھر ملاقات ہو جائے۔"

لیلادتی نے کہا۔" ان بے کار تمناؤں سے حاصل؟ اب ہمیں ایک دوسرے سے دور ہی دور رہنا چاہیے۔"

"اچھا" عرفان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔" تم بھی سچ ہی کہتی ہو۔"

حویلی آچکی تھی۔ پہلے عرفان اترا اس کے بعد لیلادتی کو اتارا۔ لیلادتی نے اندھیرے میں ایک نظر عرفان کو دیکھنے کی بے سود کوشش کی۔ اس کے بعد درخواست کی۔" ابھی جانا نہیں، میں حویلی کا دروازہ کھلوا لوں اس کے بعد چلے جانا۔"

عرفان کھڑا ہو گیا "میں یہیں کھڑا ہوں اور اس وقت تک کھڑا رہوں گا جب تک تم اندر نہیں چلی جاؤ گی"۔
محبت ایک جنون ہی تو ہے۔ لیلاوتی اب پھر نرم پڑ گئی تھی خواہش آمیز خوشامدانہ لہجے میں بولی "میں روشنی میں آخری بار تمہاری شکل دیکھوں گی، آخری بار، اس کے بعد تم ہمیشہ کے لیے چلے جانا"۔
عرفان نے اس کی یہ درخواست مان لی، ساتھ ساتھ حویلی کے دروازے تک چلا گیا۔ اسے یہ شرم ہمزور محسوس ہو رہی تھی کہ اس وقت چچا گردیال اسے دیکھ کیا خیال کریں گے؟
کئی بار تھپتھپانے سے دروازہ کھل گیا۔ گردیال کے ہاتھ میں شمع تھی۔ وہ لیلاوتی کو دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ لیلاوتی نے اس کے ہاتھ سے شمع لے لی اور اس کی روشنی میں یک لخت عرفان کی شکل دیکھنے لگی۔ یہ تماشا گردیال کی سمجھ میں نہ آیا۔ کچھ دیر بعد لیلاوتی نے شمع اپنے چاچا جی کی طرف بڑھا دی اور ہونٹ بھینچ کر بدقت تمام عرفان کو حکم دیا "اب تم جا سکتے ہو!"
عرفان کے جی میں آئی کہ وہ ایک بار پھر یہ درخواست کرے کہ لیلاوتی مرہٹہ افواج کے ساتھ دہلی ضرور آئے لیکن زبان نہ کھل سکی لیلاوتی نے عرفان کے واپس جانے کا بھی انتظار نہ کیا۔ اور تیزی سے اندر چلی گئی۔
بسواس راؤ نے مندر کے حوض میں پھاند کر آگ بجھائی۔ آگ پر بڑی مشکلوں سے قابو پایا گیا۔ اس منحوس واقعے سے لوگوں نے بڑی بدشگونیاں لیں۔ بسواس راؤ کو غصہ تو بہت تھا لیکن محض اس لیے چپ ہو گیا کہ اس وقت وہ شیو جی کے روپ میں تھا اور لیلاوتی کی اس حرکت کی سزا شیو جی ہی دے سکتے تھے۔ پیشوا بھی سردست ہندوؤں کو انتشار اور افراتفری سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔
جب گردیال نے لیلاوتی کی پوری داستان سنی تو وہ اسی رات کو اسے لے کر ایک نواحی گاؤں میں چلا گیا۔
کچھ دنوں بعد گجرات سے گیکواڑ، مالوے سے ملہر راؤ، گوالیار سے سندھیا، بندیلکھنڈ سے گوند پنت اور بھرت پور کا سورج مل جاٹ وغیرہ اپنی اپنی فوجوں سمیت سداشیو بھاؤ سے آملے، ان کی مجموعی تعداد تین لاکھ تھی۔ سوداگروں اور بیوپاریوں کی تعداد تین لاکھ کے علاوہ تھی۔ گردیال اور لیلاوتی بھی لشکر میں شامل ہو گئے۔ یہ لشکر دھاوے بولتا اور منزلیں مارتا لال قلعے کے سائے میں پہنچ گیا اور قلعے دار کو حکم دیا کہ قلعے کی کنجیاں سداشیو بھاؤ کے حوالے کر دی جائیں۔ قلعے دار نے مقابلہ کرنا چاہا لیکن فوراً بعد ہی اسے مغل وزیر اعظم کا ایک خط موصول ہوا جس میں قلعے دار کو مقابلے سے منع کیا گیا تھا۔ اور اسے حکم دیا گیا تھا کہ قلعے کی کنجیاں فوراً سداشیو بھاؤ کے حوالے کر دی جائیں قلعے دار نے حکم کی تعمیل میں کنجیاں مرہٹوں کے حوالے کر دیں اور سداشیو بھاؤ اپنی فوج کے ساتھ لال قلعہ میں بغیر لڑے بھڑے داخل ہو گیا۔ مغل بادشاہ اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ مرہٹوں نے پورے قلعے میں جگہ جگہ اپنے جھنڈے لہرا دیئے اس نے دیوان خاص کی چھت سے سونے کے پترے نکلوا لیے محلات کے

طلائی آلات ظروف اور حضرت نظام الدین اولیا کے مقبرے اور محمد شاہ کے مرقد میں استعمال ہونے والے سونے کو گلوا کر پیشوائے پونا کے نام کے سکے ڈھلوا دیئے جس سے سات لاکھ اشرفیاں تیار ہوئیں۔ سداشیو بھاؤ نے یہ اشرفیاں اپنی ساکھ بڑھانے کے لیے ہندوستان کے مختلف ہندو سرداروں کے پاس بھیج دیں اور پیشوا کو ان اشرفیوں کے ساتھ ایک خط بھی لکھا۔ اس نے لکھا۔

"ہم نے اورنگ زیب کے باپ کے قلعے پر قبضہ کرلیا ہے اور بھارت ورش کو لوٹ کر جس سونے سے دیوان خاص کی چھت یا دوسری چیزیں بنائی گئی تھیں ہم نے ان پر قبضہ کرکے آپ کے نام کی اشرفیاں ڈھلوالی ہیں جنہیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں دہلی کا شاہی خاندان میرے قبضے میں ہے میں جب چاہوں انہیں کھلونوں کی طرح جمنا جی میں پھینک سکتا ہوں۔ جب چاہوں بسواس راؤ کو مغلوں کے تخت پر بٹھادوں اور جب چاہوں دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر سومنات کی مورتی رکھ دوں لیکن احمد شاہ درانی جمنا پار انوپ شہر میں موجود ہے اس کا خاتمہ کئے بغیر یہ ساری باتیں نامناسب ہیں ہمیں ابھی کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔"

مرہٹے اس کوشش میں تھے کہ اودھ کے شجاع الدولہ کو اپنے ساتھ ملالیں اور احمد شاہ درانی کی یہ کوشش تھی کہ شجاع الدولہ اس کی طرف آجائے۔ مالوے کا ملہر راؤ مرہٹوں کی طرف سے کوششیں کر رہا تھا اور روہیلکھنڈ کا نجیب الدولہ احمد شاہ درانی کی طرف سے مساعی تھا۔ بالآخر شجاع الدولہ احمد شاہ درانی کے کیمپ میں آگیا۔

عرفان، احمد شاہ درانی کی خدمت میں پہنچ چکا تھا اور اس نے وہ ساری باتیں بتادی تھیں جو پیشوا کے دربار میں طے پاچکی تھیں۔ شاہ نے اس سے کہا کہ "اگر کوئی ترکیب ہوسکے تو ابراہیم خاں گاردی کو ضرور توڑ لو۔"

لیکن عرفان مایوس تھا کہ اسے علم تھا کہ یہ بات ناممکن ہے۔ وہ اپنے چچا کی طینت سے خوب واقف تھا۔

چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد دونوں طاقتیں پانی پت کے میدان میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے صف آرا ہوگئیں۔ مرہٹے تین لاکھ سے بھی اوپر تھے اور احمد شاہ درانی کی کل فوج اسی اور چوراسی ہزار کے درمیان تھی۔ درمیان میں چھ میل کا فاصلہ چھوڑ کے دونوں نے خندقیں کھودلیں۔ شاہ نے حکمت عملی سے مرہٹوں کی رسد کے تمام راستے بند کردیئے تھے۔ سداشیو بھاؤ نے اپنے ایک مرہٹہ سردار گوبند پنڈت کو دس ہزار سپاہی دیئے اور اسے حکم دیا کہ جمنا اور گنگا کے بیچ میں رہنے والوں کو لوٹ لیا جائے۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی لیکن احمد شاہ کے دو ہزار سپاہیوں نے انہیں ایسی شکست دی کہ جنگ میں گوبند پنڈت بھی مارا گیا۔ مرہٹے اس ہزیمت سے گھبرا گئے۔ دونوں فوجیں دو مہینے تک آمنے سامنے پڑی رہیں۔ احمد شاہ درانی کے حلیف بار بار اس سے یہ کہتے کہ "اب جنگ شروع کردی جائے"۔ لیکن شاہ کہتا کہ "تم جو چاہو کرو لیکن جنگ شروع کرنے کا اختیار مجھے دو۔" سب اس پر متفق ہوگئے۔

ایک اونچی جگہ پر احمد شاہ درّانی نے اپنا سرخ رنگ کا خیمہ کھڑا کر رکھا تھا جس میں طلوع آفتاب کے بعد اشراق کی نماز پڑھتا دن بھر گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر مختلف جنگی مقامات کو دیکھتا پھرتا اور دن بھر میں پچاس ساٹھ میل کا چکر لگا لیتا۔ دن کا کھانا اڑا دیا تھا۔ شام کو کھانا کھاتا اور رات کو دشمن کے شب خون سے بچنے کے لیے پانچ ہزار سواروں کو پہرے پر لگا دیتا۔ اور خود اس کی نگرانی کرتا رہتا۔ جو ہندوستانی رئیس اسکے حلیف تھے۔ انہیں رات کو سونے کی اجازت دے گئی تھی۔ شاہ کے تامل نے مرہٹوں کی کمر توڑ دی۔ کھانے پینے کے سامان سے پہلے ہی محروم ہو چکے تھے۔ اب فاقوں تک نوبت آگئی تھی۔ جانور بھوک پیاس سے مرنے لگے۔ اور ان کی لاشوں کے تعفن نے مرہٹوں کا دماغ خراب کر دیا۔ احمد شاہ درّانی نے انہیں ایک نشیب میں محصور کر دیا تھا۔

اب ابراہیم خان گاردی کو معلوم ہو چکا تھا کہ عرفان، درانی کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اس نے عرفان کے باپ فتح خان گاردی کو پانچ ہزار سپاہی دیئے۔ اور حکم دیا کہ کسی طرح عرفان تک رسائی حاصل کرو اور اسے اس بات پر آمادہ کرد کہ دھوکے سے احمد شاہ درّانی کو ہلاک کر دے۔ فتح خان گاردی اپنے سپاہیوں کے ساتھ درّانی افواج کی طرف بڑھا۔ اور ایک تیر کی نوک میں ایک خط باندھ کے طلایہ گرد دستے کی طرف پھینک دیا۔ اس خط کو کھولا گیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"ہمیں عرفان گاردی سے ملنے کی اجازت دی جائے، میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے شب خون مارنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ عرفان مل کر شاہ کو ایسی تجویزیں بتاؤں جس سے وہ یہاں سے فتحمند اور ظفریاب ہو کر واپس جائیں۔ میں مسلمان ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس وقت شاہ کی ہی مدد کرنی چاہیے۔"

نیچے فتح خاں گاردی کے دستخط تھے۔ جب شاہ کی خدمت میں یہ خط پیش کیا گیا تو اس نے عرفان کو گفت و شنید کے لیے بھیج دیا۔ دونوں باپ بیٹے اس طرح ملے جس طرح دو دشمن ملتے ہیں۔ کھنچے کھنچے جھجکتے جھجکتے چوکنا چوکنا۔ جب فتح خان نے اپنے بیٹے کے سامنے شاہ کے قتل کر دینے کی تجویز رکھی تو اس نے جواب دیا کہ "اسی وقت واپس جاؤ، ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ تم لوگ غدار ہو۔"

فتح خان اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ اب سدا شیو بھاؤ نے اودھ کے شجاع الدولہ کے ذریعہ احمد شاہ درّانی سے صلح کی بات چیت کرنی چاہی لیکن روہیلوں نے اس سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ "یہ جہاد ہے۔ اور جہاد کا جب اعلان ہو جائے تو فیصلہ کن اور مفید نتیجے تک پہنچے بغیر جنگ بند کرنی حرام اور کافرانہ فعل ہے" شاہ بھی مجبور ہو گیا۔

مرہٹے اور ہندوستان تک عاجز ہو گئے کہ انہوں نے سدا شیو بھاؤ کو گھیر لیا اور اسے فوراً جنگ شروع کر دینے پر مجبور کرنا شروع کر دیا۔ سدا شیو بھاؤ نے شجاع الدولہ کے پاس اپنا آدمی بھیجا وہ ایک مختصر سا خط لے

کر گیا تھا۔ اس نے شجاع الدولہ کو لکھا تھا کہ "احمد شاہ درّانی سے صلح کرا دو اور جیسی شرائط چاہو طے کر لو، مجھے منظور ہوں گی"۔ لیکن شاہ صلح کے لیے تیار نہ تھا۔ جب بھاؤ ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو شجاع الدولہ کو ایک خط اور لکھ بھیجا۔

"اب پیالہ لبریز ہو چکا ہے۔ اور اس میں اب ایک بوند کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ کچھ بن پڑے تو کر دو ورنہ صاف جواب دے دو، کیونکہ اس کے بعد لکھنے پڑھنے کا وقت نہیں ملے گا"۔

ابھی شجاع الدولہ خط پڑھ ہی رہا تھا کہ اسی وقت بھاگتا ہوا ایک جاسوس پہنچا اور اس نے خبر دی کہ مرہٹے مسلح ہو رہے ہیں۔ شجاع الدولہ فوراً احمد شاہ درّانی کے خیمے پر پہنچا اور پہرے داروں سے کہا کہ اسی وقت شاہ کو جگا دو، شاہ جاگ رہا تھا فوراً باہر نکل آیا۔ وہ ہتھیاروں سے آراستہ تھا۔ اس نے شجاع الدولہ سے چند باتیں کیں اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کے، فوج کو تیاری کا حکم دیا۔

لیلاوتی کو اپنے چچا گردیال کے ذریعے یہ معلوم ہو چکا تھا۔ کہ عرفان احمد شاہ درانی کے لشکر میں پہنچ چکا ہے۔ وہ دہلی میں ہی رہ گئی۔ اس کی طبیعت میں نا امیدانہ ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے یہاں بھی سکون قلب کی خاطر ایک پیپل کا درخت تلاش کر لیا تھا۔ وہ ہر روز طلوع آفتاب سے پہلے پابندی کے ساتھ برہم دیو کے چرنوں میں جل پھول چڑھاتی رہتی تھی۔ اور اس کے صلے میں بس ایک ہی خواہش کی تکمیل چاہتی تھی۔ وہ رقت سے کہتی "برہم دیو! میں نہیں جانتی کہ اس پیچیدہ معاملے کے دکھوں سے کس طرح نجات پاؤں گی۔ میں اپنا معاملہ تم پر چھوڑتی ہوں، تم ہی کوئی اپائے کرو"۔

اس کا یہ عمل دنوں جاری رہا۔ کہتے ہیں کہ جو خواہشیں جاگتے میں پوری نہیں ہوتیں۔ خواب میں پوری ہو جاتی ہیں۔ ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ شادی کے منڈپ میں وہ دلھن بن بیٹھی ہے اور اس کا آنچل عرفان سے بندھا ہوا ہے۔ پھر پھیرے لگنے لگتے اور پنڈت زور زور سے اشلوک پڑھنے لگا۔ اس کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے ایک سکون سا مل گیا۔ جب یہ خبر گرم ہوئی کہ پانی پت میں معرکہ کارزار گرم ہونے والا ہے۔ تو اس کے منہ سے بے ساختہ دعا نکلی "بھگوان! کوئی بھی جیتے لیکن تم اس افغان نوجوان کو زندہ رکھیو"۔

دوسری طرف پانی پت کے میدان میں جب سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو مرہٹوں کی فوج نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اور شاہ کی فوج کے سامنے جا کر رک گئی۔ بائیں طرف ابراہیم گاردی بالکل حافظ رحمت خان کے مقابل کھڑا تھا۔ بیچ میں شاہ کے وزیر اعظم کا دستہ تھا۔ بائیں طرف شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کھڑے تھے۔ خود احمد شاہ درّانی اپنے لال خیمے سے اس تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ اور یہیں سے فوجی سرداروں کے نام احکامات جاری کر رہا تھا۔

یکایک ابراہیم خان گاردی کے توپ خانے نے آتش باری شروع کردی اور یہ حملہ اتنا شدید ہوا تھا کہ شاہ کے وزیر اعظم کی فوج کے پیر اکھڑ گئے اور پہلے ہی حملے میں آٹھ ہزار پٹھان کام آئے۔ جب فوج کے قدم اکھڑ گئے تو نجیب الدولہ چلایا "احمقو یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم سب غلطی پر ہو"۔ پھر اس نے شجاع الدولہ کے پاس آدمی بھیجا اور کہلایا "شجاع الدولہ سے کہو۔ لڑائی میں شریک ہو جائیں"۔ شجاع الدولہ نے جواب دیا "میں کس طرح اپنی جگہ چھوڑ سکتا ہوں"۔

تھوڑی دیر بعد پھر نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ کو پیغام بھیجا "افغان بھاگ رہے ہیں۔ اور انہوں نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ شجاع الدولہ سے کہو جلدی آئیں اور میری مدد کریں"۔

شجاع الدولہ نے پھر ویسا ہی پیچیدہ جواب دیا "میں کیونکر اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہوں۔ حالات بہت نازک ہیں"۔

اور میدان جنگ کا یہ عالم تھا کہ جو مرہٹے شجاع الدولہ کی طرف آگئے تھے۔ کترا کر لڑے بغیر واپس چلے گئے۔

پورا میدان "جے جے بھوانی اور ہر ہر مہادیو" کی آواز سے گونج رہا تھا۔ اور مسلمان تکبیر کی آواز بلند کر رہے تھے۔ تین گھنٹے تک ابراہیم خان گاردی میدان کا ہیرو رہا۔ شاہ نے جب یہ دیکھا کہ فوج بدحواس ہو کر بھاگ رہی ہے۔ تو وہ اپنی محفوظ فوج کو لے کر طوفان کی طرح آگے بڑھا اور مرہٹوں کو گھیرے میں لینے لگا۔

عرفان گھوڑا دوڑاتا ہوا بسواس راؤ کی طرف بڑھا۔ لیکن سامنے سداشیو بھاؤ آگیا۔ عرفان نے چیخ کر کہا "کہاں ہیں تیرے وہ خواب جو تو نے دیکھے تھے"۔

سداشیو بھاؤ بدحواس ہو گیا اور میدان چھوڑ کر بھاگا۔ وہ بسواس راؤ پر حملہ آور ہو گیا۔ یہ بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ بسواس راؤ جس پر سوار تھا۔ وہ اعلیٰ نسل کی گھوڑی تھی۔ عرفان کے گھوڑے نے اس کی بو جو محسوس کی تو خود ہی اس کے تعاقب میں لگ گیا۔

شجاع الدولہ نے ایک بزرگ دوست سے پوچھا "کیوں؟ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا ہندو میدان مار لیں گے"۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا!" بزرگ دوست نے جواب دیا "ہندو مارا جائے گا"۔

شجاع الدولہ نے کہا "لیکن مرہٹے تعداد میں بہت زیادہ ہیں"۔

بزرگ دوست نے جواب دیا "اللہ کا ارادہ سب پر غالب ہے"۔ یکایک میدان جنگ سے شور بلند ہوا "سداشیو بھاؤ مارا گیا"۔

لوگ خوشی میں اچھلنے لگے۔

عرفان کا گھوڑا بسواس راؤ کی گھوڑی کا بڑی بے جگری سے پیچھا کر رہا تھا۔ اچانک بسواس راؤ گھوڑے کی پشت سے نیچے گر گیا۔

گھوڑی کچھ دور جا کر رک گئی۔ عرفان کا گھوڑا بھی رُک گیا۔ وہ بھی گھوڑے سے پھاند پڑا اور جب بسواس راؤ کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ اطمینان سے آنکھیں بند کئے سو رہا ہے۔ دہشت اور خوف سے اس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی تھی۔ عرفان بسواس راؤ کی لاش پر جھک گیا۔ اور گھوڑا گھوڑی سے چہلیں کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ آگے پیچھے دائیں بائیں مرہٹوں کی دوڑ ہو رہی ہے اور افغان ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔

احمد شاہ درانی کا حکم تھا کہ ایک مرہٹہ بھی بچ کر نہ جانے پائے۔ افغان ان کا قصائے مجرم کی طرح پیچھا کر رہے تھے۔ تقریباً نوّے میل تک مرہٹوں کی لاشیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس معرکے میں تقریباً دو لاکھ مرہٹے ہلاک ہوئے۔ مرہٹوں کی تقریباً سو سالہ تیاری پانی پت کے میدان میں، چند گھنٹوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دی گئی۔!۔

فتح خان گاردی میدان جنگ میں کام آیا۔ اور ابراہیم خان گاردی زخموں سے چور زندہ گرفتار ہوا۔

جب وہ شاہ کے سامنے لایا گیا تو شاہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور اس سے پوچھا "بول اب کیا کہتا ہے؟"

ابراہیم خان گاردی نے جواب دیا "اب میں شاہ کی خدمت کو فخر سمجھوں گا۔"

افغان سپاہی چیخنے لگے "نہیں، اسے معاف نہیں کیا جائے گا۔ اس نے ہمارے آٹھ ہزار سپاہیوں کو شہید کیا ہے۔"

شاہ نے گاردی سے کہا "یہ کفر و اسلام کی جنگ تھی پھر تو نے مرہٹوں کا ساتھ کیوں دیا جبکہ تیرا بھتیجا عرفان میرے لشکر میں آ گیا تھا۔"

گاردی نے جواب دیا "میں نے مرہٹوں کا نمک کھایا تھا۔ اور ایک افغان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آقا کی نمک حرامی کرے۔"

شاہ نے غصے میں کہا "حق و باطل کی جنگ میں یہ رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ خیر" اس کے بعد اس نے حکم دیا "گڑھا کھود کر اس میں نمک بھرا جائے۔ اور اس نمک میں اس مرہٹہ نمک حلال کو دفن کر دیا جائے۔"

حکم کی تعمیل ہوئی اور ابراہیم گاردی کو ہمیشہ کے لیے اس کی نمک حلالی کے صلے میں نمک ہی کے حوالے کر دیا گیا۔

عرفان بسواس راؤ کی لاش کو لے کر شاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ جب شاہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ مغل تاج و

تخت کے امیدوار پیشوائے پونا کے بیٹے کی لاش ہے۔ تو وہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اس کے مردانہ حسن سے شاہ بھی بہت متاثر ہوا۔ اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

شجاع الدولہ آگے بڑھا اور شاہ سے درخواست کی "یہ لاش فدوی کے حوالے کی جائے تاکہ میں اسے ہندوؤں تک پہنچا دوں اور وہ اس کی اپنی مذہبی رسم کے مطابق کریا کرم کریں۔

درانی سردار نے اختلاف کیا "نہیں ہم یہ لاش نہیں دیں گے۔ ہم اس کو سکھا کر افغانستان لے جائیں گے۔"

شاہ نے اس تکرار میں جھگڑے کی بُو محسوس کی۔ اس نے اپنا آخری فیصلہ دے دیا "لاش شجاع الدولہ کی معرفت ہندو برہمنوں کے حوالے کی جائے اور ہماری ذاتی فوج کا ایک دستہ ساتھ رہے۔ تاکہ اس کے کریا کرم میں کوئی درانی سردار دخل نہ دے سکے۔ ہمیں رسول مقبول کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہئے۔ جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ دوسری قوموں کے ان سرداروں کی عزت کرو، جو ذلت میں مبتلا ہو گئے ہوں"۔

سداشیو بھاؤ کی لاش بھی مل گئی اور اسے بھی برہمنوں کے حوالے کر دیا گیا اور انہوں نے اپنی مذہبی رسوم کے مطابق اس کی آخری رسوم ادا کیں۔

اس کے بعد شاہ اپنی افواج کے ساتھ دہلی میں داخل ہو گیا۔

ایک صبح جبکہ عرفان اپنی عادت کے مطابق ہوا خوری میں مصروف تھا۔ ایک پیپل کے نیچے، ایک جانی پہچانی لڑکی جل پھول چڑھاتی نظر آئی۔ عرفان دھڑکتے ہوئے دل سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو دور ہی چھوڑ دیا اور پیدل چل کر اس کے قریب پہنچ گیا، آہستہ سے بولا "لیلاوتی! یہ تم ہو؟"

لیلاوتی نے وحشی ہرنی کی طرح پلٹ کر عرفان کو دیکھا۔ اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

عرفان نے کہا "بسواس راؤ مارا گیا!"

لیلاوتی نے عالم خواب میں جواب دیا "اچھا"

عرفان نے کہا "لیلاوتی ہم افغانستان جا رہے ہیں۔ کیا تم ساتھ چلو گی؟"

لیلاوتی نے جواب دیا "نہیں میں اپنی جنم بھومی واپس جاؤں گی!"

عرفان نے کہا "افغانستان میں بہت سے ہندو رہتے ہیں، تم بھی انہی کے ساتھ رہنا"

لیلاوتی نے آنکھیں بند کر لیں، کہنے لگی "ایسی قربت کا آخر کیا فائدہ جو ہمیشہ دو دلوں میں آگ لگاتی رہے"

"چاچا گردیال کہاں ہیں؟"

"گھر پر"

"کہاں ٹھہری ہو؟"

"وہ سامنے مندر کے پیچھے"

"کیا تم مجھے اپنے گھر لے چلو گی؟"

"چلنا"

اور دونوں اسی وقت ایک ساتھ روانہ ہو گئے۔ جب وہ دونوں گھر پہنچے تو عرفان باہر ہی ٹھہر گیا۔ لیلادتی اندر چلی گئی۔ چاچا گردیال نے اسے دیکھتے ہی کہا "لیلادتی! رام راج کا سندر سپنا بکھر گیا۔ لوگ اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ تیرا کیا خیال ہے؟"

"گھر واپس چلو!" لیلادتی نے کرب سے جواب دیا۔ پھر باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "باہر افغان نوجوان ہم سے ملنے آیا ہے۔"

"اچھا! چاچا گردیال گھبرا گئے۔ اب یہ کیوں آیا ہے۔"

لیلادتی نے مختصر سا جواب دیا۔ "اپنے وطن افغانستان جانے سے پہلے آخری بار ہم سے ملنا چاہتا ہے۔"

چاچا گردیال نے عرفان کی اس طرح پزیرائی کی جس طرح محکوم حاکم کی کرتے ہیں۔

گردیال دونوں کی دلی کیفیات سے آگاہ تھا۔ اس نے انہیں تنہائی فراہم کی۔ باہر جاتا ہوا بولا.....

"میں ابھی آتا ہوں"، پھر بطور خاص لیلادتی سے مخاطب ہوا۔ بیٹی لیلادتی! یہ نہ بھولنا کہ ہمیں جلدی ہی پونا واپس جانا ہے۔"

جب تخلیہ ہو گیا تو عرفان نے دریافت کیا "لیلادتی! کیا واقعی تم پونا واپس جا رہی ہو۔"

"ہاں"! لیلادتی آنکھیں نہ ملا سکی "میں نے وہیں جنم لیا ہے۔ وہیں کی آب و ہوا میں میرا شریر روان چڑھا۔ وہ میری جنم بھومی ہے۔ وہیں کی خاک سے اٹھی ہوں۔ وہیں کی خاک میں مل جاؤں گی۔"

عرفان نے کہا "کیا اس فیصلے کو بدل نہیں سکتیں"

"نہیں" لیلادتی کے جی میں آئی کہ کہہ دے۔ خواب میں برم دیو نے میرا تجھ سے وداہ کر دیا ہے۔ تو میرا پتی دیو ہے۔ اس جنم میں نہیں تو اگلے جنم میں ہم دونوں ضرور ایک ساتھ ہو جائیں گے۔ صبر کر دصبر۔ اس جنم سے دوسرے جنم تک۔ جب ہم دونوں ہی کسی ایک دھرم کے پیرو ہوں گے۔ جب ہم دونوں کا شاندار سنگم ہو گا۔

"سوچ کیا رہی ہو"۔

لیلاوتی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ بولی "میں نے سوچا تھا تمہارے لئے میں اپنا دھرم چھوڑ دوں گی۔ لیکن جب تم نے یہ کہا کہ تمہارے لئے میرا ایسا اسلام قابل قبول نہیں ہے۔ جو تمہاری محبت میں اختیار کیا گیا ہو۔ میں سوچتی ہوں کہ تمہاری یہ بات خاصی وزنی ہے۔"

"اچھا!" عرفان نے باؤلوں کی طرح کہا اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس نے جیب سے لیلاوتی کا وہ رومال نکالا جس کے ایک کونے میں انگوٹھی بندھی ہوئی تھی۔ اسے لیلاوتی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا "یہ تیری امانت تجھے واپس ہے۔"

لیلاوتی نے بلا سوچے سمجھے رومال واپس لے لیا۔

عرفان نے کہا "لیلاوتی! جب تک میرے پاس یہ رومال تھا دل میں تجھے پا لینے کی امید زندہ تھی۔ ابھی ابھی جب میں تجھے رومال واپس کر رہا تھا تو میرا خیال تھا کہ تو اسے واپس پھینکے گی لیکن جب تو نے اسے بلا پس و پیش واپس لے لیا تو دل میں موجود امید کا کمزور دھاگہ یک لخت ٹوٹ گیا۔" اس کے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ افغانی اکھڑ پنے سے بولا "اب میں جا رہا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہماری یہ آخری ملاقات ہے۔"

لیلاوتی اس اچانک اختتامیے کو حیرت اور حسرت سے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ عرفان باہر نکلا اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر درّانی لشکر میں واپس چلا گیا۔ لیلاوتی دروازے کی جھری سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی اگر عرفان نے اُسے پلٹ کر دیکھا ہوتا۔ تو وہ ماضی کی طرح آج بھی دروازے کی جھری میں لیلاوتی کی سرخ جھلکی ضرور دیکھتا۔

لیلاوتی اپنے چچا گردیال کے ساتھ پونا واپس چلی گئی۔ یہاں کی مانوس اور آشنا ہوا میں بڑی گھٹن تھی۔ سائیں سائیں کرتی ہوائیں اس کے دل میں نشتر سے اتار دیتیں۔ یہاں ایک اور اعظیم المیہ اس کا منتظر تھا۔ جس پیپل کے درخت کی جڑ میں جل پھول چڑھانے کے دوران اس کی افغان نوجوان سے محبت پروان چڑھی تھی اسے اس کی عدم موجودگی میں آسمانی بجلی نے گرا دیا تھا۔ اب وہاں جلی جھلسی صرف جڑ موجود تھی لیلاوتی کے لیے یہی بہت کافی تھی۔ ہر روز پابندی کے ساتھ وہاں جاتی اور اس کی جڑ میں پھول چڑھا آتی بس اسے اپنے برم دیو سے ایک ہی شکایت تھی وہ یہ کہ انہوں نے اس کے حق میں بڑے جبر کا فیصلہ کیا تھا۔ خواب میں اس کا عرفان سے وداع تو کر دیا تھا۔ لیکن سنگم اور ملاپ کو دوسرے جنم پر رکھ دیا تھا۔

بزدل کا قصۂ عبرت

بس اپنے تھکے ہوئے گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اپنی قلعہ نما حویلی میں داخل ہوا۔ اس وقت دن کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے دیکھتے ہی میرے غلام بے تحاشا میری طرف بڑھیں گے اور پوری حویلی میں شادمانی کی زبردست لہر دوڑ جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ جب میں حویلی کے پھاٹک سے گزر کر اس کے صحن میں داخل ہوا تو ایک طرف سے حویلی کا خواجہ سرا شریح نمودار ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بالکل میرے گھوڑے

کے قریب آگیا۔ وہ مجھے پہچان نہیں سکا۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ اس وقت میں اتنی خراب اور خستہ حالت میں تھا کہ وہ تو وہ، میری ماں تک نہ پہچان سکتی، میرے ضرورت سے زیادہ بڑھے ہوئے بال، میلے اور بوسیدہ کپڑے، تباہ حال صحت یہ ساری علامتیں ایسی تھیں کہ کوئی بھی ہمیں نہ پہچان سکتا تھا۔

خواجہ سرا شریح میرے گھوڑے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور تیوری چڑھا کر بولا "کون ہو جی، یہ کہاں گھسے چلے آرہے ہو؟"

میں گھوڑے سے کود پڑا اور فرطِ رنج سے شریح کو گلے لگالینا چاہا لیکن وہ یہ سمجھا کہ شاید میں کوئی دشمن ہوں جو اس پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ اس نے مجھے ایک زوردار دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس نے مجھے بے بس کر دیا اور اپنا خنجر ہوا میں لہراتے ہوئے دریافت کیا "سچ بتا تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟ اگر جھوٹ بولا تو اسی وقت قتل کر دوں گا۔"

میں نے گھبرا کے جلدی جلدی کہا "شریح! تم مجھے نہیں پہچانتے اپنے آقا زادے سہیل کو.....؟ میں سہیل ہوں۔"

خنجر والا ہاتھ جھک گیا اور شریح گھبرا کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ "سہیل؟ — تم واقعی سہیل ہو؟"

"ہاں بابا میں سہیل ہی ہوں!" میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس ادھیڑ عمر خواجہ سرا کی بینائی صحیح کام نہیں کر رہی۔ لیکن اس نے میری آواز سے کسی قدر مجھے پہچان ضرور لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شرمندگی اور خجالت کی ہنسی نمودار ہوئی اور فوراً ہی غائب بھی ہوگئی۔ "بہت دیر لگائی تم زندہ ہو؟ لوگ تو تم سے مایوس ہو چکے تھے۔ اچھا اس وقت تو تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ کسی نے تمہیں دیکھا تو نہیں؟"

میں اس کی ان پراسرار باتوں سے پریشان ہونے لگا۔ "بابا! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ میں کہیں کیوں چلا جاؤں؟"

شریح واقعی بہت پریشان تھا۔ ادھر ادھر چندھیائی آنکھوں سے دیکھا اور پریشانی سے بولا "میرا کہنا مانو سہیل! تم اسی وقت یہاں کی سرائے میں چلے جاؤ اور وہیں قیام کرو۔ میں آکر تم سے مل لوں گا اور تمہیں ساری تفصیل بتا دوں گا۔"

میں بالکل قلاش تھا 'مفلس'، میں نے کہا۔ "لیکن میں بالکل مفلس ہوں، قلاش۔ کیا تمہیں میرے حلیے سے اس کا اندازہ نہیں ہوتا؟"

اس نے فوراً جواب دیا۔ "تم فکر نہ کرو، فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر حویلی کے باہر چلے جاؤ۔ میں باہر تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں، اور ہاں ذرا آس پاس یہ ضرور غور کر لینا کہ کسی نے تمہیں دیکھا تو نہیں؟"

میں خاموشی سے اپنے گھوڑے پر دوبارہ سوار ہو گیا اور اس کا رُخ موڑ کر حویلی کے باہر ہو گیا۔ وہاں تو بالکل سناٹا تھا۔ میں نے غور سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں مجھے دیکھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ باہر میں سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد خواجہ سرا سر تا سر اپنے چہرے کو چادر میں چھپائے میرے پاس سے گزرا اور کوئی بات کئے بغیر ایک تھیلی پھینکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے تھیلی اٹھائی اور گھوڑے کی باگ سرائے کی طرف موڑ دی۔ راستے میں مجھے ڈھیلے ڈھالے لبادوں میں ڈھکے ہوئے کئی ایسے آدمی نظر آئے جنہیں میں پہچانتا تھا لیکن شاید وہ مجھے نہیں پہچان سکے اور اس وقت مجھے اس کا صحیح احساس ہوا کہ میں کس حد تک بدل چکا ہوں۔

میں سیدھا سرائے پہنچا اور ایک مسافر کی طرح اس میں ٹھہر گیا۔ اس دن میرا دل بہت گداز ہو گیا تھا اور مجھے رہ رہ کر رونا آتا تھا۔ میں پچھلے ایک سال سے مسلسل گردش میں تھا۔

نشیب و فراز تو انسان کا مقدر ہیں لیکن میں ان کا کچھ زیادہ ہی شکار رہا ہوں۔ میرے والد سلطان الپ ارسلان سلجوق کے ندیم تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، مزاج شناسی، حاضر جوابی اور حاضر دماغی ضرب المثل تھی۔ خواجہ بزرگ جنہیں دنیا نظام الملک طوسی کی حیثیت سے جانتی ہے والد کی ان خصوصیات کے بڑے معترف تھے۔ اصفہان اور قزوین کے درمیان ہماری جاگیر میلوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ چونکہ گھر میں دولت کی فراوانی تھی اس لئے یار دوست بھی مکھیوں کی طرح ہمارے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ زمانے کے دستور کے مطابق میں نے تعلیم حاصل کی تھی اور فنِ سپاہ گری اور شہسواری بھی سیکھا تھا۔ والد صاحب کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں بھی شاہوں کے دربار کا رُخ کروں اور اپنی قسمت آزما کے دیکھوں لیکن مجھے شاہوں کی صحبت کے تصور ہی سے وحشت ہوتی تھی شاہی آداب اور تکلفات مجھے اپنی طبعِ آزاد کے لئے ایک مصیبت محسوس ہوتے تھے۔ دوسرے مجھے شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور لڑائی جھگڑے سے دُور بھاگتا تھا۔ کسی دربار سے وابستگی کا یہ مطلب تھا کہ مجھے ہر وقت جو مکھی جنگ کے لئے آمادہ و تیار رہنا چاہئے اور یہ بات میری فطرت اور مذاق کے خلاف تھی۔

مجھے سیر و تفریح کا بھی بے حد شوق تھا۔ حسین قدرتی مناظر میری سب سے بڑی کمزوری تھے چنانچہ ایک سال پہلے جب مجھے میرے چند دوستوں نے اس پر مجبور کیا کہ میں خراسان اور ماورا النہر کے حسین علاقوں کی سیر کروں تو میں والد اور والدہ کی مرضی کے خلاف چھپ کر گھر سے فرار ہو گیا۔ بشیرا

ساتھ لے گیا تھا، جن میں سے کچھ خرچ ہوئے اور کچھ چوری ہو گئے۔ اس چوری میں بھی دوستوں ہی
تھا۔ جب پاس کچھ نہ رہا تو دوستوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ میں اِدھر اُدھر کے دھکّے کھاتا، قلاش
ب گھر واپس آیا تو میرا حلیہ ہی بدل چکا تھا۔ پریشانیوں، مصیبتوں اور پے در پے صدمات نے میری
الگ تباہ کر دی تھی۔ جب حویلی میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ بدقسمتی اب بھی ساتھ ہے۔ یہ بدقسمتی
غی کہ اپنے وطن میں پہنچ کر بھی سرائے میں ٹھہرنے پر مجبور رہا۔
یں شریح کا کئی دن تک انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آیا۔ میں سارا سارا دن سرائے کے کمرے
ا رہتا۔ باہر بھی نہ نکلتا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں جھگڑوں سے بہت بچتا ہوں میں
ہ کسی بھی طرح اپنی حویلی واپس جاتا اور وہاں کسی ترکیب سے شریح سے ملنے کی کوشش کرتا لیکن
الات میں شریح نے مجھے واپس کیا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں میری جان کو خطرہ ضرور
ں نے سوچا کہ اگر شریح ایک دن اور نہ آیا تو میں اپنے چچا کے پاس چلا جاؤں گا جو یہاں کی غربی
میں رہتے تھے۔ ان سے تفصیلات معلوم کر لوں گا اور سب کے آخر میں اصفہان کا رُخ کروں گا
والد صاحب سلجوق سلطان کی ندیمی کی خدمات انجام دے رہے تھے لیکن رات کو عشاء کے
یح میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے چپ چاپ سرائے سے باہر ایک ویرانے میں لے گیا اور وہاں بتلایا
ر صاحب کا اصفہان میں انتقال ہو گیا اور والدہ کو چچا نے زہر دے کر ہلاک کر دیا اور مجھے مُردہ قرار
۔ پوری حویلی اور جاگیر پر قابض ہو چکے ہیں، شریح نے مجھے یہ بھی بتایا کہ چچا نے اگر کہیں میری جھلک
ے لی تو قتل کرا دیں گے۔ میں بہت گھبرا گیا۔
س نے والد مرحوم کا ایک خط میرے حوالے کیا اور افسوس سے کہا "سہیل! تم بہادر نہیں ہو، تم
ں سے بچتے ہو لیکن تمہیں ایک نہ ایک دن دُنیا کے جھگڑوں میں پڑنا ہی پڑے گا۔ جھگڑوں میں نہ
ا یہ مطلب ہے کہ تم زندگی کی ہر بازی ہارتے رہو۔ تم کہاں تک ہارو گے، ایک نہ ایک دن تو جیتنے
۔ کرنا ہی پڑے گی۔"
مجھے والد اور والدہ کی موت کا غم اور چچا کی بدبختی پر افسوس ہوا۔
ں نے شریح سے دریافت کیا "اور افشید کیسی ہے؟ کبھی ہمیں یاد بھی کرتی ہے؟"
شریح نے فکر مندی سے جواب دیا "کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ سُنتا تو یہی ہوں کہ تمہیں بہت یاد کرتی
جس نے تمہاری ماں کو ہلاک اور حویلی اور جاگیر پر قبضہ کر لیا ہو، اس کی بیٹی پر تم کس طرح
کر سکتے ہو۔"
شریح ٹھیک ہی کہتا تھا۔ افشید چچا کی لڑکی تھی اور ہم دونوں کی نسبت بچپن ہی سے طے تھی۔ چچا

کی یہ کتنی کم ظرفی تھی کہ وہ اپنے ہونے والے داماد کے خلاف یہ سب کر رہے تھے۔ میں نے کہا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے جب آفشید سے میری شادی ہو جائے گی تو میرا سب کچھ جائے گا۔"

شریح میری بات پر طنزیہ ہنسی ہنسا "شادی؟ کیسی شادی اور کس کی شادی؟ اب اتم سے نہیں کسی اور سے ہوگی۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور پھر آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی۔ میں اس محبت کرتا تھا۔ اس کا معصوم اور اداس چہرہ نظروں میں گھوم گیا اور پھر ایسا محسوس ہوا کہ مجھ سے دور اور دور، بہت دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا

"صرف دو تدبیریں ہیں۔" شریح کی آواز سنائی دی۔ "یا تو تم خود ہمت سے کام لو اور سامنے آکر اپنے چچا کا مقابلہ کرو اور اسے ٹھکانے لگا دو۔ اس میں تمہیں کسی اور سے زیادہ اپنے بازو پر بھروسا کرنا پڑے گا اور اگر یہ بات تمہارے حوصلے اور بس کی نہیں ہے تو پھر تم اصفہان اور وہاں خواجہ بزرگ سے ملنے کی کوشش کرو۔ اسے ان حالات سے مطلع کرو، وہ خود ہی تم کرے گا اور تمہارے چچا کو بے دخل کر کے تمہاری جائیداد اور جاگیر پر تمہیں قابض کرا دے گا۔"

تدبیریں تو دونوں ہی شاندار تھیں لیکن دونوں میں کچھ قباحتیں بھی تھیں۔

چچا کے سامنے کھلم کھلا پہنچ کر مقابلہ کرنے کا یہ مطلب تھا کہ میں بلا وجہ اپنی جان سے لوں۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس کام کے لئے کچھ دوست پیدا کرتا اور ان کی مدد سے اپنے تمام کر دیتا۔ لیکن دوستوں سے جو تلخ تجربہ ہو چکا تھا اس سے اس بات کا پورا پورا اندیشہ تھا وقت پر ہم سے دھوکا کر جائیں اور چچا انہیں حرص و طمع میں لا کر ہمارے ہی خلاف استعمال گویا یہ تدبیر تو بالکل ہی فضول اور سخت خطرناک تھی۔

اب رہی دوسری تدبیر کہ خواجہ بزرگ سے مل کر چچا کے خلاف کوئی کارروائی کروائوں۔ عمل بڑا دشوار تھا۔ پھر وہی دربار سرکار کی باتیں، میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ دربار سرکار کے خلاف ہیں۔ خواجہ بزرگ کوئی معمولی آدمی تو نہیں تھا۔ سلجوق حکومت کا وزیر اعظم، میں نے کیا کہ اوّل تو اس کے پاس تک رسائی ہی بہت دشوار ہے اور اگر کسی طرح وہاں تک پہنچ بھی بزرگ آدمی اتنا عقلمند اور صاحب مرتبہ ہے کہ اس کی اقبالمندی میری زبان کو گنگ اور حواس کو پریشان کر دے گی اور وہاں پہنچ کر اگر میں اپنے مقدمے کو صحیح طرح سے نہ

نئی مصیبت میں مبتلا ہو جانے کا الگ اندیشہ ہے۔ چنانچہ یہ دوسری تدبیر بھی میرے قابلِ عمل نہ تھی۔
یح نے دریافت کیا۔ "پھر کس تدبیر پر عمل کرو گے؟ کیا سوچا؟"
گول مول جواب دیا۔ "تمہاری بتلائی ہوئی پہلی تدبیر تو بالکل ہی ناقابلِ عمل ہے۔
ی تدبیر، تو اس میں کئی ایسی رکاوٹیں موجود ہیں کہ جب تک ان پہ قابو نہ پایا جائے قابلِ عمل
سکتی۔"
یح نے پوچھا۔ "مثلاً! کون سی رکاوٹیں ہیں شاید میں انہیں دور کر سکوں۔"
نے جواب دیا۔ "پہلی رکاوٹ تو یہ ہے کہ اس وقت میں بالکل مفلس ہوں۔ اصفہان
ے اور وہاں نامعلوم مدت تک قیام کرنے کے لئے دولت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہمیں
علوم کہ خواجہ بزرگ کی ملاقات کتنی مدت بعد ہوگی۔ دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ کیا خواجہ بزرگ
جانے پر ہماری بات سنے گا بھی۔ اگر اس نے ہمیں یوں ہی ٹال دیا تو پھر کیا ہوگا؟"
یح کچھ اکتا کر بولا۔ "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم میں ہمت کی کمی ہے، ہمت کرو ہمت۔
ی مسائل سے اسی طرح بھاگتے رہے تو صاحبزادے یہ یاد رکھو کہ کچھ لوگ تمہارے تن کے
اتروا لیں گے۔"
نے اس موضوع ہی سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہی، میں نے کہا۔ "شریح! کیا تم کسی طرح
ی آمد سے مطلع کر کے مجھ سے ملا سکتے ہو؟"
نے غم اور غصے کا اظہار کیا۔ "تم کتنے نادان ہو سہیل! کیا تمہیں یہ یقین ہے کہ افشید اپنے باپ
ہو جائے گی؟"
مجھ سے محبت کرتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یقیناً جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں واپس
وہ چوری چھپے مجھ سے ملنے ضرور آئے گی اور اس وقت ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے باپ
ہمیں کوئی ایسی تدبیر بتا دے جو ہمارے لئے ان دونوں تدبیروں سے زیادہ سودمند ثابت ہو۔"
یح نے چڑ کر کہا۔ "یہ ساری عمل سے بھاگنے کی باتیں ہیں، سہیل! دنیا میں باعزت اور
ندگی گزارنا ہے تو تمہیں ہمت، استقلال اور عمل کا سہارا لینا ہی پڑے گا۔ اگر تم میری بتائی
ں سے فلاح نہ پا سکے تو یہ بھی یاد رکھو کہ افشید کا نرم و نازک اور کمزور آنچل بھی تمہیں
سکے گا۔"

میں نے شریح کی آزردگی اور غصے کو رفع کرنے کی خاطر کہہ دیا! "میں اصفہان چلا جاؤں گا اور وہاں خواجہ بزرگ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اس کے لئے دولت کی ضرورت ہے۔ کس طرح انتظام ہوگا؟"

شریح نے کہا: "اس کی فکر تم نہ کرو، تمہاری ماں کی کچھ امانتیں میرے پاس ہیں۔ ان سے انتظام بھی کر دوں گا۔ اور ہاں جب تم اصفہان پہنچ جاؤ تو وہاں کے قاضی حمید سے بھی ملنا۔ تمہارے والد مرحوم نے اس کے پاس دیناروں کے چھ کلسے امانتہً رکھوائے تھے کہ ان کی موت کے بعد تم کو دے دیئے جائیں۔ تمہارے والد مرحوم کو تمہاری کم ہمتی کا ہمیشہ ہی افسوس رہا۔ اسی کے پیش نظر یہ امانت قاضی کے پاس رکھوائی تھی۔"

ابھی ہماری باتیں جاری ہی تھیں کہ ہمیں اپنے پیچھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں کہیں دور سے آ رہی تھیں لیکن دم بدم ہم سے قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ شریح نے کچھ نہیں کیا سوچا کہ درخت پر چڑھنے لگا اور مجھے بھی حکم دیا کہ فوراً درخت پر چڑھ جاؤ۔ میں نے اس کی تعمیل کی اور فوراً درخت پر چڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد یہ سوار ہمارے درخت کے سامنے سے گزرے۔ یہ پانچ تھے اور سرائے کی طرف جا رہے تھے۔ جب یہ نکل گئے تو شریح نے کہا: "میرا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ جانتے ہو یہ کون تھے؟"

میں نے سادگی سے جواب دیا: "نہیں۔ یہ کون تھے؟"

اس نے جواب دیا: "تمہارا چچا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی شبہے کی تلافی میں یہاں تک آیا ہے۔ اسے ضرور کسی قسم کی سن گن مل گئی ہے۔"

میری تو جان ہی نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی شریح نیچے اترنے لگا اور بولا: "سہیل! میں واپس جا رہا ہوں۔ کل کسی وقت پھر ملوں گا۔ تم خوب اچھی طرح اطمینان کر کے واپس جانا۔ ان بھیڑیوں سے بچو، یہ تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ انہیں ضرور کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے۔"

میں تنہائی اور اکیلے پن سے بہت خوفزدہ تھا۔ لیکن شریح کو روک نہیں سکا۔ وہ چلا گیا اور میں درخت پر تنہا رہ گیا۔ مجھے جانے والوں کی واپسی کا انتظار تھا۔

کافی دیر ہو گئی لیکن وہ لوگ واپس نہیں آئے۔ خوف کی وجہ سے میرا برا حال تھا۔ کچھ فاصلے پر آتشکدوں کی ویران عمارتیں کھڑی تھیں۔ میرا دل خود بخود ان کی طرف کھنچنے

نے سوچا کہ جب وہ لوگ واپس چلے جائیں گے تو میں سرائے واپس جانے کے بجائے کسی ویران آتشکدے میں پناہ لوں گا۔

اس وقت مجھے دولت، جائیداد اور جاگیر سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ ہر وہ چیز جس سے جان کو خطرہ ہو بے کار اور فضول ہے۔ دل میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ میں نیچے اتروں اور ہمت کر کے چچا کے پاس پہنچ جاؤں اور بخوشی سب کچھ ان کے حوالے کر کے پُرسکون زندگی گزاروں لیکن اس میں بھی اطمینان نہ تھا کیونکہ یہ ضروری نہ تھا کہ چچا میرے خلوص پر یقین ہی کر لیں۔

دیر بعد گھوڑوں کی ٹاپیں پھر سنائی دیں اور جب وہ لوگ ہمارے قریب سے گزرے تو آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چلے جانے کے کافی دیر بعد میں نیچے اترا۔ بیٹھے بیٹھے میرے پیر اکڑ گئے تھے۔ میں نے انہیں کئی جھٹکے دیئے اور سرائے واپس جانے کے بجائے آتشکدوں کی چوکور عمارتوں کی طرف چھپتا چھپاتا روانہ ہو گیا۔ جب میں ان کے قریب پہنچ گیا تو ان میں جو سب سے زیادہ شکستہ تھا اس کو اپنا مسکن بنایا۔ یہ نیچے سے چوڑی اور اوپر سے پتلی عمارت میرے لئے قلعہ تھی جس میں میں پناہ گزین ہو گیا۔

آج جب میں اپنے ماضی کے اس دور پر غور کرتا ہوں تو نہایت شرم آتی ہے اور اپنی دون ہمتی، بزدلی اور غیر مستقل مزاجی پر لعنت بھیجنے لگتا ہوں۔ خوفزدگی کا یہ عالم تھا کہ میں نے پوری رات اس ویران آتش کدے میں جاگ کر گزار دی، صبح جب سورج طلوع ہوا اور ہر شے منور ہو گئی تو مجھے اپنی حماقت پر اور افسوس ہوا۔ اب دن کی روشنی میں تو اور بھی نہ نکل سکتا تھا۔ بھوک نے الگ ستا رکھا تھا۔ آس پاس کی کسی آہٹ پر کان لگائے دیوار سے پشت ٹیکے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر بدقسمتی سے خواجہ سرا شریح میری عدم موجودگی میں سرائے میں پہنچے گا تو معلوم نہیں میری عدم موجودگی کا کیا مطلب لے گا کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں اپنی بزدلی کے زیر اثر فرار ہو چکا ہوں اگر ایسا ہوا تو یہ میری سب سے بڑی بدقسمتی ہو گی کیونکہ مجھے رقم کی شدید ضرورت تھی۔ اور شریح نے اسے پہنچانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اس رقم کو پا لینے کے بعد ہی میں کوئی منصوبہ بنا سکتا تھا۔ اس فکر و تردد میں آدھا دن گزر گیا۔

میں آہستہ سے اٹھا اور دھیرے دھیرے آتش کدے کے دروازے پر جا کر چوروں کی طرح جھانک کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ باہر بڑی تیز دھوپ تھی۔ ایک چرواہا اپنے مویشیوں کو لئے ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں بدحواس ہو گیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ چرواہا مجھے ضرور پہچان لے گا

موجودگی کی اطلاع میرے چچا کو دے گا۔ یکایک مجھ میں حوصلہ پیدا ہوا اور میں نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر اس نے دھوپ سے بچنے کے لئے یہاں پناہ لینا چاہی تو میں یقیناً اچانک حملہ کر کے اسے قتل کر دوں گا۔ لیکن پھر فوراً ہی میں اس تردد کا شکار ہو گیا کہ جب اس کے مویشی اپنے چرواہے کے بغیر ادھر اُدھر بھٹکیں گے تو لوگوں کو چرواہے کی جستجو ہو گی اور اس کی تلاش میں یہاں کا کونا کونا چھان مارا جائے گا اور پھر لوگ یہاں بھی آ جائیں گے اور مجھے چرواہے کی لاش سمیت دریافت کر لیں گے۔ پورے علاقے میں اس کا تشہیر ہو گا۔ لوگ مجھے تماشے کی طرح دیکھنے آئیں گے۔ ان میں میرا چچا بھی ہو گا۔ جو یقیناً مجھے اس حال میں دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ یہاں تک پہنچ کر میں اپنے ارادے سے باز آ گیا لیکن چرواہا برابر ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ میں بہت بدحواس ہو گیا۔ اب میری اس ویران آتش کدے میں موجودگی خطرے سے خالی نہ تھی۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لئے جیسے ہی اندر داخل ہوا میں چپکے سے باہر نکل گیا۔ چرواہا میری طرف لپکا۔ اس کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا لیکن میں اس طرح تیز تیز چلتا رہا گویا بہرا ہوں اور کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ مجھے شاید دیوانہ سمجھا ہو گا کیونکہ میرے پیچھے دوڑا نہیں۔ دل میں بار بار یہی آتا تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھوں چرواہے کی کیا حالت ہے لیکن اس ڈر سے باز رہا کہ چرواہا میرے فوراً سے بھی التفات پر میرا پیچھا کرے گا اور اس سے جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔

اب سرائے کے علاوہ میری کوئی منزل نہ تھی میں تیز تیز قدم اٹھاتا سرائے کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اپنے پیچھے گھوڑے کے دوڑنے کی آواز آنے لگی۔ اب میں بھاگنے پر مجبور تھا۔ میں سراسیمہ و حواس باختہ سرائے کی طرف بھاگنے لگا۔

لیکن گھڑ سوار نے مجھے جلدی ہی پکڑ لیا۔ بالکل میرے سر پر آ کر گھوڑا روک دیا اور کود کر نیچے آ گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اور اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ شاید کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ غالباً یہی کہہ رہا ہوں گا کہ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ للہ مجھے چھوڑ دو مجھے کچھ نہیں چاہیئے دولت، جاگیر، حویلی، مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔"

لیکن سوار نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مجھے گھیر ہی لیا۔ اس نے اپنی دمشقی تلوار کھینچ لی اور مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے مزید مزاحمت کی یا بھاگنے کی کوشش کی تو وہ قتل کر دے گا۔ میں سہم کر کھڑا ہو گیا اور کنکھیوں سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ شکل میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ اس کی عمر کوئی تیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ پیروں میں معمولی چپل تھی اور پاجامہ قمیض کے علاوہ جسم سے ایک چادر بھی لپٹی ہوئی تھی، جسے کمر کے گرد ایک پٹکے سے باندھ دیا گیا تھا۔ سر پر معمولی ٹوپی تھی اور ٹوپی کے اندر

رومال نکلا ہوا تھا۔ اس کے لباس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی معمولی آدمی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے سارے کپڑے چونکہ گرد و غبار میں اٹے ہوئے تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ لمبی مسافت طے کر کے چلا آرہا ہے۔

اس نے نہایت شریفانہ لہجے میں کہا: "تم گھبراؤ نہیں، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں، دوست ہوں۔"

ایک بار پھر میں نے اپنے حافظے پر زور دیا لیکن کچھ یاد نہ آیا کہ یہ ہمارا کب اور کہاں کا دوست ہے۔

اس نے مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ یہاں سے بریدہ کی منزل کتنی دور ہے۔ میں اس نواح میں نیا آیا ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی سرکارہ، ہرکارہ ہے جو اس منزل کی تلاش میں ہے جہاں سرکاری اور غیر سرکاری خطوط آیا کرتے ہیں۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے اسے زبانی پتا سمجھانا چاہا لیکن اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ چل کر وہ جگہ دکھا دوں۔ میں نے ایک نظر اس کے گھوڑے پر ڈالی۔ اس پر سرکاری داغ کا نشان موجود تھا۔ ان تمام اطمینانی علامتوں کے باوجود میرا دل اندر سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ میرے چھپانے مجھے پھانسنے کا کوئی اچھا سا جال بچھایا ہو۔ میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا لیکن وہ تو ایک ہی ضدی نکلا۔ ساتھ چلنے پر اتنا مصر ہوا کہ میں پیچھا نہ چھڑا سکا۔ میں نے نیا عذر پیش کیا۔ "افسوس کہ میرے پاس گھوڑا نہیں ہے اور تمہاری منزل یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم تنہا ہی چلے جاؤ۔ بہت آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔"

"لیکن میں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔" اس نے تلوار کی نوک میرے سینے میں آہستہ سے چبھو دی۔ "دیر مت کرو۔ آؤ میرے گھوڑے پر آگے بیٹھ جاؤ۔"

عجیب مخمصے سے پالا پڑا تھا۔ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ میں نے یقین کر لیا کہ یہ ضرور میرے کافر ستادہ ہے جو مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتا ہے۔ اجنبی کے لہجے کی ڈپٹ اور تلوار کی نوک نے مجھے اس کے گھوڑے پر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اگر میں اپنی گفتگو کو اور طول دیتا تو اس بھی خطرہ تھا کہ میں راہگیروں کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔

میرے بیٹھتے ہی وہ خود بھی میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ جب میں نے گھوڑے کو لگام کی حرکت سے یا تو میں نے دیکھا کہ چرواہا دور سے ہمیں دیکھ رہا تھا جو یقیناً یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں کسی کا مفرور ہوں جسے گرفتار کر کے لے جایا جا رہا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ ہم دونوں یکے بعد دیگرے گھوڑے سے اترے۔ وہ

ہمیں ساتھ لئے ہوئے بریدخانے میں داخل ہوا۔ ایک سائیس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑی اور اسے ایک طرف لیئے چلا گیا۔ مہتمم بریدخانہ نے خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے میرے ساتھی کا استقبال کیا۔ اس نے ایک سوالی نظر ہم پر بھی ڈالی۔ میرے ساتھی نے نظروں ہی نظروں میں اسے کیا جواب دیا کچھ پتا نہ چلا۔ لیکن بعد میں اس نے ہم سے بھی اسی خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا اور ہم دونوں کو ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ کمرہ آرام و آسائش کے بہترین سامان سے سجا ہوا تھا۔

میرے ساتھی نے مجھے حکم دیا کہ میں تھوڑی دیر یہاں آرام کروں وہ اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر میں واپس آ رہا ہے۔ میں رات بھر کا جاگا اور تھکا ہوا تھا۔ بھوک بھی شدت کی لگ رہی تھی۔ غالباً میرے ساتھی نے میری ان کیفیات کا اندازہ کر لیا تھا۔ میں اسے دکھانے کو بستر پر لیٹ گیا لیکن جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ باہر سے بند تھا۔ اب تک جو کچھ پیش آیا تھا، خطرات سے بھرپور تھا۔ لیکن واپس آ کر جیسے ہی بستر پہ بیٹھا کسی نے باہر سے کمرے کے دروازے کو دھکا دیا وہ کھل گیا۔ ایک آدمی کھانا لے کر حاضر ہوا اور اسے میرے سامنے رکھتا ہوا بولا "کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کر لو، تمہارا ساتھی ذرا دیر میں واپس آئے گا۔"

گرم گرم مرغن کھانے کی خوشبو نے میرے معدے میں ایک آگ سی لگا دی، کھانا لانے والے سے میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ پانی کمرے میں پہلے ہی سے موجود تھا وہ کھانا رکھ کر واپس چلا گیا۔ اور اس نے میرے کمرے کا دروازہ پھر باہر سے بند کر دیا۔

میں نے اپنے انجام سے بے نیاز ہو کے شکم سیر ہو کے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ غیر معمولی تکان اور کھانے کے نشے نے مجھے جلدی ہی غافل کر دیا۔ نیند نے تمام اندیشوں اور خطرات کو مغلوب کر لیا اور میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز خوابوں کی وادی میں پہنچ گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی اور میرا ساتھی میرے سامنے کے دوسرے بستر پہ دراز کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے بیدار دیکھ کر کتاب ایک طرف رکھ دی اور دریافت کیا "کیا نیند پوری ہو گئی ؟"

میں نے اثبات میں گردن ہلا کر جواب دیا۔ اس نے کہا "تب پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو، باتیں اس کے بعد ہوں گی۔" کمرے سے ملحق ہی غسل خانہ تھا۔ میں نے وہاں اپنا منہ ہاتھ دھویا اور صورت شکل ذرا قرینے کی بنا کے پھر اپنے بستر پر آ بیٹھا۔ وہ بالکل میرے قریب آ بیٹھا اور پوچھا "ہاں اب بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے اور تم خوفزدہ چھپتے چھپتے کیوں پھر رہے ہو ؟"

مجھے صاف صاف سب کچھ بتا دینے میں اب بھی تامل ہی تھا۔ اس نے مزید کہا "تم ضرورت سے

زیادہ کم ہمت اور سہمے ہوئے ہو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ تم بتاؤ تو سہی کہ تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے"
میں نے ہمت کر کے اپنی پوری داستان اسے سنا ہی دی۔ آخر میں میرا دل بھر آیا اور میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ لیکن اس پر میری رقت انگیز داستان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہنسنے لگا۔ "واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ تمہیں اپنے چچا کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو ان چچا کو بھی ٹھکانے لگا دیتا اور اس کی بیٹی سے بیاہ بھی رچاتا۔ بزدل سے بزدل آدمی بھی دولت اور عورت کے لئے بہادر بن جاتا ہے لیکن تعجب کہ تمہیں یہ دونوں چیزیں بھی بہادر نہ بنا سکیں"
میں نے شرم سے اپنی گردن جھکائی اور آہستہ سے جواب دیا۔ "میں حریص نہیں ہوں، نہ دولت کا نہ عورت کا۔ اگر میری تقدیر میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں یہ چیزیں نہیں دلا سکتی"
"احمق!" میرے ساتھی نے حقارت سے کہا۔ "تقدیر اس کا نام نہیں ہے۔ اسے تو بزدلی اور کم ہمتی کہتے ہیں۔ تقدیر تو اس چیز کو کہتے ہیں کہ آدمی اپنے معاملات میں بھرپور کوشش کرے اور اس کے نتائج کو خدا پر چھوڑ دے" لیکن تقدیر کا یہ مفہوم میری سمجھ میں نہ آیا۔
میرے ساتھی نے کہا۔ "میں رات کو تمہارے چچا کے پاس جاؤں گا اور اس سے تمہارے مقدمے کی وکالت کروں گا۔ دیکھتا ہوں کیا جواب دیتا ہے، کوئی بات ہے بھی یا یہ سب محض تمہاری بزدلی ہی کا کرشمہ ہے"
میں اپنے ساتھی کی خوشامد درآمد کرنے لگا کہ میں اس دولت اور جاگیر سے درگزرا میں اپنی بقیہ زندگی کسی گوشہ گمنامی میں جا کر گزار دوں گا۔ لیکن میری موجودگی اور آمد کا علم چچا کو نہ ہو۔ لیکن وہ مجھے شر اور فساد ہی محسوس ہوا۔ وہ تو ہنگامہ کرنے اور کرانے پہ تلا ہوا تھا اور جیسے جیسے وہ اپنے موقف پر اصرار کر رہا تھا۔ مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ اور میری جان نکلی جا رہی تھی، بالآخر جب وہ کسی طرح نہ مانا تو میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں خودکشی کر لوں گا۔
اسے میری اس بات پر غصہ آ گیا کہنے لگا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم ہمت اور حوصلے سے کام لے کر مردانہ وار موت کے بجائے خودکشی کی حرام موت کو زیادہ پسند کرتے ہو۔ میں بھی دیکھوں گا کہ کس طرح خودکشی کرتے ہو۔ میں اسی وقت تمہیں اپنے آدمیوں کی نگرانی میں دے کر تمہارے خلاف قاضی اور محتسب کو مطلع کرتا ہوں، یہ لوگ تمہیں خود ہی سزا دے لیں گے۔ اس کے علاوہ میں تمہارے چچا کو بھی بلائے لاتا ہوں"
میری کم ہمتی سے معاملہ حد سے زیادہ بگڑ گیا تھا۔ میری عقل گم تھی اور فکر نے جواب دے دیا تھا۔

نے میرے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ چھوڑی جس سے خودکشی میں مجھے ذرا سی بھی مدد مل سکتی۔ اس بعد باہر سے مقفل کر کے کہیں چلا گیا۔ جاتے جاتے باہر کسی کو ہدایت کی۔ دیکھو کمرے کے اندر جیسے کسی گڑبڑ کی آواز سنائی دے کمرہ کھول کر فوراً اندر داخل ہو جانا اور اپنے کسی دوسرے ساتھی کی سے اس کے ہاتھ پیر باندھ کے ڈال دینا۔"

میں نے لاکھ کوشش کی کہ حوصلہ پیدا ہو جائے لیکن ناکام رہا مجھے اپنی بے عزتی پر رونا آ رہا تھا میں ش کے خیال سے بھی درگزرا۔ کیونکہ اب اس کا راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی بزدل اور ہمت کے لئے خودکشی بھی آسان نہیں ہے اور یہاں بھی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔

میں ہر طرف سے مایوس ہو کر چپ چاپ بیٹھا متوقع مستقبل پر غور کر رہا تھا کہ اچانک والد مرحوم ہ خط یاد آ گیا جو شریح نے مجھے دیا تھا۔ وہ میری جیب ہی میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے نکالا اور رومی مع کی روشنی میں پڑھنے لگا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"میرے بیٹے سہیل! میرے لئے ہمیشہ یہ بات سوہانِ روح رہی ہے کہ تم خیالی انسان ہو اور ی سے بھاگتے ہو، تم میں مستقل مزاجی کا نقدان ہے لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم گھر میں کسی کو ع کئے بغیر ہی کسی دور دراز سفر پر روانہ ہو گئے تو اور زیادہ دکھ ہوا۔ سیر و سیاحت تو ان کا کام ہے یں خدا نے ہمت، حوصلہ اور استقلال دیا ہے۔ میں تمہارے سفر کے انجام سے خوب واقف ہوں۔ ے وہ دوست احباب جن کے مشورے اور تحریک پر تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے تمہیں بے وقوف اور تمہارے پاس جو کچھ ہے اسے ہتھیا کر دورانِ سفر ہی تمہیں چھوڑ بھاگیں گے۔ اور پھر تمہارا کیا حشر خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے میرے گردے میں تکلیف رہتی ہے۔ علاج کر رہا ہوں، معلوم نہیں کب موت ہو جائے اس لئے یہ چند سطریں تمہیں بطور نصیحت اور بطور مشورہ لکھ رہا ہوں۔ اگر یہ باتیں سمجھ میں نہیں تو ان پر عمل کر گزرنا اور اگر عمل دشوار ہو تو تم جانو اور تمہاری قسمت۔

بیٹے! تمہیں معلوم ہے کہ میں نے جو عزت یا مرتبہ پایا ہے وہ ظل اللہ کی خدمت سے پایا ہے۔ ہو بادشاہ کو کیا کہا جاتا ہے ظل اللہ فی الارض یعنی زمین پر خدا کا سایہ۔ چنانچہ وہ شخص بہت خوش ہے جسے بادشاہ کا سایہ میسر ہو، لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس سائے سے راحت نا معمولی آدمیوں کا کام نہیں ہے کیونکہ بادشاہ کی حیثیت اُونچے پہاڑ کی ایک ایسی چوٹی سے مشابہ ہے جس کی سطح پر سبزۂ زمردیں کا فرش اور سرسبز و شاداب میوے دار درختوں کی بہتات ہوتی یہاں صاف شفاف پانی کی نہریں بھی ہوتی ہیں اور خوبصورت و خوش رنگ پرند بھی اِدھر اُدھر

چھپاتے پھرتے ہیں غرضیکہ یہاں پر ہزاروں قسم کی دلچسپیاں موجود ہوتی ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ یہیں شیر چیتے اور بھیڑیئے بھی آدمی کی تاک میں موجود رہتے ہیں۔ جہاں آدمی چوکا اور انہوں نے نہایت بے دردی سے اس کا شکار کیا۔ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ مردہ دل کم ہمت اور غیر مستقل مزاج لوگ اس منظر کو بس حسرت کی نظروں سے ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اور زندہ دل، صاحب عزیمت حوصلہ اور مستقل مزاج لوگ اس کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں اور یہاں پہنچ کر حفظ نفسانی جی بھر کے اٹھاتے ہیں۔

خود میرے پیش نظر ہمیشہ یہی مثال رہی ہے اور میں اپنی زندگی کامیاب اور کامران گزار کے جا ہوں، میں سلجوق سلطان کا ندیم ہو گیا لیکن تم شاید اس درجے تک نہ پہنچ سکو، کیونکہ تم میں وہ اوصاف اور خصوصیات نہیں ہیں جو ایک ندیم میں ہونا چاہئیں، اس کے باوجود کہ میں تمہاری طرف سے مایوس ہوں لیکن خدا سے مایوس نہیں ہوا۔ وہ جو تن مردہ میں جان ڈال دیتا ہے اس سے کیا بعید کہ تمہاری ذات میں وہ حوصلہ اور مستقل مزاجی پیدا کر دے جو اعلیٰ مدارج اور مناصب کے لئے ضروری ہے چنانچہ اگر تم کبھی ندیم کے عہدے پر پہنچو تو بیٹا میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ بادشاہوں کا مزاج بالکل بچوں جیسا ہوتا ہے کیونکہ یہ معمولی سی بات پر بگڑ جاتے ہیں اور شیروں کی طرح غضبناک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کسی حکیم کا قول ہے کہ بادشاہوں کے دربار میں حفظ و امن کا صرف یہی طریقہ ہے کہ یہاں اندھوں کی طرح داخل ہو اور گونگوں کی طرح نکل جائے۔"

سب کے آخر میں لکھا تھا۔ میں نے شفقت پدری میں انتہائی رازداری سے قاضی حمید کے پاس چھ کلسے دینار کے رکھوا دیئے ہیں۔ قاضی موصوف بہت دیانت دار اور بڑے امین ہیں۔ تمہیں پہچانتے بھی ہیں۔ میرے بعد تم ان سے مل کر یہ امانت حاصل کر لینا۔ قاضی موصوف نے اس امانت کی ایک رسید بھی جاری کی تھی جو مجھ سے کہیں گم ہو گئی ہے۔ میں نے وضعداری اور شرافت میں دوسری رسید نہیں جاری کرائی لیکن قاضی موصوف کو رسید کی گمشدگی سے مطلع ضرور کر دیا ہے اور انہوں نے وعدہ کر لیا ہے کہ رسید ہو یا نہ ہو یہ امانت دے ہی سپرد کریں گے۔ بہر حال میں مطمئن ہوں اور تم سے خواہش کروں گا کہ تم خود کو بدلو اور اپنی ذات میں عزیمت، حوصلہ اور مستقل مزاجی پیدا کرو۔"

اس خط نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں لرز گیا اور شدت سے اپنی کم ہمتی کا احساس پیدا ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے والد مرحوم کی روح اس کمرے میں موجود مجھ پر لعن طعن کر رہی ہے۔ میں شرمسار اور نادم نادم سا اٹھا۔ غسل خانے میں گیا۔ وضو کیا اور واپس آ کر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ بس یہی ایک مقام تھا جہاں سکون مل سکتا تھا۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد بھی میں دیر تک سجدے میں گڑگڑاتا رہا۔ اسی

دران کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہو گیا۔

مناجات سے فارغ ہونے کے بعد میری طبیعت ذرا ہلکی ہو گئی۔ میں نے دیکھا میرا ساتھی اپنے ستر پر بیٹھا فکر مندی سے مجھے گھور رہا ہے۔ اس نے کھانے کے لئے دریافت کیا۔ میری بھوک مر چکی تھی اس لئے انکار کر دیا۔ وہ بڑا جھکی تھا۔ کہنے لگا۔ "کھانے سے انکار، یہ سب سے بڑی غلطی ہے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری مصیبتیں اتنی بڑی نہیں، جتنی بڑی تم نے خود بنا دی ہیں۔"

اس طعن تشنیع کا یہی علاج سمجھ میں آتا تھا کہ دیوانہ وار اٹھوں اور اپنے ساتھی کو مار پیٹ کے رکھ دوں لیکن اس جنون میں بھی مصلحت اندیشی آڑے آتی رہی، بہر حال میں نے کھانا نہیں کھایا اور اس سے صرف یہی درخواست کی کہ وہ مجھے رہا کر دے تو بڑا کرم ہو گا۔

اس نے میری درخواست کا کوئی جواب نہ دیا اور معلوم نہیں کیا کچھ لکھتا رہا جب لکھ چکا تو مجھ سے کہنے لگا کہ "آج میں تمہارے چچا سے جا کر ملا تھا۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ان کا بھتیجا سہیل ... کا فوت ہو چکا ہاں ان کا ایک غلام البتہ مفرور ہے اور اس کی تلاش جاری ہے۔ وہ تمہیں اپنا غلام بتلاتے ہیں اور انہیں یہاں تمہاری موجودگی کی خبر ہو چکی ہے وہ تمہیں سر گرمی سے تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ تمہیں یہاں سے نہیں لے جا سکتا۔"

اس کے بعد ذرا سکوت اختیار کیا پھر بولا۔ "میں تمہارے خواجہ سرا شریح سے بھی مل آیا وہ تمہارا سچا ہمدرد ہے۔ صبح تک وہ تمہیں کافی دینار بھیج دے گا۔ اس نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے وہ صحیح ہے۔ تم اصفہان جاؤ اور وہاں خواجہ بزرگ سے مل کر اپنے چچا کے خلاف کارروائی کراؤ مجھے امید ہے کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو گی۔ اس کے علاوہ تم قاضی حمید سے مل کر اس سے اپنی امانت بھی واپس لو۔ اگر کسی طرح تم اپنے چچا سے اپنی غصب شدہ املاک اور جاگیر واپس نہ بھی لے سکے تو دینار کے چھ کلسے تمہارے لئے بہت کافی ہوں گے۔"

چلئے دل کو یہ اطمینان تو ہو گیا کہ وہ ہمارا دشمن نہیں ہے اس نے مجھے یہ یقین بھی دلایا کہ وہ ہماری پوری پوری مدد کرے گا۔ کیا اور کس طرح مدد کرے گا اس کی نہ تو اس نے وضاحت کی اور نہ میں پوچھ سکا۔ جب ذرا سکون ملا تو دل میں انشیدہ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن ان حالات میں میں اس سے کس طرح مل سکتا تھا۔

صبح تک مجھے ایک دوسرے آدمی کے ذریعے سے شریح کی بھیجی ہوئی رقم مل گئی۔ یہ تقریباً چالیس ہزار دینار تھے۔ جن کا رکھنا میرے لئے بہت دشوار تھا۔ لیکن میرے ساتھی نے مجھے رائے

دی کہ میں ان کا آگے جاکر سامانِ تجارت خرید لوں اور وہاں سے تاجروں کے قافلے میں شامل ہو کر اصفہان چلا جاؤں۔ اس سلسلے میں اس نے ایک آدمی بھی دیا جو کاروباری معاملات میں بہت چالاک نظر آتا تھا۔ اس وقت تو مجھے اس کی ہر تجویز سے اتفاق تھا۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کے چنگل سے رہائی پاؤں تو پھر سوچوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے۔ اصفہان جانے کا ارادہ تو ضرور کر رہا تھا لیکن خواجہ بزرگ سے ملاقات کی ہمّت نہیں پڑ رہی تھی ہاں قاضی حمید سے اپنی امانت ضرور وصول کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے ساتھی سے اس کی اصل حیثیت کی بابت معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اس نے کچھ بھی نہ بتایا بس یہی کہتا رہا کہ میں تمہارا دوست ہوں، میرے اجنبی ہمدرد نے مجھے جو آدمی دیا تھا اس کا نام ریحان تھا یہ بہت دلیر تھا اس کے ہمّت دلانے پر میں سرائے گیا وہاں سے اپنا گھوڑا اور سامان لیا اور برید خانہ واپس آگیا۔ ایک دن رات کی تاریکی میں، میں نے وطن چھوڑ دیا اور ریحان کے ساتھ کسی تجارتی قافلے کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ تقریباً آٹھ روز کے بعد میں نے دھوئیں اور بھنبھناہٹ سے اندازہ لگایا کہ کہیں قریب ہی کوئی قافلہ موجود ہے۔ ہم نے زمین پر قافلے کے نشانات معلوم کرنا چاہے تو اونٹوں گھوڑوں اور آدمیوں کے لاتعداد نشانات نظر آئے۔ ہم دونوں انہی پر چلتے ہوئے پہر دن رہے قافلے سے جا ملے۔ ہماری سمجھ میں یہی نہ آتا تھا کہ ہم کون سی چیزیں خریدیں جو اصفہان میں اچھے داموں بک جائیں، میرا دل بہت اداس تھا اور طبیعت میں کاروباری رجحان نہ ہونے کی وجہ سے میں بہت پریشان تھا۔ ابھی ہم کسی فیصلے پر بھی نہ پہنچے تھے کہ نیا گل کھلا جس نے میرے رہے سہے ہوش و حواس بھی ضائع کر دیئے اور میں ایک بار پھر سراسیمگی، خوف اور دہشت کا شکار ہو گیا۔

اس قافلے میں تقریباً دو ہزار تجارتی اور غیر تجارتی افراد شامل تھے۔ ان میں بعض اپنے خاندان کے ساتھ سفر کر رہے تھے، دو دن بعد ہمارا قافلہ ایک نہر کے کنارے وسیع و عریض باغ کے سامنے میں ٹھہرا۔ یہاں کا منظر بہت پیارا تھا۔ میں والہانہ انداز میں اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔ میرے ساتھی ریحان کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ایک دن نہر کے کنارے ہی کنارے بہت دُور نکل گیا۔ میں تنہا تھا۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور میرا دل ان کی آواز پر کھنچا جا رہا تھا۔ سرو کے درخت شرمیلے معشوقوں کی طرح گویا سر سے پیر تک چادروں میں لپٹے ہوئے کھڑے تھے۔ اچانک میری مخصوص حس نے مجھے ہوشیار کیا۔ کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے، میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ اسی عالم میں ایک سرو کی آڑ سے ایک لڑکی نکل کر میرے سامنے آگئی۔ اس کا جسم لمبا اور لباس چادر میں چھپا ہوا تھا۔ سر پر ایک خاص قسم کی ٹوپی تھی اور ٹوپی کے اندر ریشمی رومال تھا جو باہر نکلا ہوا تھا۔ جسم پر جو کپڑے نظر آتے

تھے وہ بہت قیمتی تھے۔ اس نے میرا نام لے کے مجھے پکارا "سہیل! رُکو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"۔ ذرا سے تامل اور غور و فکر کے بعد میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ افشید تھی، میرے چچا کی بیٹی اور میری محبوبہ۔ میں نے سہم کر سوچا کہ آخر یہ یہاں کیسے آگئی؟ اور جب یہ سوچا کہ اس کا باپ بھی یہیں کہیں موجود ہوگا تو میری رُوح فنا ہوگئی۔

میں نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ ایک نظر اسے دیکھا اور کسی توجہ یا ہاں ہُوں کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔

لیکن وہ تیز تیز چل کر اور زیادہ میرے قریب آگئی "سہیل! کیا تم مجھے بھُول گئے؟ لیکن میں تمہیں اچھی طرح پہچانتی ہوں، تم سہیل ہو سہیل"۔

میں نے لاپروائی سے جواب دیا "محترم خاتون تمہیں یقیناً دھوکا ہوا ہے ورنہ میں وہ نہیں ہُوں جو غلطی سے تم سمجھ بیٹھی ہو"۔

"ڈرپوک، بزدل، احمق کہیں کا"۔ وہ ایک دم گرم ہوگئی "میں تو تیرے پاس اس لئے آئی تھی کہ والد صاحب تیرے خلاف جو کچھ کرنے جا رہے ہیں تجھے اس سے مطلع کر دوں لیکن تُو ہے کہ اپنی اصل ذات ہی سے منکر ہوا جا رہا ہے۔ پھر مجھے کیا پڑی ہے جو تجھے آنے والے خطرات سے آگاہ کروں"۔

یہ کہہ کر وہ ایک طرف جانے لگی، اب میرے لئے دونوں ہی صورتیں یکساں خطرناک تھیں۔ اقرار میں یہ ڈر تھا کہ میں فوراً پہچان لیا جاؤں گا اور میرا ٹھکانے لگا دینا بہت آسان کام ہو جاتا تھا۔ اور انکار میں یہ خدشہ تھا کہ جس اصل حقیقت کا اس وقت افشید انکشاف کرنے والی تھی وہ راز ہی رہ جاتے، میں نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا اور آہستہ سے پُوچھا "اس وقت تم تنہا ہو یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

اس نے جواب دیا "یہاں میں بالکل تنہا ہُوں لیکن میری آیا یہاں سے قریب ہی موجود ہے"۔

میں نے اس سے دریافت کیا "تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"بے وفا، بے مروّت، بزدل کہیں کے!" وہ جھنجھلا کر کہنے لگی "میں نے تجھے اتفاقاً پہچان لیا ہے، والد صاحب اصفہان اس لئے جا رہے ہیں کہ تیری کُل املاک، جائیداد اور جاگیر کو باقاعدہ اپنے نام منتقل کرا لیں"۔

میں نے اپنے گرد و پیش غور سے دیکھا کہ کہیں یہ میرے چچا کی کوئی چال تو نہیں ہے۔ لیکن یہاں کوئی نہ تھا۔

افشید نے کہا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے!"

میں نے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چلو، وہاں چلتے ہیں، وہیں باتیں ہوں گی۔"

افشید نے انکار تو نہیں کیا لیکن جدھر آیا کھڑی تھی اُدھر دیکھنے لگی۔ مجھے اپنے چچا کی قافلے میں موجودگی کے خیال ہی سے ڈر لگ رہا تھا۔ اتنے میں اس کی آیا بھی ہمارے سامنے آگئی۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ہم تینوں درختوں کے جھنڈ میں گھس گئے اور یہاں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی قلعے میں پناہ گزین ہو گیا ہوں۔

دونوں نے میری خرابیٔ صحت پر افسوس کا اظہار کیا۔ افشید اب بھی بہت برہم تھی۔ اس نے یہاں بھی یہی مشورہ دیا کہ مجھے حالات کا دلیری سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ افشید کی سوئی ہوئی محبت بیدار ہو گئی اور دل میں ایک جوش سا اٹھا کہ جان رہے یا جائے مجھے اپنے چچا کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ افشید کو میری بزدلی اور کم ہمتی سے یوں شکایت تھی کہ اس طرح سے میں اسے کھو دوں گا۔ اور وہ کسی اور کی ہو جائے گی۔

میں نے کہا۔ "افشید! میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں اور اپنے دشمن سے مقابلہ کرنے میں بس دو باتیں آڑے آتی ہیں، ورنہ میں اب تک اسے کب کا ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔"

افشید نے کہا۔ "تم مجھے بتاؤ شاید کوئی مدد کر سکوں۔"

میں نے جواب دیا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا حریف تمہارا باپ ہے!"

افشید نے بے بسی سے کہا۔ "ہاں یہ مجبوری تو ہے اور دوسری مجبوری؟"

میں نے جواب دیا۔ "مجبوری نہیں رکاوٹ کہو، دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ میں ہمدردوں اور دوستوں کی جمعیت نہیں رکھتا، بالکل تنہا ہوں۔"

"یہ کوئی رکاوٹ نہیں!" افشید غصّے میں بولی۔ "ہمت والوں ہی کو دوسروں کا تعاون حاصل ہوتا ہے، بزدلوں اور کم ہمتوں کا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ تم ہمت کر کے سامنے میدان میں آؤ۔ دیکھنا کتنے حمایتی تمہارے ساتھ ہو جائیں گے۔"

میں نے جواب دیا۔ "افشید! مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں تمہارے لئے اپنی جان کی بازی لگا دوں گا لیکن تم بھی یہ وعدہ کرو کہ میرے علاوہ تم کسی دوسرے شخص سے شادی نہ کرو گی۔"

افشید اداس ہو گئی۔ "میں لڑکی ہوں، عورت، میں حتی الامکان تمہارا انتظار کروں گی لیکن اس انتظار کی بھی ایک حد ہونی چاہیئے۔"

"میں اصفہان اس لئے جارہا ہوں کہ وہاں ملک شاہ سلجوق کے وزیر خواجہ بزرگ سے مِل کر اپنے معاملات سُدھاروں۔ اور اس کام میں مجھے کتنا وقت لگے گا۔ کچھ پتا نہیں۔"

افشید نے کہا۔ "تم خواجہ بزرگ سے جتنی جلدی مل سکو ملو ورنہ یہ سمجھ لو کہ والد صاحب اگر پہلے مِل لئے تو معاملات بہت زیادہ بگڑ جائیں گے اور مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "ارشاد ایک کیا میں دس وعدے کرنے کو تیار ہوں۔"

افشید ہنسنے لگی۔ بولی۔ "ہاں جناب ہمّت تو ایک وعدے کو پُورا کرنے کی بھی نہیں ہے لیکن خدا نے زبان میں بڑی طاقت دی ہے کہ ابھی اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وعدے کی نوعیت کیا ہے اور اس کے ایفا میں کتنی دشواریاں یا مشکلات پیش آئیں گی لیکن زبان نے فوراً حامی بھر لی کہ ہاں ہر وعدہ پُورا ہوگا۔"

میں شرمندہ ہو گیا اور ندامت سے اس کی صُورت ہی دیکھتا رہ گیا۔ افشید کی آیا کہنے لگی۔ "بیٹے سہیل! تم پر ظلم تو بہت ہوا ہے ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر خدا تمہیں کامیاب کرے تو مجھے نہ بھولنا میں اپنی بقیہ زندگی افشید کے ساتھ ہی گزار دینا چاہتی ہوں۔"

میں نے اس سے بھی وعدہ کر لیا کہ انشاء اللہ یہ وعدہ بھی پُورا ہوگا۔

افشید نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ اگر خدا تمہیں کامیاب کر دے تو میرے باپ کو کوئی گزند نہ پہنچانا۔"

میں نے افشید کے جذبۂ محبّت سے سرشار ہو کر جواب دیا۔ "میں بہت رحم دل ہوں۔ میں کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" میں نے اس سے دریافت کیا۔ "یہ تم کس تقریب میں اصفہان جا رہی ہو؟"

افشید نے جواب دیا۔ "والد صاحب نے سوچا کہ ان کا کام ہو جائے گا اور میں اس بہانے اصفہان کی سیر کر لوں گی۔"

میں نے ایک راز کی بات دریافت کی۔ "چچا کے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں؟"

افشید نے جواب دیا۔ "پچاس مسلّح جنگجو۔ والد صاحب ملک شاہ سلجوق اور خواجہ بزرگ کی سلامی میں ان خونخوار جوانوں کو پیش کر کے یہ استدعا کریں گے کہ تمہاری جاگیر اور املاک ان کی تحویل میں دی جائے وہ اس کی شکر گزاری میں بوقت ضرورت ایک ہزار سپاہی مہیا کریں گے۔"

"پچاس مسلّح جنگجو خونخوار۔" میں نے اپنے دل میں دہرایا۔ "اگر ان کی پچاس تلواریں یا نیزے کی انیاں ایک ہی وقت میں میرے جسم سے چھو بھی جائیں تو میرا سارا جسم چھلنی ہو جائے۔"

افشید نے مجھے متفکّر اور سوچتا ہوا جو پایا تو شوخی سے بولی۔ "کیا سوچنے لگے۔ پچاس خونخواروں سے ڈر گئے کیا؟"

"نہیں" میں گھبرا گیا۔ اس نے میری چوری جو پکڑ لی تھی۔ میں نے خفیف ہو کر جواب دیا "نہیں یہ بات نہیں ہے اگر میں تنہا نہ ہوتا تو پچاس کیا پچاس ہزار سے بھڑ جاتا۔"

افشید نے کہا "اچھا اب مجھے واپس جانا چاہیئے، میں نے تمہیں کئی فرسخ پیچھے ہی دیکھ لیا تھا اور تم سے ملنے کا موقع تلاش کر رہی تھی جو یہاں آ کر ملا۔"

میں نے پریشانی کو چھپاتے ہوئے پوچھا "کیا چچا نے بھی مجھے دیکھ لیا ہے؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا۔ "ان کی ذرا طبیعت خراب ہے اس لئے وہ کسی اور طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں، سارا سفر خاموشی اور اداسی میں طے پا رہا ہے۔"

"ان کے سپاہیوں میں مجھے پہچاننے والے موجود ہیں یا نہیں؟"

افشید نے کہا۔ "کچھ کہہ نہیں سکتی کیونکہ یہ سارے ہی منتخب نوجوان ہیں اور غالباً ماوراءالنہر اور خراسان سے تعلق رکھتے ہیں۔"

آیا نے افشید سے کہا۔ "افشید اب ہمیں واپس جانا چاہیئے۔ ڈر ہے کہ ہماری تلاش میں کہیں اور لوگ نہ آ جائیں۔" اور میری طرف اشارہ کر کے کہا "اور اس غریب کی جان پر بن جائے۔"

اور ایک بار پھر میں ہراسانی اور خوف کا شکار ہو گیا۔ میں نے کتنی بدحواسی، انتشار اور سراسیمگی کی کیفیات میں افشید کو رخصت کیا تھا۔ آج میں سوچ سوچ کر شرمندہ ہو جاتا ہوں، اس وقت میرے دل میں اپنے چچا اور اس کے خونخوار سپاہیوں کی دہشت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ افشید کی محبت اور اس کی جدائی کا ملال، ان میں سے کوئی جذبہ نہ تھا جو مجھے پریشان کرتا۔ جب وہ چلی گئی، تو میں باہر نکلا۔ اپنے منہ پر رومال ڈال لیا تاکہ پہچانا نہ جاؤں، اور ہر طرف اور ہر آہٹ سے چوکنا اور ہوشیار اپنے خیمے میں پہنچا۔ ریحان میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اپنے خیمے تک پہنچتے پہنچتے اپنے مستقبل کا نیا منصوبہ بنا لیا تھا۔ میں نے بلا کسی تمہید کے ریحان سے کہا۔ "ریحان! میں تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں سے ہم دونوں الگ ہو جائیں گے، تمہاری راہ کچھ ہو گی اور ہماری کچھ اور۔"

ریحان پریشانی سے میری صورت دیکھنے لگا۔ غالباً وہ یہ سمجھا تھا کہ میرے دل سے اس کا اعتماد اٹھ گیا ہے اور اپنے کام میں اس کی اعانت سے دستکش ہو رہا ہوں، میں نے اس کے تردد کو دور کیا۔ "لیکن تمہیں کسی اندیشے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ ہماری راہیں بدل جانے سے ہمارے منصوبے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اشیائے تجارت کی خرید کا مسئلہ تمہاری مرضی اور انتخاب پر ہے۔ میرے سرمائے سے تم جو چیز چاہنا خریدنا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ میں تھوڑی سی رقم کے سوا ساری ہی تمہارے حوالے کر کے اصفہان جا رہا ہوں، میں وہاں تم سے تاجروں کی سرائے میں ملوں گا۔"

"لیکن یہ کیوں؟" ریحان نے تعجب سے کہا۔ "آخر ساتھ ساتھ چلنے میں کیا ہرج ہے؟"

میں افشید کی ملاقات کا اس سے کوئی ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی قافلے میں چچا اور ان کے پچاس خونخوار سپاہیوں کی موجودگی کا کوئی ذکر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "قافلہ ٹھہرتا ہوا مدتوں بعد اصفہان پہنچے گا اور میں نے یہ سوچا ہے کہ جب تک قافلہ وہاں پہنچے میں اس سے پہلے ہی پہنچ کر اپنا مقدمہ خواجہ بزرگ کے سامنے پیش کر دوں اور جب تم اصفہان پہنچو گے تو میں سارے ہی معاملات کو نمٹا چکا ہوں گا۔"

"خیال تو بہت اچھا ہے!" ریحان نے کہا۔ "بشرطیکہ واقعی یہی منصوبہ ہو!"

میں نے مصنوعی استعجاب پیدا کیا۔ "اس کے علاوہ منصوبہ کیا ہو سکتا ہے آخر؟"

ریحان نے ہنس کر کہا۔ "تمہاری سہل پسندی اور آسان ہمتی کا خیال کر کے سوچتا ہوں کہ اس نے معلوم نہیں تمہیں کیا کچھ ڈکھڑا سنا دیا ہو اور تم نے اپنے خیالی خطرات کے پیش نظر یہ نیا منصوبہ بنا لیا ہو۔"

بات یہی تھی لیکن میں نے انکار کیا۔ میں نے اپنی رقم کا بیشتر حصہ اس کے حوالے کیا اور خود معمولی پر اکتفا کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ریحان کی نیت میں فتور بھی آگیا اور اس نے بددیانتی سے کام لیا تو اس سے اوّل تو اس کا ایمان جائے گا دوسرے یہ کہ قیامت میں وہ میرا دین دار ہوگا۔ اور وہاں کی دین داری سے خدا ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

ریحان نے روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں نہ رکا اور دوسرے دن فجر کی نماز سے پہلے ہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا قافلے سے جدا ہو گیا۔ دو دن بعد مجھے ایک دوسرا قافلہ مل گیا۔ یہ "رے" سے چلا تھا اور اصفہان جا رہا تھا۔ میں اس میں شامل ہو گیا اور اسی کے ساتھ اصفہان میں داخل ہو گیا۔ میں نے قافلے کے بوڑھے تاجر سے غیر معمولی تعلقات بڑھا لئے تھے اصفہان اس کا وطن تھا اور وہ ریشم کی تجارت کرتا تھا۔ بوڑھا مجھ پر شفقتیں فرمانے لگا اور میں نے یہ سوچا کہ چلو جی یہ اچھا ہی ہے۔ کسی سرائے میں ٹھہرنے کے بجائے اس بوڑھے کے گھر ٹھہرنا زیادہ بہتر رہے گا۔ جب بوڑھے نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میں اصفہان کس مقصد سے جا رہا ہوں تو میں نے یہی کہہ دیا کہ میں سلجوق بادشاہ کی فوج میں ملازمت کرنا چاہتا ہوں، بوڑھا یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ کیونکہ سپاہ گری کے مقابلے میں تجارت ایک حقیر سا پیشہ ہے اور لوگ ایک سپاہی کی حیثیت میں ہی اپنا اعزاز اور عزت تلاش کرتے ہیں۔

کئی دن تو میں اس کا مہمان رہا اور مہمانداری کے مزے لوٹتا رہا لیکن پھر میں نے اسے کئی سو دینار دیئے کہ یہ رکھے اور اس میں میرے کھانے کا انتظام کرے۔ پہلے تو وہ بہت ناراض ہوا اور یہ کہہ کر واپس کرنے کی کوشش کی کہ میں کسی سرائے کا بھٹیارا نہیں ہوں جو تمہارے کھانے پینے کا تم سے معاوضہ

وصول کر لوں، لیکن بہر حال وہ تاجر تھا یہ کہہ کر میری رقم رکھ لی کہ یہ تمہاری امانت ہے جو میرے پاس جمع رہے گی جب چاہنا واپس لے لینا۔

اب میرے سامنے خواجہ بزرگ سے ملاقات اور مقدمہ پیش کرنے کا مسئلہ تھا۔ یہاں پر میرا حوصلہ اور ہمت پھر جواب دینے لگے۔ میں نے سوچا کہ آج ہی کل میں دوسرا قافلہ بھی ورود اصفہان ہونے والا ہے اور میرا چچا یقینی طور پر فوراً ہی ملک شاہ سلجوق اور خواجہ بزرگ سے ملنے کی کوشش کرے گا۔ میں اس تصور ہی سے سہم گیا۔ جب میرے رُوبرو خواجہ بزرگ کے سامنے میرے چچا کی قینچی جیسی دلائل، منطق اور جھوٹ سے آلودہ زبان میرے مقدمے کے رد میں چل رہی ہوگی اور میں سہما اور دُبکا ہوا مقابلے سے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہوں گا تو میری اس وقت کی بزدلی اور کم ہمتی، میری حقیقی حیثیت کو کتنا مشتبہ اور میرے مقدمے کو کس قدر کمزور کر دے گی اور پھر جب میں جھوٹا اور عیار قرار پا جاؤں گا تو میرے لئے کیسی عبرتناک اور ذلت آمیز سزا تجویز کی جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ میرا چچا اس وقت یہ درخواست کر گزرے کہ میں چونکہ اس کا مجرم ہوں اس لئے اسی کے حوالے کر دیا جاؤں۔ وہ خود جو مزا چاہے گا میرے لئے تجویز کرے گا۔ اور پھر میرا چچا میرے لئے جو سزا تجویز کرے گا۔ وہ کوئی بہت عبرتناک سزا ہوگی۔ ان اندیشوں نے مجھے اتنا خوفزدہ کر دیا کہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا۔ اب میں اس وقت تک خواجہ بزرگ سے نہیں ملوں گا جب تک میرا چچا اس سے مل کر واپس نہیں چلا جاتا۔ اس تجویز پر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جب میرا چچا اپنے مقدمے میں کامیاب ہو کر واپس چلا جائے گا تب پھر خواجہ بزرگ سے میرا ملنا فضول ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ دل میں حوصلہ نہ ہونے کی وجہ سے زبان بھی ساتھ نہیں دیتی اور میں خواجہ بزرگ کے سامنے اپنا مقدمہ اس طرح ہرگز نہیں پیش کر سکتا کہ اپنی بات اور زور بیان سے اپنے چچا کے مکر اور فریب کو رد کر دوں۔ میں ہمت ہار گیا اور مایوس ہو کر بیٹھ گیا کہ اب مجھے اپنی حویلی، املاک اور جاگیر سے بالکل ناامید ہو جانا چاہیئے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پھر مجھے افشید کا بھی خیال آیا۔ اس سے دستبردار ہونے کو جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن کیا کرتا غالباً مشیت ایزدی ہی یہی تھی۔ مرضی مولا از ہمہ اولا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔

اس کے بعد قاضی حمید کا خیال آیا۔ یہ کام نسبتہً پہلے کام سے آسان تھا کیونکہ قاضی کے پاس والد مرحوم کی جو امانت تھی اس کا کسی اور کو علم نہ تھا۔ یہاں بھی میرے دل میں وسوسے پیدا ہوئے کہ اگر قاضی نے انکار کر دیا۔ تب کیا کروں گا۔ لیکن یہ بھی خیال تھا کہ قاضی بددیانت نہیں ہوتے، ان کی دیانت اور امانت داری مشہور تھی۔

مجھے اس قافلے کی آمد کا بھی انتظار تھا جس میں میرے چچا اور ریحان شامل تھے، ایک دن شام کو

اطلاع ملی کہ وہ قافلہ بھی آگیا اور اس کے بیشتر لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے ہیں اور کچھ نے سرائے میں قیام کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میرے چچا اور ریحان نے بھی سرائے میں ہی قیام کیا ہوگا۔

اصولاً مجھے اپنے ساتھی ریحان سے ملنا چاہیئے تھا لیکن میں نہیں گیا کیونکہ اس کے آس پاس ہی کہیں میرا چچا بھی موجود ہوگا۔ اب مجھے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا اور دیر تک جھنجلاہٹ کا شکار رہا۔ ریحان سے لاتعلقی میرے رہے سہے مستقبل کو بھی تباہ کر سکتی تھی لیکن سرائے کا خیال ہی چچا اور ان کے پچاس خونخوار سپاہیوں کی دہشت پیدا کر دیتا، اب میں نے دل میں حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی اور یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو، ہمیں ہر وہ کام کرنا چاہیئے جس سے طبیعت راہِ فرار اختیار کر رہی ہو، میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اگر میں نے اپنے آپ کو نہیں بدلا تو زندگی کے ہر میدان میں ناکامیاں ہی ناکامیاں میرا مقدر بن جائیں گی۔

اور ایک دن میں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ پہلے جب نکلتا تھا تو چہرے کو تقریباً چھپا کر نکلا کرتا تھا۔ رُومال کو اس طرح سر پر ڈالتا تھا گویا دھوپ سے چہرے کو بچا رہا ہوں لیکن اس دن رُومال کو شانے پر ڈال لیا اور یونہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں سیدھا دارالقضاء پہنچا اور قاضی حمید سے ملنے کی کوشش کی۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ میری ہی طرح اور بھی کچھ لوگ قاضی سے ملاقات کے منتظر تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ قاضی کے دربان سے میں نے اپنی آمد کی اطلاع اندر بھجوا دی۔ میرا خیال تھا کہ قاضی اطلاع پاتے ہی مجھے فوراً اندر بلا لے گا۔ لیکن کافی دیر گزر گئی لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دربان سے یاد دہانی کرائی۔ اندر سے جواب آیا انتظار کرو۔ کچھ مقدمات زیرِ کارروائی ہیں تیسرے پہر طلبی ہوئی تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اب میری سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ میں عرضِ مدعا کس طرح کروں گا۔ پھر یہ سوچا کہ قاضی تو خود ہی سمجھتا ہوگا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ میں اندر پہنچا وہاں کچھ لوگ پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے یہ لوگ معتمول اور صاحبِ اثر معلوم ہوتے تھے۔ میں چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ تخلیہ ہو تو کچھ عرض کروں، اس دوران قاضی نے کئی بار سرسری نظر سے مجھے دیکھا لیکن کوئی سوال نہیں کیا۔ بیٹھنے والے ایسے بیٹھے تھے کہ اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ سب کے سامنے زبان نہ کھلتی تھی۔ میری ہمت جواب دیتی جا رہی تھی، جب شام ہو گئی تو قاضی صاحب عصر کی نماز کا عذر کر کے زنانخانے میں چلے گئے اور مصاحبین نے اپنی اپنی راہ لی۔ میں بھی واپس چلا آیا۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ تنہائی میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ دوسری ملاقات میں لوگ بیٹھے رہیں یا جائیں میں عرضِ مدعا ضرور کر دوں گا۔ لیکن اس کے بعد میں کئی دن تک دوبارہ جانے کی ہمت نہ کر سکا۔

اسی دوران ایک نیا شگوفہ کھلا۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

دوپہر کا وقت تھا اور میں دار القضاۃ کے سامنے سے چکر لگا کر واپس آرہا تھا کہ ایک عالیشان قصر سے ایک عورت نمودار ہوئی اور بھاگی بھاگی میرے پاس آئی اور مجھ سے کہنے لگی "میرے ساتھ چلو، میری آقا زادی تمہیں بُلا رہی ہے۔"

میں ڈر گیا کہ کہیں میرا چچا اسی قصر میں تو نہیں ٹھہرا اور افشید نے مجھے دیکھ لیا ہو۔

میں نے دریافت کیا "مجھے بلا رہی ہیں؟ کیوں بلا رہی ہیں؟"

عورت نے جواب دیا "کیوں بُلا رہی ہیں اس کا جواب تو وہ خود ہی دیں گی، مجھے تو بس یہی حکم ملا ہے کہ تمہیں بلا لے جاؤں۔"

اس وقت اگر کوئی میرے سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھ کر دیکھتا تو اسے میرا دل زور زور سے دھڑکتا محسوس ہوتا۔

میں نے اس سے دریافت کیا "یہ کس کا قصر ہے؟"

عورت نے جواب دیا "میری آقا زادی کا اپنا قصر ہے۔"

میں نے ایک بار پھر اسے ٹالنا چاہا۔ "جاؤ تم اپنی آقا زادی سے دوبارہ پوچھ آؤ کہ اس نے مجھے ہی بُلایا ہے یا کسی اور کو۔"

عورت نے جل کر جواب دیا "عجیب آدمی ہو خواہ مخواہ بحث میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ اندر خوش قسمتی تمہارا انتظار کر رہی ہے اور تم ہو کہ اپنا سارا وقت حیض بیض میں گزارے دے رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ چلنے میں یوں تامل ہو رہا ہے کہ میں اصفہان میں اجنبی ہوں، یہاں مجھے کوئی بھی نہیں جانتا، اس حال میں اگر کوئی عورت مجھے اپنے قصر کے اندر بُلاتی ہے تو مجھے قدرتاً تشویش ہونی چاہیئے۔"

عورت نے کہا "سڑک پر کھڑے ہو کر اس طرح بحث و تکرار کرنا خود مجھے بھی پسند نہیں، اسی لئے تو کہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ اندر چلو اور جو بات کہنی ہو وہیں چل کر کہو۔"

میں متردد اور مذبذب اس کے ساتھ چل دیا۔ قصر میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ میں کسی نئی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ صدر دروازے کی حدود کو پار کرتے ہی میں چمن میں داخل ہو گیا۔ بیچ میں فوارے چھوٹ رہے تھے۔ یہ فوارے مختلف شکلوں کے تھے کہیں مور بنا تھا کہیں شیر تھا۔ کہیں عقاب اور کہیں باز سنگھا تھا۔ فوارے کے ارد گرد دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا اور یہاں درخت نہیں تھے۔ یہاں سے ہٹ کر چمن میں مختلف قسم کے درخت لگے تھے مجھے سرو کی روش بہت پسند آئی اس کے سائے میں حسین و جمیل لڑکیوں اور عورتوں کا طائفہ بیٹھا تھا ان کے ہاتھوں میں مختلف مزامیر تھے۔ جن سے

سُریلی آوازیں پھوٹ رہی تھیں ایک لڑکی کوئی گیت گا رہی تھی اور ان کے درمیان میں گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے ایک نہایت ہی خوبصورت عورت بیٹھی گیت اور سازوں کی آواز سے لُطف اندوز ہو رہی تھی۔

میں ٹھٹھک گیا مجھے آگے بڑھنے میں تامل ہوا اندر میں نے ایک بار پھر یہی سوچا کہ عورت مجھے غلطی سے بُلا لائی ہے لیکن میرے ساتھ والی عورت مطمئن تھی۔ جب میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا تو اس عورت نے بھی آگے بڑھنے پر اصرار نہیں کیا۔ وہ خود آگے بڑھ گئی۔ پھر ساز و آواز کی محفل برہم ہو گئی اور درمیان والی عورت اٹھ کر سامنے کی بارہ دری میں چلی گئی وہاں پہنچ کر وہ کہاں گم ہو گئی مجھے پتا نہ چلا۔ مغنیائیں دوسری طرف چلی گئیں غالباً ان کی رہائش بھی اسی قصر میں تھی۔

عورت نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بُلایا میں نے سوچا کہ اب تو شہ کی کوئی بات نہیں رہ گئی۔ یقیناً مجھ کو ہی اندر بُلایا گیا ہے۔ جب میں پریشان اور خوفزدہ خوفزدہ آگے بڑھ رہا تھا تو ایک یہ خیال بھی دل میں آیا کہ ہو سکتا ہے قصر کی آقا زادی کو میری صورت پر کسی اور کا شُبہ ہوا ہو۔ وہ عورت بارہ دری سے گزرتی ہوئی ایک زینے سے اُوپر چڑھنے لگی۔ میں رُکا تو اس نے گھوم کر اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا میں جب اوپر پہنچا تو وہاں مجھے جس کمرے میں لے جایا گیا اس کی سجاوٹ، مہمان اور دلکشی کا نقشہ کھینچنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آقا زادی اور میرے درمیان ایک باریک کپڑے کا پردہ حائل تھا۔ ایک اتنا باریک پردہ کہ اس میں سے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے میرا خیال ہے کہ وہ تو مجھ کو ضرور ہی دیکھ رہی ہو گی۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بے پناہ اشتیاق کے باوجود اسے دیکھ سکتا۔

تھوڑی دیر تک تو خاموشی رہی اس کے بعد ایک مترنم آواز رس گھولتی ہوئی کانوں میں داخل ہوئی۔ "تم کہاں رہتے ہو؟"

میں نے سٹپٹا کر جواب دیا۔ "میں اصفہان میں نوادر و ہوں باہر سے آیا ہوں!"

"کیا کرتے ہو؟"

"فوج میں نوکری کرنا چاہتا ہوں!" میں نے جواب دیا۔

"یہاں کہاں قیام ہے؟"

میں نے جواب دیا "شہد کا ایک بوڑھا تاجر ہے اس کے ساتھ رہتا ہوں۔"

اس نے شوخی سے سوال کیا۔ "کیا تم اس قصر میں رہنا پسند کرو گے؟"

جو کچھ سنا تھا کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ حیرت اور گھبراہٹ سے میں نے پردے سے اس آقا زادی

کو دیکھا۔

"کیا تم میرا مطلب نہیں سمجھے؟" وہ کہنے لگی۔ "میں پوچھ رہی ہوں کہ کیا تم اس قصر میں رہنا پسند کرو گے؟"

میری کنپٹیاں جلنے لگیں اور پیشانی پسینے سے آلودہ ہوگئی۔ "میں اس نوازش عجیب کی تقریب ضرور جاننا چاہتا ہوں۔"

آقازادی کہنے لگی: "میں بیوہ ہوں اور خود مختار بھی، اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ آج کئی دن سے میں تمہیں آتے جاتے دیکھ رہی ہوں چنانچہ آج میں نے اسے اس کام پر لگا دیا تھا کہ تم جیسے ہی ادھر سے گزرو یہ تمہیں بلا لائے چنانچہ یہ بلا لائی!"

میں نے کہا۔ "لیکن میرے سوال کا جواب تو اب بھی نہیں ملا۔"

اس نے جواب دیا۔ "سوال پھر سے کرو۔"

میں نے کہا۔ "میں نے یہ عرض کیا تھا اصفہان جیسے طویل و عریض شہر میں بے شمار مرد اور نوجوان پڑے ہیں، ان سب کو نظر انداز کر کے مجھ پر ہی آپ کی نگاہ محبت کیوں پڑی!"

وہ کہنے لگی۔ "بات صرف اتنی سی ہے کہ دوسروں کی شکلیں تمہاری طرح نہیں ہیں!"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے کہا۔ "میری کیا کسی کی شکل بھی ایسی نہیں ہوتی کہ اس جیسے دو چار اور مل جائیں؟"

وہ عورت ہنسنے لگی۔ کہنے لگی۔ "میں کیسی لگتی ہوں؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "بہت اچھی!"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "بہت خوب، لیکن تم مجھے ذرا بھی اچھے نہیں لگے۔"

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ کچھ دیر بعد خود ہی کہنے لگی۔

"میں تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گی، بات یہ ہے کہ چار سال پہلے میں نے محبت کی شادی کی تھی لیکن پچھلے سال میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ میں ایک سال سے اس کی جدائی میں غم واندوہ کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اتفاق سے ایک دن میری نظر تم پر پڑ گئی تو میں چونک پڑی۔ تمہاری شکل ہو بہو میرے مرحوم شوہر جیسی ہے۔ میں برداشت نہ کر سکی اور آج اپنی ملازمہ کو بھیج کر تمہیں بلوا ہی لیا۔"

میں اس کی باتیں خواب و خیال کی طرح سن رہا تھا۔ اس نے دو ٹوک فیصلہ سنا دیا۔ "مردوں میں میرا کوئی قریبی عزیز موجود نہیں، عورتوں میں صرف ماں ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ اس معاملے میں میری مخالفت نہیں کرے گی۔"

اگر یہ سب کچھ سچ تھا تو میری قسمت مجھے ایک عجیب موڑ پر لے آئی تھی اور میں جو کچھ کھو رہا تھا خدا مجھے اس سے کچھ زیادہ ہی دے رہا تھا۔

آقازادی نے کہا۔ "لیکن شادی سے پہلے میں تم سے ایک وعدہ ضرور لوں گی۔"

میں گم سم تھا جب میں کچھ بھی نہ بولا۔ تو اس نے ذرا سنجیدگی اختیار کی اور کہنے لگی۔ "شاید میں نے ہی کچھ زیادہ عجلت اور قبل از وقت بے تکلفی سے کام لیا ہے اور تم مجھے پاگل یا کوئی ایسی ویسی سمجھنے لگے ہو۔" اس کے بعد بہت افسوس سے بولی "اب تم جا سکتے ہو۔"

اس نے اسی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہیں باہر تک پہنچا دے گی۔"

اب وہ عورت بھی بولی۔ "اجنبی! تم بدقسمت ہو کہ میری آقازادی کو ناراض کر دیا۔"

میں نے بدقت تمام کہا۔ "دراصل اس وقت میں دم بخود اور حیران ہوں، جو کچھ دیکھ یا سن رہا ہوں اس پر یقین نہیں آتا اور اسی بات نے میری قوت گویائی سلب کر لی ہے۔"

آقازادی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور غائب ہو گئی۔ "بہرحال تم اس مسئلے پر دو تین دن غور کر لو۔ ہمیں اتنی جلدی بھی نہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے غور کر لوں گا لیکن ایک بات اسی وقت صاف کر دینا چاہتا ہوں۔"

"کہو!" اس نے کہا اور سنجیدگی سے میری صورت تکنے لگی۔

میں نے کہا۔ "میرے پاس دینے لینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ بالکل قلاش ہوں۔"

"اوہ، ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں!" وہ خوش ہو کر بولی۔ "ہمیں تم سے وعدوں کے سوا کچھ بھی نہیں چاہیئے۔"

میں نے کہا۔ "کیا وعدہ چاہتی ہو؟"

اس نے کہا۔ "مرد کئی شادیاں کرتے ہیں لیکن میں تم سے اس شرط پر شادی کروں گی کہ مجھ سے شادی کے بعد تم کسی اور سے شادی نہیں کرو گے اگر ایسا کیا تو میں تم سے خلع لے لوں گی۔"

مجھے ایک بہت بڑا سہارا مل رہا تھا۔ حسین و جمیل عورت اور وافر دولت اور رہنے کو شاندار قصر، ذرا سی دیر کو افشید کا خیال آیا تو میں نے اسے یہ سوچ کر ذہن سے نکال دیا کہ اوّل تو ان حالات میں اسے اپنانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا دوسرے یہ کہ میں اب اس سے مل بھی کہاں سکتا ہوں، اب شاید زندگی بھر ہم ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں، سو میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی بھر تمہاری اس خواہش کا احترام کروں گا۔"

"فی الحال تم اسی قصر میں اٹھ آؤ۔ کچھ دنوں ایک ساتھ رہ کر ہم ایک دوسرے کو سمجھ بھی لیں گے مطمئن

ہو جانے پر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے!"

اس کی رائے انتہائی معقول تھی۔ میں حامی بھر کے چلا آیا۔ مجھے دوسرے دن شام تک اس کے قصر میں منتقل ہو جانا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں پھر قاضی حمید کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اسی طرح اندر پہنچا اور وہاں سے بے نیل و مرام واپس آیا۔ قاضی نے اظہارِ مدعا کا پھر کوئی موقع نہ دیا

شام کو بوڑھے تاجر کو کچھ بتائے بغیر ہی میں نئی قیام گاہ میں منتقل ہو گیا۔ کچھ بتا کر میں اس کے بہت مداحوں سے بچنا چاہتا تھا۔ یہاں میرا شاندار استقبال ہوا اور میں شاہانہ وقار سے رہنے لگا۔

ایک بار پھر قاضی سے ملا اور والد مرحوم کا خط اسے دکھا کر تقاضا کیا تو قاضی صاحب ایک دم اکھڑ گئے۔ فرمایا: "تو جھوٹا ہے تیرا باپ بھی جھوٹا تھا۔ جب ایک چیز مجھے دی ہی نہیں تو میں اس کی کس طرح حامی بھر لوں"

میں نے کہا "ذرا ذہن پر زور دو، میرا باپ امانت کے بارے میں جھوٹ کیوں لکھنے لگا"

قاضی اور زیادہ گرم ہو گیا: "تو اسی وقت یہاں سے دفعان ہو جا۔ میں تجھے پہچانتا تک نہیں۔ شاہی ندیم احمد سے میں واقف ضرور ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ تحریر مرحوم کی نہیں ہے اور پھر یہ کہ میں امانت کی ایک رسید بھی تو دیتا ہوں۔ اگر تو وہ رسید لے آتا ہے تو میں یہ رقم اپنے پاس سے ادا کر دوں گا"

اور آخر میں مجھے دھمکی دی: "اور اگر تو اب دوبارہ میرے پاس آیا تو میں طبیبوں سے تصدیق کرا کے تجھے دارالمجانین (پاگل خانے) داخل کرا دوں گا"

ظاہر ہے کہ قاضی صاحب اثر تھا۔ میں اس دھمکی سے اتنا ڈرا کہ پھر لمحہ بھر بھی وہاں نہ ٹھہرا۔ میں بھاگ کھڑا ہوا اور اسی کو غنیمت جانا کہ اس رقم کا خیال بھی اپنے دل سے نکال دوں اور اس بیوہ خوبرو امیر زادی سے شادی کر کے پُرسکون نئی زندگی کا آغاز کر دوں۔

میں دو ہفتے اس قصر میں رہا۔ امیر زادی، جس کا نام علیہ تھا میرے سیدھے پن سے بہت خوش ہوئی۔ مجھے بھی اس کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس کی ماں بھی مجھے چاہنے لگی ہے۔ میں نے اس سے شادی کر لی۔ شادی کی رسم نہایت سادگی اور خاموشی سے ادا کی گئی۔ اب میرے دل کو ذرا ڈھارس بندھی اور مجھ میں غیر معمولی ہمت عود کر آئی، میں گھوڑے پر بیٹھ کر ادھر اُدھر سیر و تفریح کو بھی نکلنے لگا۔

اب چونکہ مجھے اصفہان میں آئے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے اس لئے میں نے یہ خیال کیا کہ میرا چچا اپنا کام ختم کر کے واپس جا چکا ہوگا۔ اس لئے دل میں جو تھوڑا بہت ڈر تھا وہ بھی نکل گیا۔ میں آزادی سے اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے لگا۔

قاضی کی بددیانتی پر مجھے رہ رہ کے غصہ آ رہا تھا۔ جب بھی دارالقضاۃ کی طرف سے گزرتا میرا خون

کھول جاتا۔ اب میں پورے طمطراق اور کروفر سے نکلتا تھا۔ میں نے اپنی حفاظت کے لئے دو غلام بھی خرید لئے تھے۔ میں انہیں لے کر ایک بار پھر قاضی سے ملنے پہنچ گیا۔ اس مرتبہ میرے جانے کا صرف یہ مقصد تھا کہ میں قاضی کے دل میں اپنی اعلیٰ حیثیت کا رعب بٹھا دوں۔ اور دونوں غلاموں کی موجودگی میں اپنی امانت طلب کروں۔ ممکن ہے اس سے متاثر اور خوفزدہ ہو کے میری امانت واپس دے دے۔ چنانچہ قاضی نے اس آن بان سے مجھے اندر داخل ہوتے جو دیکھا تو واقعی ذرا سا سہم گیا اور مجھ سے پوچھا۔

"اب کس لئے آئے ہو؟ اپنا علاج کرایا یا نہیں؟"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "کیسا علاج؟ میں تو اس وقت اپنی امانت واپس لینے آیا ہوں۔"

اس نے میرے ایک غلام سے دریافت کیا "یہ تمہارے کون ہیں؟"

اس نے جواب دیا "آقا، مالک۔"

قاضی نے مزید دریافت کیا "یہ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "امیر زادے بھی کبھی کوئی کام کرتے ہیں یہ بھی کوئی کام نہیں کرتے، آقا زادی عُلیہ سے شادی ہو گئی ہے۔ اس لئے اب تو کسی کام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"اچھا!" قاضی چونک پڑا۔ "تو اس چالاک انسان کا نیا شکار ہے عُلیہ، خوب عُلیہ تو بڑی سادہ لوح امیر زادی ہے اس سے کہنا میں کسی وقت اس سے ملنے آؤں گا اور اس نوجوان کے کرتوت اس کے گوش گزار کروں گا۔"

قاضی اپنی پوری کوشش سے مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب تک عُلیہ سے جا کر ملے گا اور اسے امانت والی تفصیل بتائے گا تو اس کے دل میں میری طرف سے شبہات ضرور پیدا ہو جائیں گے۔ اور جب وہ مجھ سے یہ پوچھے گی کہ میں نے یہ سب اسے پہلے کیوں نہ بتایا تو مجھے اپنے چچا کی ساری داستان سنانی پڑے گی کہ انجام کار بات اتنی بگڑ جائے گی کہ میں عُلیہ کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ میں نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ قاضی سے اب کبھی نہ الجھوں اور اس بات کی کوشش کروں کہ قاضی عُلیہ سے نہ مل سکے۔ میں فوراً ہی واپس ہوا اور چلتے چلتے قاضی سے کہا "میں اپنے دعوے سے درگزرا۔ خبردار جو تم میرے گھر پر آئے۔"

میں اپنے دونوں غلاموں کے ساتھ جب قصر میں واپس پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوئی بوڑھا مجھے پوچھتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے۔ جب میں نے اس بوڑھے کا حلیہ پوچھا تو بالکل چچا کا نکلا۔ میں بہت زیادہ پریشان ہو گیا۔ اس نئی افتاد سے میرا کھانا پینا حرام اور بھوک پیاس اڑ گئی۔ عُلیہ نے بھی میری اس وحشت کا اندازہ لگا لیا اور اس نے بڑی کوشش کی کہ میں اداسی اور پریشانی کا سبب

بتا دوں لیکن میں نے نہیں بتایا۔ یہاں میں دوہری پریشانی کا شکار تھا۔ ایک تو چچا کا خوف دوسرے ایسے حالات اور واقعات کا عقلیہ کے سامنے طشت از بام ہونا جن سے وہ قطعی لاعلم تھی اور علم میں آجانے پر معلوم نہیں کیسی افتاد کھڑی کر دینے کا باعث بن جائیں۔

میں قصر کے بالائی حصے سے سڑک کا نظارہ کرتا رہتا مجھے بے چینی سے اپنے چچا کا انتظار تھا میرا گھوڑا ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس وقت میں نے یہی طے کیا تھا کہ ان کی شکل دیکھتے ہی نہایت ہوشیاری سے ٹل جاؤں گا۔ نہ میں موجود ہوں گا نہ کسی قسم کا ہنگامہ کھڑا ہوگا۔

اس واقعے کو دو دن گزر چکے تھے اور میں کچھ مطمئن سا ہو چلا تھا کہ شاید چچا وغیرہ وطن واپس چلے گئے اگر اصفہان ہی میں موجود ہوتے تو دوبارہ ضرور آتے لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ تیسرے دن سہ پہر کو میں نے دیکھا کہ چچا اپنے دس خونخوار جنگجو سپاہیوں کے ساتھ میرے قصر کی طرف چلے آرہے ہیں۔ ان کے ساتھ چادر میں لپٹی ہوئی افشید بھی تھی۔ میں حواس باختہ اٹھا اور جس لباس میں تھا اسی میں بھاگ کر نیچے اترا۔ کسی سے کچھ کہا سنا بھی نہیں، دوڑتا ہوا گھوڑے کے پاس گیا۔ اچک کر گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گیا اور اسے رانوں کی رگڑ سے صدر دروازے کی طرف بھگا۔ میری اس دہشت اور بوکھلاہٹ پر قصر کا ہر آدمی حیران ہوگیا لیکن مجھے کچھ پتا نہیں کیونکہ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی جو لوگوں کے چہروں کے تاثرات پڑھتا۔ چشم زدن میں میرا گھوڑا قصر کے باہر تھا۔ اور میں پلک جھپکتے ہی کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ کافی دور تک تو میں نے پلٹ کے بھی نہ دیکھا لیکن مجھے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ اگر چچا نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ تو ان کے آدمی میرا تعاقب ضرور کر رہے ہوں گے۔

تقریباً چھ سات فرسخ کا فاصلہ طے کر لینے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ وہاں دور دور تک کسی کا پتا نہ تھا۔ ہاں میرے ہی گھوڑے کی ٹاپوں سے اڑی ہوئی گرد میرے تعاقب میں تھی۔

میری کم ہمتی اور بزدلی نے مجھے ایک بار پھر اچھاڑ دیا تھا۔ میں نے اپنے پیچھے سے مطمئن ہو جانے کے بعد گھوڑے کی رفتار ذرا دھیمی کر دی اور یہ سوچنے لگا کہ رات سر پر آرہی ہے، شب بسری کہاں ہوگی اور میرا اگلا قدم اب کیا ہونا چاہیئے۔ میں اسی فکر اور تردد میں چلا جا رہا تھا کہ میری نظر اچانک ایک ایسی عمارت پر پڑی جو کچھ جانی پہچانی سی نظر آئی، یہ بالکل برید خانے جیسی تھی، مجھے اس عمارت کے عملے کا ذاتی تجربہ تھا کہ یہ لوگ ذرا شریف اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ میں نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ کسی بھی طرح ایک رات یہیں گزاروں گا اور رات کو اطمینان سے آئندہ کے منصوبوں پر غور کروں گا۔ میں اس عمارت کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہوگیا اور سوچنے لگا کہ اس کے مہتمم سے شب بسری کے لئے کس قسم کی باتیں کرنی چاہئیں جب میں دیر تک کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو یہ سوچ کر کہ اس طرح گومگو کھڑے رہنا دیکھنے والوں

کو میری طرف سے بلاوجہ مشکوک کر دے گا۔ میں بریدخانے کی طرف بڑھا کہ مہتمم بریدخانے کے روبرو پہنچ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔

ابھی میں نے دروازے پر دستک بھی نہ دی تھی کہ ایک آدمی اندر سے نمودار ہوا۔ شاید وہ کہیں اور جا رہا تھا لیکن مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور دریافت کیا "میرا خیال ہے کہ تم کہیں باہر سے آئے ہو اور اصفہان میں تمہارا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔"

میری جان میں جان آئی کہ خدا کیسا مسبب الاسباب ہے اس نے گفتگو کا اسلوب اور موضوع خود ہی عطا کر دیا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ "ہاں بات تو درست ہی ہے لیکن تم نے یہ کس طرح اندازہ لگا لیا؟"

اس نے کہا "صورت دیکھ کر تم تھکے ہوئے بھی معلوم ہوتے ہو اور کپڑے گرد و غبار میں اٹے ہوئے ہیں اور تمہارا یہاں پر فکرمند کھڑا ہونا یہ ساری ہی باتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ غریب الوطن ہو۔"

میں نے کسی تمہید کے بغیر ہی اپنا مطلب بیان کر دیا۔ "میں ایک رات یہاں گزارنی چاہتا ہوں۔"

اس نے بلاچون وچرا میری درخواست مان لی، اندر واپس گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد بریدخانے کا ایک کمرہ میرے تصرف میں تھا اور میں رات کا کھانا کھا کر جب بستر پر دراز ہوا تو دوسرے دن کی فکر اور ماضی کے ہنگاموں پر غور کرنے لگا۔ میں نے خوش قسمتی سے کتنی شاندار حیثیت حاصل کر لی تھی لیکن اس خوش قسمتی کو بھی میری غیر مستقل مزاجی کھا گئی تھی۔ میں نے مایوس ہو کر سوچا کہ اس زندگی میں قدم قدم پر ناکامیاں اور محرومیاں ہیں موت بہتر ہے۔ خودکشی ہر چند حرام تھی لیکن زندگی بھی تو حرام ہو چکی تھی۔ میں نے ایک حرام کو دوسرے حرام سے ختم کر دینا چاہا۔ رات بھر خودکشی کے طریقوں پر غور کرتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری بدقسمتی مجھے خودکشی بھی نہ کرنے دے گی۔ صبح جب سو کر اٹھا تو میں نے اپنے قریب ہی اس اجنبی دوست کو کھڑا دیکھا جس نے وطن کے بریدخانے میں مجھے قید کیا تھا اور بعد میں اسی کے مشورے پر میں ریحان کے ساتھ اصفہان روانہ ہوا تھا۔

اس نے میرے بیدار ہوتے ہی طنزیہ کہا "اب میں دیکھوں گا کہ تم کس طرح فرار ہوتے ہو۔ اصفہان کا صاحب الشرط (پولیس انسپکٹر) تمہاری تلاش میں ہے خواجہ بزرگ کے سامنے تمہارا مقدمہ پیش ہو چکا ہے اس نے تمہاری گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے ہیں۔"

اب میرے فرار کی ہر راہ مسدود ہو چکی تھی۔ میں نے مجبوراً اپنے تئیں حالات کے حوالے کر دیا۔ دل تو نہیں چاہتا تھا کہ منہ ہاتھ دھوؤں لیکن اپنے ساتھی کی درشتی نے مجھے ہاتھ منہ دھونے پر مجبور کر دیا۔ جب صبح کی ضروریات سے پوری طرح فارغ ہو لیا تو اس نے نئی دھمکی دی۔ کہنے لگا "جیسے تم اپنا بچاؤ بتاتے تھے۔ اس نے خوب اچھی طرح خواجہ بزرگ کے سامنے ثابت کر دیا کہ تم اس کے بھتیجے نہیں غلام ہو اور چوری سے

فرار ہو گئے ہو اب خواجہ بزرگ تمہیں اس کے حوالے کر دے گا اور پھر خدا جانے تمہارا کیا حشر ہو۔"

چونکہ اب فرار کی کوئی راہ بھی باقی نہ رہی تھی اس لئے میں نے یہ آخری فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو اب میں ہتھیار نہ ڈالوں گا اور خواجہ بزرگ کے سامنے چیخ چیخ کر اپنی مظلومیت کا مقدمہ پیش کروں گا۔ اگر میری موت آگئی ہے تو میں مردانہ وار مروں گا۔ پوری زندگی بزدلی اور کم ہمتی کی نذر ہو گئی ہے۔ لیکن موت مردوں کی طرح قبول کروں گا۔ چنانچہ جب میں گرفتار ہو کر خواجہ بزرگ کے پاس جا رہا تھا تو میں بالکل مطمئن تھا۔ میری حالت پر سکون تھی اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میں نے دوران سفر کچھ گیت بھی گنگنائے میری اس تبدیلی سے میرے ساتھی کو یہ شبہ گزرا کہ شاید میرا دماغی توازن صحیح نہیں رہا۔

کسی انتظار اور تامل کے بغیر مجھے خواجہ بزرگ کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ وہاں میرا چچا پہلے ہی سے موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا مجھے محسوس ہوا کہ اس میں غضب کا طنز اور زہر شامل ہے۔

خواجہ بزرگ کے سامنے پہنچ کر میں نے یہ انتظار بھی نہ کیا کہ میرا مقدمہ پیش ہو اور مجھے اپنی برأت اور صفائی کا موقع دیا جائے تب میں زبان کھولوں۔ میرے اندر دبا ہوا لاوا ابل پڑا اور جو طوفان پورے وجود میں ادھر ادھر پھیل کر دب گیا تھا زبان کی راہ سے پھوٹ پڑا۔ میں نے چیخ چیخ کر غصے میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو عام حالت میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے اپنی مظلومیت کی پوری داستان نہایت درد اور سوز سے بیان کر دی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے جس مؤثر اور پرزور انداز اور شاندار الفاظ میں اپنا مقدمہ خواجہ بزرگ کے سامنے پیش کیا تھا اس سے سبھی متاثر تھے۔ اور میرے چچا کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ وہ بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ جب میں سب کچھ کہہ کر چپ ہوا تو خواجہ بزرگ نے میرے چچا کی طرف دیکھا اور اس سے دریافت کیا "اب تم کیا کہتے ہو؟"

میرے چچا نے جواب دیا "میں اب بھی وہی کہتا ہوں جو پہلے کہتا تھا۔"

میں نے پھر چیخ کر کہا "تم جھوٹے ہو تم میرے دشمن ہو۔"

خواجہ بزرگ نے ایک بار پھر میرے چچا کی طرف دیکھا اور کہا "ندیم احمد کی کل املاک، جاگیر اور حویلی ہماری تحویل میں رہے گی۔ اور میں اسے بھی تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

میں آپے سے باہر ہو گیا اور قریب تھا کہ میں خواجہ بزرگ اور اس کے اس عجیب و غریب انصاف کو بھلا کہوں کہ خواجہ بزرگ کی خدمت میں ملک شاہ سلجوق کا خاص فرستادہ حاضر ہوا اور اس نے یہ پیغام دیا کہ کسی ضروری معاملے میں ملک شاہ کو اس کی فوری ضرورت پیش آگئی ہے۔ خواجہ بزرگ نے ہمارے مقدمے کو دوسرے دن پر ملتوی کر دیا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً ہی ملک شاہ کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

اب مجھے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ میرا چچا اور اس کے خونخوار سپاہی مجھ سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔

کیونکہ ہمارا مقدمہ خواجہ بزرگ کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ ہم سب ایک ساتھ باہر نکلے۔ باہر نکل کر میرے چچا نے دریافت کیا "اب کہاں جاؤ گے؟" میں نے جواب دیا "جہاں کل تم مجھے تلاش کرتے ہوئے پہنچ گئے تھے۔"

میرا اجنبی ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہی نکلا تھا۔ اس نے طنز کیا "ہاں سیدھے وہیں جانا۔ یہ نہ کرنا کہ پھر فرار کی سوچو اور کل ہم سب تمہیں تلاش کرتے پھریں۔"

اب میں عاجز آچکا تھا اور اندر ایک آگ سی روشن تھی، میں نے غصے میں جواب دیا "تم لوگ گھبراؤ نہیں اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تم سب کو جواب دینا ہی پڑے گا۔ تم سب نے میرے خلاف محاذ بنا لیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے تمہارا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔"

پھر میں اپنے چچا کی طرف گھوم گیا اور تقریباً چیخ کر کہا "او خود غرض لالچی بوڑھے! تو اپنے بھیانک انجام کے لئے تیار ہو جا۔ میں تیرا ہر طرح مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔"

چچا نے کسی قدر ترشی سے جواب دیا "جو فیصلہ ہونا ہے وہ تو کل ہو ہی جائے گا اور میں جانتا ہوں کہ کیا فیصلہ ہوگا۔"

جب میں اُن سے جُدا ہونے لگا تو چچا اور ان کے سپاہیوں نے مجھے خوش اخلاقی سے الوداع کہی۔ مجھے ان کے اس رویے پر بڑی ہنسی آئی۔ ان سے جدا ہو کر میں دیر تک سوچتا رہا کہ کہاں جاؤں۔ اگر عُلیہ کے پاس واپس جاتا تو مجھے ڈر تھا کہ کل رات کی غیر حاضری اور اپنے پیچھے چچا و غیرہ کی زہر افشانی کی وجہ سے علیہ کوئی مغائرانہ یا کوئی دوسرا افسوسناک رویہ نہ اختیار کرے لیکن اب میں ڈھیٹ اور مستقل مزاج بن جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر گاڑی چلتی نہ نظر آتی تھی۔ میں نے سوچا کہ زیادہ سے زیادہ عُلیہ مجھے دستکار ہی دے گی اور کیا کرے گی اور اب میں اس کے ہر فیصلے کو خندہ پیشانی سے ماننے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ مجھے یہ ملال تھا کہ آخر میں نے عُلیہ کو ساری تفصیلات پہلے ہی کیوں نہ بتا دی تھیں۔ میں نے ہر معاملے میں راہ فرار اختیار کی تھی لیکن اب میں اس کے لئے بالکل بھی تیار نہ تھا۔ چنانچہ میں سیدھا اپنے قصر میں داخل ہو گیا۔ خدام قصر نے میری شاندار پزیرائی کی اور اشارتہً گزشتہ رات کی عدم حاضری کا سبب اور خیریت دریافت کی۔ میں انہیں کوئی جواب دیئے بغیر اُداس، ملول اور فکرمند گھوڑے سے نیچے اترا۔ سائیس نے گھوڑے کی لگام تھامی اور میں تنہا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا عُلیہ کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں چپ چاپ اس کے کمرے کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ وہ دوسری طرف کروٹ لئے لیٹی ہوئی تھی، ایک مغنیہ ہلکے سروں میں بغیر ساز کے اسے کوئی فراقیہ گیت سنا رہی تھی۔ مغنیہ نے مجھے دیکھ لیا اور گانا بند کر دیا۔ عُلیہ کسمسائی اور اسے حکم دیا "گاتی کیوں نہیں؟ چپ کیوں ہو گئی؟"

مغنیہ نے ہنس کر جواب دیا "جس کے فراق میں میں گا رہی تھی وہ دروازے پر موجود ہے"۔
عُلیہ نے گھبرا کر مجھے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مغنیہ موقع کی نزاکت محسوس کر کے دوسرے دروازے سے نکل گئی۔ عُلیہ نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں کمرے میں داخل ہو گیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا عُلیہ کے قریب پہنچ گیا اور اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "عُلیہ! کل رات کی غیر موجودگی کی معافی چاہتا ہوں"۔
عُلیہ نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "تم اب تک مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے رہے؟"
میں اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ "میں ہر بات کی معافی چاہتا ہوں عُلیہ!"
اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن میری طرف گھمائی اور کہا "تم تو ایک مشہور باپ کے بیٹے ہو۔ جہاں مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرا انتخاب میرے شایانِ شان رہا ہے، وہیں یہ ملال بھی ہے کہ تم نے وہی وعدہ افشید سے بھی کر رکھا ہے جو مجھ سے کیا ہے!"
"کون سا وعدہ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
عُلیہ نے تڑپ کر جواب دیا۔ "افشید کے سوا کسی اور سے شادی نہ کرنے کا وعدہ!"
میں اس کے برابر ہی بیٹھ گیا اور فرطِ محبت میں اس کی پیشانی چوم لی۔ "بے شک میں نے افشید سے بھی یہی وعدہ کیا تھا لیکن اس کا باپ میرا جانی دشمن ہے میری ساری املاک اور جاگیر کو ہڑپ کر جانا چاہتا ہے اس نے صرف میری خاطر مجھے ہلاک کرنے کے لئے پچاس خونخوار جنگجو اپنے گرد اکٹھے کر رکھے ہیں۔ ان حالات میں دنیا کا کون نوجوان ہے جو افشید سے شادی کرے"۔
عُلیہ نے خلافِ توقع ان کی وکالت کی۔ "لیکن ان کی باتوں سے تو کہیں بھی ان کی دشمنی کا اظہار نہ ہوتا تھا وہ تو تمہیں دل و جان سے چاہتے ہیں اور جب افشید کو یہ معلوم ہوا کہ تم نے مجھ سے شادی کر لی ہے تو وہ رونے لگی اور اپنے باپ سے کہنے لگی کہ "یہ سب کچھ تمہاری غلط روش اور بے جا تجربے کی وجہ سے ہوا ہے اب میرا کیا ہوگا۔ افشید پر نیم غشی طاری ہو گئی۔ سچ کہتی ہوں کہ مجھ سے اس کی وہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی"۔
اب میں نے سب کچھ سچ سچ عُلیہ کو بتا دیا۔ عُلیہ نے جواب میں کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح یہ مان لوں کہ تمہارا چچا تمہارا دشمن ہے کل اس کی کسی بات سے بھی تو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمہارا دشمن ہے"۔
میں نے عُلیہ سے ایک درخواست کی "عزیز از جان عُلیہ! کیا تم میرے لئے سو سپاہیوں کا بندوبست کر سکتی ہو؟"

عُلیہ نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟ سو سپاہیوں کا کیا کرو گے؟"
میں نے جواب دیا "مجھے اپنے چچا پر اعتماد نہیں ہے میں آج رات کو ان سے مل کر آخری بات کرنا چاہتا ہوں"
علیہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا "وہ تم تنہا جا کر بھی کر سکتے ہو!"
میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا "نہیں میری جان علیہ تنہا جانے میں جان کا خطرہ ہے احتیاطاً سو سپاہیوں کا ساتھ جانا ضروری ہے"
عُلیہ مسکرائی اور خود سپردگی کے عالم میں جواب دیا "بہتر ہے تم کہتے ہو تو سو آدمیوں کا انتظام کر دوں گی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے!"
ہم دونوں نے کچھ وقت انتہائی مسرت و شادمانی میں گزارا اور ہم دونوں دنیا کی فکروں سے آزاد ہو گئے، تنہائی، محبت اور جذبات نے ہمارے جسموں میں ایک سیال آگ سی دوڑا دی اور ہم دونوں دیر تک اس آگ کو بجھاتے رہے۔
شام تک عُلیہ نے سو سپاہیوں کا بھی انتظام کر دیا۔ معلوم ہوا کہ دو چار سو آدمیوں کا فوراً ہی اکٹھا کر لینا عُلیہ کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ پیشہ ور سپاہی کسی بھی وقت اچھے معاوضے پر مہیا کئے جا سکتے ہیں۔
زندگی میں پہلی بار میں نے خود کو بھی آلاتِ حرب سے آراستہ کیا زرہ بکتر پہنی۔ خود چڑھایا، چار آئینے سے سینے کو زیادہ محفوظ کر دیا۔ بازوؤں کو جوشن میں چھپایا۔ قصر کے بڑے میدان میں دس دس کی قطار میں سو سپاہی میرے منتظر تھے۔ علیہ نے مجھے باحسرت و یاس رخصت کیا۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور پیشانی اور رخسار کو بوسے دیئے اس نے مجھے تلقین کی کہ حتی الامکان جھگڑے سے بچنا ورنہ ملک شاہ سلجوق کا ہاتھ بہت لمبا ہے وہ معاف نہیں کرے گا۔
میں نے پہلی بار حالات سے نبرد آزما ہونے کی یہ روش اختیار کی تھی۔ جب میں نے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر سو سپاہیوں کی سپہ سالاری کا احساس کیا تو میرا سینہ ایک عجیب و غریب جوش سے مملو ہو گیا۔ شجاعت اور حوصلے نے میرے دل میں جگہ بنالی تھی اور اب دنیا کا سب سے بڑا معرکہ بھی میرے لئے حقیر اور معمولی تھا۔ مجھے اپنے چچا اور اس کے پچاس خونخوار سپاہیوں پر ہنسی سی آئی کہ وہ میرے سو سپاہیوں کے مقابلے پر کتنی دیر ٹھہر سکیں گے۔
میں ایک انداز شاہانہ سے اپنے سو سپاہیوں کے دستے کے ساتھ قصر کے باہر نکلا اور چچا سے نمٹنے

کے لئے پیش قدمی کرنے لگا۔ میرا چچا اصفہان کے شمالی حصّے میں اپنے ایک تاجر دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں مغرب سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا اور اسے للکارا۔ "او خبیث لالچی بوڑھے! کہاں ہیں تیرے وہ پچاس خونخوار سپاہی، انہیں لے کر نکل اور میدان میں آ ہم تیرے استقبال کو آئے ہیں۔"

میرا چچا گھبرا کر باہر نکلا اور اس نے جو سماں دیکھا تو اسے یقین نہ آیا اس نے نرمی سے کہا۔ "بھتیجے! کیا یہ واقعی تو ہے اور مجھ سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں!" میں نے تلوار کو نیام سے نصف کھینچ کر چھوڑ دیا۔ "خواجہ بزرگ ہم دونوں کے مقدمے کا فیصلہ اپنے قلم سے کرنے والا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تلوار کا فیصلہ قلم کے فیصلے سے زیادہ سچّا اور پائیدار ہوگا۔"

چچا بے ساختہ میری طرف بڑھا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں، میری خواہش پوری ہو چکی ہے میں تجھے اس حلیے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری خواہش پوری ہو گئی۔"

میں نے اسے تنبیہہ کی۔ "خبردار جو میرے قریب آئے، چچا مجھ سے دور ہی رہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم یہ میٹھی میٹھی باتیں کیوں کر رہے ہو تم نے مجھ سے اور میرے سپاہیوں سے خوفزدہ ہو کر اب یہ مصالحانہ اور مفاہمانہ روش اختیار کی ہے مگر اب ان باتوں کا وقت گزر گیا۔"

"غلط تم سمجھتے ہو!" چچا ایک دم ٹھہر گیا۔ "یہ بات نہیں ہے میرے عزیز بھتیجے، مجھے موقع دے کہ میں تجھے اصل حقیقت سے آگاہ کروں۔"

"زیادہ باتیں نہ بنا!" میں نے کہا۔ "میں تم سے مقابلہ کرنے آیا ہوں، تم نے مجھے بہت دکھ دیئے ہیں۔"

چچا نے افسوس سے کہا۔ "تو غلطی پر ہے مجھے تیری املاک اور جاگیر سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"یہ تم اب کہتے ہو، اب جب میں تمہاری سرکوبی کو تمہارے سر پہ پہنچ چکا ہوں۔" چچا کی نرم گفتگو سے میرے جوش اور حوصلے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"اچھا!" چچا نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ "تو میرا انتظار کرو۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ تیرے مقابلے پہ آتا ہوں اس کے بعد ہی ہم دونوں برابری سے بات کر سکیں گے۔"

میرا دل ایک بار پھر دھک دھک کرنے لگا کہ اس مقابلے کا نجانے کیا نتیجہ نکلے، چچا اپنے سپاہیوں کے ساتھ اتنی جلدی تیار ہو کے واپس آیا کہ میں دنگ رہ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے اپنے اپنے گھوڑوں پہ سوار تھے۔

چچا کا گھوڑا ہنہنانے لگا۔ وہ پارے کی طرح متحرک تھا۔ کبھی ادھر ہو جاتا کبھی اُدھر۔ اس نے پُروقار لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا تو واقعی جنگ پہ آمادہ ہے؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "کیونکہ اس ایک جنگ سے بہت سے فیصلے خود بخود ہو جائیں گے۔"
"لیکن میں خود جنگ نہیں چاہتا تھا!" چچا نے افسردگی سے کہا۔ "تمہیں اس حلیے اور انداز میں دیکھ کر میں بے حد خوش ہوں۔"
"بکواس!" میں نے تلوار نیام سے باہر کھینچ لی۔ "گفت گو بند اور مقابلے کا آغاز۔" اور میں نے اچانک چچا پر حملہ کر دیا۔ اگر میں اسے خبردار کر کے مقابلہ کرتا تو مجھے یقین تھا کہ وہ آزمودہ کار بوڑھا مجھے ضرور ہلاک کر دیتا لیکن میں نے اسے اتنا موقع ہی نہ دیا اور اپنے کئی بھرپور حملوں سے اسے کاٹ کر ڈال دیا وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ ہی گھوڑے سے نیچے گر گیا۔
جانبین کے جنگجو کچھ سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ کیا ہو گیا۔ میں فرطِ جوش اور وفورِ خوشی میں چیخا۔ "میں نے اپنا بدلہ لے لیا۔ میں نے اپنے دشمن کو ہلاک کر دیا۔"
میرا خیال تھا کہ چچا کے سپاہی میری طرف بڑھیں گے۔ لیکن وہ سب خاموش تماشائی بنے یہ منظر دیکھتے رہے میں سمجھ گیا کہ فوجیں بغیر سردار کے جنگ نہیں کرتیں۔
اچانک ایک طرف سے کسی کے چیخنے چلانے کی آواز بلند ہوئی۔ کوئی عورت روتی ہوئی مانوس آواز میں ہماری طرف دوڑی چلی آ رہی تھی وہ آتے ہی چچا کی لاش سے لپٹ گئی اور بین کر کر کے رونے لگی، میں نے پہچان لیا یہ افشید تھی۔
آس پاس یہ خبر ہوا کی طرح پھیل گئی، اس وقت میرا بہت بُرا حال تھا۔ افشید کی گریہ و زاری سے میں خود بھی متاثر ہوا۔ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ افشید اُدھر سے فارغ ہو کے مجھ سے مخاطب ہو تو میں اس سے معذرت طلب کروں اور بتلاؤں کہ اس طول طویل سازش کا جو میرے خلاف چل رہی تھی اس کے سوا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ پھر یکایک ہمارے سپاہیوں میں بے چینی کی کیفیات پیدا ہوئیں اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے اور میں وہاں یکہ و تنہا رہ گیا۔ صاحب الشرطہ (انسپکٹر جنرل) اپنے سپاہیوں کے ساتھ میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اب نہ تو میں بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میں گرفتار کر لیا گیا۔
افشید ابھی تک رو رہی تھی۔ چچا میں اب بھی جان تھی۔ صاحب الشرطہ اس کے قریب گیا تو اس نے اشارے سے اُسے قریب بُلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ صاحب الشرطہ نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ چچا کے زخم اتنے مہلک تھے کہ اس کے جاں بر ہونے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔
افشید اچانک مجھ سے مخاطب ہوئی، "سہیل یہ تم نے کیا کر دیا؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دوسرے دن اوّل پہر ہی مجھے ملک شاہ سلجوق کے رُوبرو پیش کر دیا۔ میرا جرم بہت سنگین تھا۔ اور ملک شاہ نے بطورِ خاص میرا مقدمہ اپنے ذمے لے لیا تھا۔ جب صاحب الشرط مجھے ملک شاہ کے دربارِ خاص میں لے چلا تو میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ مجھے اپنے پیروں سے چلنا مشکل ہو رہا تھا قصر شاہی سے باہر دو سو سوار اور ایک ہزار پیادے چاق و چوبند کھڑے تھے، ان میں خراسانیوں اور دیلمیوں کی اکثریت تھی۔ ان کی مخصوص وردی، چمک دار نیزے اور سیدھی تلواریں ملک شاہ کی خدمت اور حفاظت کے لئے ہر وقت آمادہ و تیار تھیں۔ یہ بادشاہ کا مفروان (باڈی گارڈز) تھا۔ مجھے ان کے پاس سے گزر کر شاہی محل میں داخل ہونا پڑا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا شاہی مفروان نے مجھے بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔

صاحب الشرط مجھے مختلف پُرپیچ راہوں اور غلام گردشوں سے گزارتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ محل کی شان و شوکت اور حشم و شکوہ نے ہی میرا کام تمام کر دیا۔ اب مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ میں اچھی طرح اپنے مقدمے اور جرم کی صفائی پیش کر سکتا۔

ایک جگہ پہنچ کر صاحب الشرط رُک گیا اور وہاں کے حاکم سے کچھ باتیں کیں اور پھر ہمیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ ملک شاہ سلجوق کا دربارِ خاص وہاں سے کچھ دُور نہ تھا اور اسے ہماری آمد کی اطلاع کی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مسلح آدمی آئے اور ہمیں صاحب الشرط کے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں ملک شاہ کے دربارِ خاص میں پہنچ چکا تھا۔

ملک شاہ کے پاس اس وقت چند ندیموں، خواجہ بزرگ اور حاجب کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مجھے اس کے حکم پر اس کے قریب پہنچا دیا گیا۔ یہاں تک کہ ہم دونوں میں بمشکل چھ گز کا فاصلہ رہ گیا۔ ملک شاہ نے مجھے شوخ اور طنز کی نظروں سے دیکھا اور پوچھا "احمد جو میرا ندیم تھا۔ کیا تو واقعی اس کا بیٹا ہے؟"

فرطِ رُعب سے میری زبان نہ کھلتی تھی، بمشکل تمام میں نے جواب دیا۔ "ظل اللہ! بجا سمجھتے ہیں"

اس کے بعد ملک شاہ نے اپنے بائیں جانب پڑے ہوئے پردے کی طرف دیکھا اور کچھ اشارہ کیا۔ پردہ ایک طرف سرک گیا۔ پردے کے پیچھے سے سسکیوں کی آواز آنے لگی۔

ملک شاہ نے مجھے حکم دیا۔ "اُدھر دیکھ اس پردے کے پیچھے، کیا تو اسے پہچانتا ہے؟"

میں نے جیسے ہی اُدھر دیکھا پہچان لیا یہ افشید تھی، میں اور خوفزدہ ہو گیا۔

ملک شاہ کی آواز گونجی۔ "تو نے اس کے نیک اور مہربان باپ اور اپنے چچا کو اپنی حماقت اور بزدلی

سے قتل کر دیا حالانکہ وہ تیرا بھلا چاہتا تھا۔"

یک بیک معلوم نہیں کس طرح ہمت پیدا ہوگئی میں نے اپنے جسم کی پوری قوت کو بروئے کار لاکر جواب دیا۔

"وہ غاصب تھا۔ میرا باپ جو ظل اللہ کا نمکخوار اور خدمت گزار تھا۔ اس کی موت کے بعد میرا چچا اس کی املاک، حویلی اور جاگیر پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتا تھا" پھر ذرا شرمساری سے عرض کیا۔" اور چونکہ میری بابت وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کم ہمت اور کم حوصلہ ہوں اس لئے وہ مجھے قتل بھی کرا دینا چاہتا تھا۔"

"جھوٹ!" ملک شاہ نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔" خواجہ! تم اصل واقعہ بیان کرو۔"

خواجہ بزرگ اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا اور آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔" ظل اللہ! جس کے پاس ہمت، حوصلہ اور استقلال نہیں اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ نوجوان انہی بدنصیبوں میں سے ایک ہے۔ اس کا چچا اس کا دشمن نہیں تھا جب احمد ندیم کا انتقال ہوگیا تو اس کے چچا نے یہ سوچتے ہوئے کہ اس کا بھتیجا اور ہونے والا داماد کم ہمت اور غیر مستقل مزاج ہے اور اپنے چالاک اور عیار دوستوں کے ہاتھوں پریشان اور برباد ہو چکا ہے اس لئے اس کی املاک اور جاگیر کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ اس کی سرپرستی میں دے دی جائے۔ اس کا مرحوم چچا مجھ سے کہتا تھا کہ میرے بھتیجے میں نسب کے سارے ہی اوصاف موجود ہیں لیکن شجاعت، ہمت اور استقلال کہیں سو گئے ہیں۔ وہ انہیں بیدار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انہیں بیدار کرنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا اور اس منصوبے میں اس کا خواجہ سرا شریح، بیٹی اقشید اور سرکاری جاسوس معید اس کے ساتھی بنے اور ان سب نے مل ملا کر مختلف اوقات میں ایسے ایسے حربے اختیار کئے جن سے اس کم ہمت میں حوصلہ اور استقلال پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ سب شکست کھا گئے اور جب یہ خفتہ وصف بیدار ہوا اور اس کی نسبی شجاعت واپس آئی تو اس نے اپنے چچا کو قتل کر دیا۔ اس نے پھر ایک دن کا بھی انتظار نہ کیا۔"

خواجہ بزرگ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا۔ اور اس وقت میرا جو حال تھا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ میرا دل بھر آیا اور چچا کی موت سے آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس عجیب و غریب مقدمے سے غالباً ملک شاہ بھی پریشان ہوگیا۔ اس نے خواجہ بزرگ سے مشورہ کیا۔

"خوب! شرع کیا کہتی ہے کیا اسے سزا دی جا سکتی ہے؟"

خواجہ بزرگ نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ ایک عمر رسیدہ ندیم اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا جس کا یہ مطلب تھا

کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے، ملک شاہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور دریافت کیا "اے رند بے نیاز عمر خیام! کیا تو بھی کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

میں نے اس مشہور روزگار شخصیت کا نام تو بہت سنا تھا لیکن دیکھنا اسی بدنصیبی کے موقع پر ہوا یہ شخص مشہور شاعر خراباتی، نجومی حساب داں خیمہ ساز کا بیٹا عمر خیام تھا۔ اس کے چہرے سے بے نیازی اور استغنا اس طرح ظاہر تھی جس طرح سطح آب پر اس کی امواج۔

عمر خیام نے ایک رباعی پڑھی۔ "لوگ کہتے ہیں کہ آدمی میں ہنر ہو یا باپ کی طرف سے اعلیٰ نسب، لیکن آج یہ ساری چیزیں ہیچ ہیں، بس مال و زر ہونا چاہیئے۔" رباعی پڑھ چکنے کے بعد کہا "یہ سارا فتنہ و فتور مال و زر کا ہے۔"

ملک شاہ نے کہا "لیکن خیام! اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ قاتلوں اور مجرموں کو کوئی سزا ہی نہ دی جائے"

عمر خیام نے پھر دست بستہ ایک رباعی پڑھی۔ "بتا دنیا میں ایسا کون ہے جس نے گناہ نہیں کیا اور جس نے گناہ نہیں کیا تو وہ زندہ کیسے رہا۔ میں برائی کرتا ہوں اور تو برائی کا بدلہ برائی سے دیتا ہے پھر میرے اور تیرے درمیان فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟" اس کے بعد عرض کیا "ظل اللہ! صاف گوئی کے شر سے خدا کی امان آج کون ہے جو قتل کے جرم کا مرتکب نہیں، شاہ تو ہزاروں لاکھوں کے قتل کے مرتکب ہوتے ہیں، دنیا میں ہے کوئی ایسی عدالت جو انہیں قاتلوں کی جگہ بٹھا کر اپنا فیصلہ سنائے؟ پھر ایک یہ غریب جس نے زندگی بھر اس فعل ممنوعہ سے اپنی بزدلی کے سبب پناہ مانگی ہو۔ ظل اللہ کی کسی سزا کا نہیں، جزا کا مستحق ہے۔"

ملک شاہ تلملا گیا۔ وہ لاجواب ہو چکا تھا۔ اس سر پھرے بدمست شاعر خراباتی نے جس طرح میری وکالت کی تھی اس کے لئے میرا رواں رواں اس کا شکر گزار تھا۔ ملک شاہ نے سکوت اختیار کیا۔ وہ تذبذب اور کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں لاابالی اور بے نیاز شاعر ایک اور رباعی آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ "اے آدمی تو عالم عدم سے آکر پانچ حواس چار عناصر، چھ سمتوں اور سات آسمانوں کے زندان میں حیران و پریشان ہو رہا ہے۔ شراب خوری کر، کیونکہ تجھ کو نہیں معلوم کہ تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا، بس ہنسی خوشی زندگی بسر کر۔"

ملک شاہ نے زچ ہو کر کہا "اے بدبخت شاعر! خدا کے لئے چپ رہ۔ تو نے مجھے آزمائش اور الجھن میں ڈال دیا ہے۔" پھر خواجہ بزرگ سے خطاب کیا "ہاں! اس معاملے میں تیری عقل کیا کہتی ہے؟"

خواجہ بزرگ نے جواب دیا "ظل اللہ! مقتول نے جو کھیل کھیلا تھا اس کا انجام عین فطری ہے۔" پھر

سر جھکا کر عرض کیا: "میں اس احمق اور کم عقل کو مجرم نہیں سمجھتا۔" اس کے بعد خواجہ بزرگ کی نظریں صاحب الشرط پر اٹھ گئیں اور اس نے ملک شاہ کو مخاطب کر کے کہا: "صاحب الشرط کا بیان ہے کہ مقتول نے اپنے زندگی بیان میں صاحب الشرط کو ہدایت کی ہے کہ اس کے قاتل بھتیجے کو معاف کر دیا جائے۔"

ملک شاہ اس طرح خوش ہو گیا گویا اس کی ساری الجھن دور ہو گئی ہو، اس نے صاحب الشرط کو دیکھا اور اشارے سے حکم دیا کہ وہ خواجہ بزرگ کے بیان کی تائید یا تردید کرے۔ صاحب الشرط نے نظریں نیچے رکھیں۔ اور بآواز بلند عرض کیا: "مقتول نے خدا اور رسول کے واسطے سے درخواست کی ہے کہ اس کے بھتیجے سے قصاص نہ لیا جائے!"

ملک شاہ نے کہا: "وہ تو مر چکا اس کی وارث اس کی بیٹی موجود ہے، حاجب! تو اس سے معلوم کر کہ وہ قصاص چاہتی ہے یا اپنے مقتول باپ کی خواہش کی تکمیل۔"

تھوڑی دیر بعد حاجب نے اشید کا جواب ملک شاہ کے روبرو بآواز بلند سنا دیا: "لڑکی کہتی ہے مقتول باپ کی خواہش اور وصیت پر عمل کیا جائے!"

ملک شاہ نے فوراً ہی اپنا فیصلہ سنا دیا: "اے نوجوان! تو جو میرے مرحوم ندیم احمد کا بیٹا ہے ایک ندیم کی سفارش اور اپنے مقتول چچا کی وصیت پر رہا کیا جا رہا ہے۔ احمق! اب یہ یاد رہے کہ تیری خفتہ شجاعت دوبارہ اس طرح ہرگز نہ بیدار ہو، کیونکہ اگر آئندہ پھر کبھی تو اسی طرح میرے سامنے لایا گیا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ عمر خیام جیسا بے لوث اور صاحب دانش تیری پُرزور وکالت کر کے تجھے چھڑا لے گا۔"

مجھے فوراً ہی رہا کر دیا گیا۔ میں دربار سے نکل کر تادیر خواجہ بزرگ اور عمر خیام کی واپسی کا انتظار کرتا رہا کہ ان کا شکریہ ادا کروں، خواجہ بزرگ سے تو ملاقات ہو گئی لیکن عمر خیام سے نہ ہو سکی، خواجہ مجھے دیکھ کر زیر لب مسکرایا اور کہا۔ "کم عقل نوجوان! تو ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے اور تیری یہی خوش قسمتی تیری زندگی کا باعث اور آئندہ خوشحال زندگی کا سبب بنے گی ورنہ تو اپنی ہمت اور حوصلے کے اعتبار سے اس لائق بھی نہیں کہ تجھے دربانوں میں جگہ دی جائے کیونکہ دربان میں بھی بہادری، ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے کم ہمتوں اور غیر مستقل مزاج آدمیوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں یہاں تک کہ قبر میں بحرین بھی ان کی کم ہمتی سے ان کے لئے وبال بن جائیں گے۔"

مجھے خواجہ بزرگ کی بات کے ایک ایک حرف سے اتفاق تھا۔

جب میں قصر میں واپس آیا تو غلبہ فرط جذبات میں رو دی۔ اس کو میری رہائی پر یقین نہ آتا تھا۔

اس واقعے کا اتنا شہرہ ہو گیا کہ سارے اصفہان میں پھیل گیا۔ اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ قاضی صاحب خود ہی قصر پر حاضر ہوئے اور میری امانت واپس کر گئے۔ وہ کہتے تھے کہ جب ہر طرح سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ شاہی ندیم احمد کے تم ہی بیٹے ہو تو امانت کے واپس کرنے میں تذبذب سے کام کیوں لیا جائے!"

میرا اجنبی ساتھی معید دراصل شاہی جاسوس تھا جن کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں میں گھل مل جائیں اور ملک شاہ سلجوق خواجہ بزرگ کو بدعنوانیوں، بدنظمیوں اور ظلم و زیادتیوں سے باخبر کرتے رہیں لیکن میری یا میرے چچا کی بدقسمتی سے چچا مرحوم کے کھیل کا ایک کردار بن گیا تھا۔

وہ جرأت منداور ہر وقت بولتی رہنے والی افشید جس کی رگوں میں خون کی جگہ پارہ دوڑ رہا تھا اب بالکل خاموش رہتی تھی۔ اسے میں اپنے ہی قصر میں لے آیا تھا۔ کچھ دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ یہاں وہ بہت زیادہ افسردہ اور بے چین رہنے لگی ہے۔ جب میں علک کے ساتھ ہنستا بولتا تو اس کی عجیب سی کیفیت ہو جاتی، ایک دن کہنے لگی "سہیل! میں وطن واپس جاؤں گی مجھے پہنچا دو۔"

میں نے اسے روکنا چاہا اور جب اس سے یہ کہا کہ اب وطن میں کون ہے جس کے پاس وہ جائے گی تو اس نے تقریباً چیخ کر کہا "وہاں سب کچھ ہے، وہاں کی ہر چیز اپنی ہے، در و دیوار، ہوا پانی، وہاں کا ذرہ ذرہ اپنا ہے میں واپس جاؤں گی، مجھے پہنچا دو، میں یہاں مرنا بھی پسند نہ کروں گی!"

میں مجبور ہو گیا علک نے اجازت دے دی لیکن اس نے مجھ سے کئی بار قسمیں لیں اور حلف اٹھوایا کہ میں واپس ضرور آؤں گا۔ میرا دل صاف تھا۔ جو کچھ وہ کہتی گئی میں کرتا گیا۔

تاجروں کا ایک قافلہ قزوین کی راہ سے رے جا رہا تھا میں بھی افشید کو لے کر اس میں شامل ہو گیا۔ راستے بھر وہ خاموش رہی یہاں تک کہ وطن کے چوکور آتش کدے دکھلائی دیئے تو افشید کے ساتھ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں اور مجھے اپنا ماضی بری طرح یاد آنے لگا۔

شریح نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ لیکن جب اسے تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ چیخ مار کر رونے لگا۔

افشید زیادہ باتیں تو نہیں کرتی تھی لیکن یہاں اس نے ایک عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا۔ وہ چپ چاپ مجھے اٹھاتی اور حویلی کے چمن میں لگے ہوئے شہتوتوں کے سائے میں لے جاتی اور کھوئی ہوئی کچھ تلاش کرتی رہتی پھر ایک گھاس کے قطعے کی طرف اشارہ کر کے کہتی "کیوں سہیل! یاد ہے نا ہم دونوں یہیں بیٹھا کرتے تھے؟"

میں آہستہ سے کہتا "ہاں!"

وہ چپ چاپ میری صورت تکنے لگتی۔ اس کے بعد مجھے ایک پستہ قد سرو کے نیچے لے جاتی۔
"اور یہاں ہم دونوں گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔"
میں پھر چپکے سے "ہاں" کہہ کر خاموش ہو جاتا۔
پھر مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں ہم دونوں ایک ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔ وہ پوچھتی "اور یہ بھی یاد ہے نا کہ یہاں ہم دونوں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے؟"
"ہاں" میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تو اس نے مجھے کچھ بغور جستجو خیز اور اداس نظروں سے گھورا۔
یہ چکر مہینوں چلتا رہا۔ میں اسی اُلجھن میں تھا کہ اس سے واپسی کی اجازت کس طرح طلب کروں؟ میں نے اس سے دریافت کیا۔ "افشید! مجھ سے شادی کرو گی؟"
"نہیں تو!" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔
"پھر میں جاؤں؟" میں نے اجازت طلب کی۔
"کہاں؟ اصفہان؟ جلدی کیا ہے چلے جانا ہمیشہ کے لئے چلے جانا!" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا وہاں وہ تکیے میں منہ چھپائے اسے بھینچ بھینچ کر رو رہی تھی۔
مجھ سے اس کا رونا نہیں دیکھا جاتا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ میں عُلیہ کے پاس واپس نہ جاؤں، لیکن ایک روز عُلیہ خود ہی میرے پاس پہنچ گئی۔ جلدی جلدی واپسی کی تیاریاں ہوئیں، افشید یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن وہ زبان سے ایک لفظ نہ نکال رہی تھی۔
عُلیہ سے بچ کے چپکے دریافت کیا۔ "کیا واپس جا رہے ہو؟"
میں نے کہا "ہاں"
پوچھا۔ "اب کب آؤ گے؟"
میں نے جواب دیا۔ "کچھ پتا نہیں!"
اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور آہستہ سے کہا۔ "اچھا"
وہ مجھے قافلے کے پڑاؤ تک رخصت کرنے آئی اور اس وقت تک بڑی قافلے کو تکتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا میری نظروں نے بھی جواب دے دیا اور جب افشید کا وجود نقطۂ موہوم بن کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دل کو بہلانے کے لئے آتشکدوں کی چوکور عمارتوں کو دیکھنا شروع کیا لیکن جب وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا پھیلنے لگا اور یہ اندھیرا ایسا پھیلا کہ دل کا داغ اور آنکھوں کا نور آنسو بن کر بہہ نکلے۔

لال کنور کا افسانہ

اورنگ زیب کو اس جہان سے رخصت ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ شہزادہ معظم نے اپنے دوسرے بھائیوں کو مغلوب اور ہلاک کر کے شاہ عالم بہادر شاہ کے نام سے اورنگ زیب کی جانشینی اختیار کی اور صرف پانچ سال حکومت کر سکا جس میں سے آخری تین سال تک وہ دریائے راوی کے ساحل پر خیمہ زن رہا۔ شہزادہ معظم شاہ عالم بہادر شاہ کی سنجیدگی اور دانائی بے مثل تھی لیکن جب اس نے ساحلِ راوی پر خیمہ زنی کے دوران لاہور کے تمام کتوں کو ہلاک کئے جانے کا مہمل اور بے معنی فرمان جاری کیا تو اس کے ساتھی ہکا بکا رہ گئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس پر ضرور جن یا کسی آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے۔ بعد میں جب وہ بیمار پڑا تو اس کے چار بیٹوں میں سے دو اس کے پاس ہی موجود تھے۔ جہاں دار شاہ اور عظیم الشان۔ جہاں دار شاہ اپنے چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور عظیم الشان اس سے چھوٹا۔ اُن دنوں عظیم الشان کو اپنے بادشاہ باپ کا سب سے زیادہ قرب حاصل تھا۔

لشکری خیموں اور بازاروں میں سراسیمگی اور ہراسانی پھیلی ہوئی تھی۔ جس طرح طوفان کی آمد سے پہلے ہی اکثر پرند اپنی پُراسرار جبلت سے اس کا علم حاصل کر کے ترکِ مکانی کر جاتے ہیں۔ اسی طرح کوئی چیز تھی جس نے لشکریوں کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ سوداگر اپنا سامان سمیٹ کر چپ چاپ وہاں سے فرار ہو رہے تھے۔ جس کو دیکھئے بچوں کی انگلیاں پکڑے یا گود میں دبائے نقاب یا چادر میں سر تا پا چھپائے عورتوں کے ساتھ اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔ شاہی لشکر گاہ اجڑ گئی۔ بازاروں میں لوٹنے کے لئے کتے بھی عنقا تھے۔ بس خاص خاص اُمرا، شہزادگان اور اُن کی سپاہ کے خیمے اپنی اپنی جگہ ایستادہ تھے اور یہ سب بادشاہ کی موت کے منتظر تھے اور اپنی پسند کے شہزادوں کی حکومت کے لئے تدبیریں اور سازشیں کرنے میں مشغول تھے۔ لوگوں کی بھگدڑ نے پوری فضا کو گرد آلود کر دیا تھا۔ بخار میں مبتلا بادشاہ کو اس منحوس اور ہنگامی کیفیت سے لاعلم رکھا گیا تھا۔

شاہ عالم بہادر شاہ کے خیمے میں موت کا سکوت طاری تھا۔ سب سے بڑا بیٹا جہاندار شاہ سامنے سر جھکائے مؤدب کھڑا ہوا تھا۔ اس سے کافی دور ایک گوشے میں بادشاہ کا سب سے زیادہ چہیتا بیٹا عظیم الشان سرکاری کاغذات پر جھکا ہوا بیمار باپ کی طرف سے احکام جاری کر رہا تھا۔ باپ کی شاہی مُہر اس کے قبضے میں تھی۔ وہ کاغذات پڑھتا، اُن پر کچھ لکھتا اور دستخط کر کے مہر لگا دیتا۔ جہاندار شاہ

نے ایک آدھ بار نگاہِ غلط انداز سے اپنے خوش نصیب بھائی کو دیکھا اور اندر ہی اندر کھول گیا عظیم الشان اس کا چھوٹا بھائی غاصب تھا جو عنقریب اس کا حق غصب کرنے والا تھا۔ خیمے کے بغلی حصّوں میں کھڑے کئے پردوں پیچھے اس پار شاہی بیگمات تھیں جو امید و بیم میں بوڑھے بادشاہ کے سنبھالے یا موت کی منتظر تھیں

بخار میں تپتے ہوئے بہتّر سالہ بوڑھے بادشاہ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور سرسری نظروں سے خیمے کا جائزہ لیا۔ شہزادہ جہاندار شاہ تعظیماً زیادہ جھک گیا۔ بادشاہ نے حسرت سے اسے دیکھا۔ اور اس کی پیشانی غصّے سے شکن آلود ہوگئی۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں پُر وقار لہجے میں سوال کیا۔ "لال کنور کہاں ہے؟"

جہاندار کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ "جہاں پناہ! اپنے خیمے میں۔"

"ہاں!" بادشاہ بڑبڑایا۔ "تم ولی عہد تھے۔ ہمارے سب سے بڑے بیٹے۔ لیکن تمہاری اقلیمِ دل پر لال کنور نے قبضہ کر لیا ہے۔ یہ لال کنور وہی ہے نا جو ہمارے جدِّ بزرگ اکبرِ اعظم کے درباری گویّے تان سین سے رشتے داری رکھتی ہے۔"

"جہاں پناہ کا علم شک و شبہے سے بالا ہے۔ یہ وہی ہے۔" جہاندار شاہ نے انکسار اور لجاجت سے جواب دیا۔

"بے شرم!" بادشاہ نے غصے سے پھر کر رخ بدلی۔ "تم نااہل ہونے کے ساتھ ساتھ بے شرم بھی ہو۔ ہم لال کنور کو ہرگز برداشت نہ کریں گے۔"

جہاندار شاہ نے اور زیادہ ہمت سے کام لیا۔ "قبلہ بندگان! اب تو وہ جہاں پناہ کی بہو ہونے کا شرف بھی حاصل کر چکی ہے۔"

شاہ عالم کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "ہم اُسے بہو کبھی بھی تسلیم نہ کریں گے۔ وہ ہمارے حضور اپنے طائفوں کے ساتھ رقص و موسیقی کے کمالات دکھانے آیا کرتی تھی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایک تیموری شہزادہ اور ولی عہدِ سلطنتِ مغلیہ اس کی خم دار زلفوں اور گھیرے گھیر کی پشواز پر اپنا سب کچھ قربان کر دے گا۔ عزت، آبرو، شان، دبدبہ، سطوت، غیرت، حمیت۔ تم نے سب کچھ اس ڈومنی پر قربان کر دیا۔"

جہاندار شاہ کو باپ کی باتیں بُری تو بہت لگیں لیکن دو چار گھڑی کے مہمان بوڑھے باپ کی ساری باتیں مصلحتاً برداشت کی گئیں۔ حالانکہ اس وقت وہ اپنی چہیتی محبوبہ دلنواز لال کنور کے ایماء پر ہی بارگاہِ عالی میں حاضر ہوا تھا۔ لال کنور کی اس وقت سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ شاہ عالم

کے مرنے سے پہلے وہ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی بہو تسلیم کر لیے جانے کا شرف حاصل کرے۔ لیکن بوڑھا بادشاہ بخار کی شدت اور ہیجان میں بھی لال کنور کو بہو ماننے پر تیار نہ تھا۔ جہاندار شاہ جب باپ کے خیمے میں داخل ہوا تھا تو وہ بہت پر امید تھا لیکن باپ کا قلب تو اس چٹان کی مانند تھا جس پر رحم اور نرمی کے بیج نہیں بوئے جا سکتے تھے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ جہاندار کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دے رہا تھا ایک طرف حکومت تھی۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کی حکومت، دولت و ثروت تھی، خزانے تھے، وسیع اختیارات تھے۔ افواج تھیں اور بے انتہا حسین اور خوشگوار مستقبل تھا بھرا پُرا شاہی خاندان تھا، عالیشان اور بے مثال محلات اور قلعے تھے، تو دوسری طرف لال کنور تھی، طائفے تھے، آلاتِ موسیقی تھے، کلاونتوں کی فوج تھی، راگ رنگ، ساز و آواز، لال کنور کے بھائی بند اس کی ہم پیشہ طرحدار گانے والیاں تھیں۔ فیصلہ بہت آسان اور واضح تھا۔ جہاندار کو اپنی اصل کی طرف جانا چاہیئے تھا لیکن اس نے لال کنور کے مقابلے میں ہر شئے کو ٹھکرا دیا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے بانی اور اس کے جدِ اعلیٰ نے کہا تھا۔ اس وقت وہی اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'

یہ ایک فال تھی، شگون تھا۔ وہ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ شدتِ غم اور عالمِ مایوسی میں شاہِ عالم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جہاندار شاہ نے گوشے میں بیٹھے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی عظیم الشان کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ عظیم الشان نے اپنے سامنے رکھے ہوئے خنجر کو اٹھا لیا اس کی نظریں بڑے بھائی جہاندار پر تھیں اور ہاتھ خنجر سے کھیل رہے تھے۔ جہاندار شاہ کو غلط فہمی ہوئی کہ چھوٹا بھائی اسے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک نظر اپنے بیمار اور کمزور باپ پر ڈالی۔ اس میں اتنی جان نہ تھی کہ اگر عظیم الشان، جہاندار شاہ پر خنجر سے حملہ کر دے تو وہ اٹھ کر اس کا دفاع کرے۔ وہ خوفزدہ اور سراسیمہ سا خیمے کے دروازے کی طرف مڑا۔ آدابِ شاہی کا بوکھلاہٹ میں خیال ہی نہ رہا۔ دیوانوں کی طرح بھاگ کھڑا ہوا۔ خیمے کے دروازے سے ٹکر ہوئی۔ سر میں چوٹ آئی۔ اور سر کی پگڑی دُور جا گری۔ بھاگنے میں جوتیاں بھی آڑے آ رہی تھیں۔ ان سے بھی گلو خلاصی کر لی گئی اور ننگے پیر ہی خیمے سے باہر نکل گیا۔ باہر خیمے کی ڈوریوں نے پیر پکڑے اور وہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا۔ باہر اس کی پالکی تیار تھی۔ جہاندار شاہ کے ذاتی ملازمین نے اسے خیمے کے باہر ڈوریوں سے اُلجھ کر اوندھے منہ گرتے جو دیکھا تو خود بھی گھبرا گئے۔ وہ سمجھے کہ اندر ضرور کسی محلاتی سازش سے شہزادہ جان بچا کر بھاگا ہے۔ انہوں نے اپنے ولی نعمت کو جلدی سے اٹھا لیا اور اسے پالکی میں بٹھا یہ جا وہ جا فرار ہو گئے۔

اس افراتفری اور ہلکے سے ہنگامے میں شاہ عالم کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اس جگہ دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے جہاندار شاہ کھڑا تھا۔ اب وہ جگہ خالی تھی۔

عظیم الشان اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے بڑے بھائی کی جوتی اور پگڑی کو قابو میں کیا۔ بوڑھا باپ مفرور بیٹے کی بابت اب کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔

جہاندار شاہ جب اپنے خیمے کی حدود میں داخل ہوگیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس کے اتی خیمے کے گردوپیش دُور تک اس کے دربار سے وابستہ امراء اور سپاہیوں کے خیمے نصب تھے جب وہ پالکی سے اُتر کر اپنے خیمے میں داخل ہو رہا تھا تو لال کنور کا حقیقی بھائی خوشحال خان ر اجالا لایا۔ یہ شخص طنبورہ بجانے میں ماہر تھا اور اپنی بہن کے توسط سے جہاندار شاہ کے خاص مقربین ں داخل ہوگیا تھا۔ لال کنور اس کی پذیرائی تک کو نہ اٹھی۔ اس نے ایک ادائے دلبرانہ سے ہاندار شاہ کو دیکھا اور اپنے نرم و نازک بستر میں ڈوب گئی۔ پورا خیمہ عنبر اشہب سے مہک رہا تھا۔ شحال خاں باہر ہی رہ گیا۔ وہ جہاندار شاہ کی خدمت میں باریابی کا خواہشمند تھا۔

جہاندار شاہ حسین و جمیل مغموم اور اداس لال کنور کے قریب پہنچ گیا۔ اور اس نے اس کے سساروں کو چھو کر دیکھا اس کا خیال تھا شاید لال کنور کی طبیعت خراب ہو گئی ہے لیکن رخسار ٹھنڈے تے۔ لال کنور نے منہ پھیر لیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ جہاندار شاہ دوسری طرف پہنچ گیا۔ ر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ "کیا بات ہے یہ تم بیزاری کا اظہار کیوں کرتی ہو؟"

لال کنور نے اٹھلا کر جواب دیا "میں لال کنور ولی عہد سلطنت مغلیہ کی محبوبہ ہوں لیکن ابھی ے اپنی صحیح قدر و قیمت حاصل نہیں کر سکی ہوں۔" لال کنور گستاخی کی حد تک جہاندار شاہ سے بے تکلف تھی۔

جہاندار شاہ نے اُسے اٹھا کر اپنی آغوش میں لے لیا اور پوچھا۔ "کہو کیا کہنا چاہتی ہو" پھر کچھ ٹھہر ر آہستہ سے بولا "تمہاری صحیح قدر و قیمت تو اس وقت ملے گی جب ہم اپنے جملہ بھائیوں کو ہلاک بیکار کر کے بلا شرکت غیرے ہندوستان کے بادشاہ ہو جائیں گے۔ لیکن عظیم الشان کی موجودگی سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔"

"بوڑھے بادشاہ کا دم نکلا یا نہیں؟" لال کنور نے سسک لہجے میں دریافت کیا۔

جہاندار شاہ اپنے باپ کے لئے یہ نازیبا اور ہتک آمیز الفاظ سن کر تلملا گیا لیکن وہ لال کنور بے حد چاہتا تھا۔ یہ ذلت بھی گوارا کر لی۔

حسین لال کنور نے جہاندار شاہ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور پوچھا: "کیا بھائی خوشحال خاں سے ملاقات ہوئی؟"

"ہاں۔" جہاندار شاہ نے جواب دیا۔ "وہ اب بھی خیمے کے در پر موجود ہوگا۔"

لال کنور نے ولی عہد کے سینے سے اپنا سر لگا دیا۔ جہاندار اس کے بستر پہ بیٹھ گیا۔

"خوشحال خاں اس لئے حاضر ہوا ہے کہ وہ مجھے یہاں سے لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کہیں دُور چلا جائے۔" لال کنور کہنے لگی۔ "لیکن میں تم سے محبت کرتی ہوں، میں نہیں جانا چاہتی۔" اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

جہاندار کا دم کھینچنے لگا۔ "لیکن ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے، تم سلطنتِ مغلیہ کی ملکہ بننے والی ہو۔ ہم تمہیں وہ مقام عطا کریں گے جو ہمارے بزرگوں نے نور جہاں اور ممتاز محل کو عطا کیا تھا۔"

"شہزادے!" لال کنور نے زبان کھولی۔ "عظیم الشان، تمہیں ہرگز بادشاہ نہ بننے دے گا۔"

"ہم بھی یہی سمجھتے ہیں۔" اس کے بعد جہاندار شاہ نے تھوڑی دیر پہلے شاہی خیمے میں پیش آنے والے واقعے کا ذکر کر کے کہا۔ "ہم سوچتے ہیں کہ اگر ہم رسمِ تاجپوشی ادا نہ کر سکیں اور مغلیہ تاج و تخت سے محروم رہیں تو ہمیں نہایت خاموشی سے اپنے زیرِ انتظام صوبے ملتان چلا جانا چاہیئے۔"

اچانک خیمے کی داہنی دیوار کے پیچھے سے سسکیوں کی آواز اُبھری۔ جہاندار شاہ نے چونک کر اس طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں لال کنور سے کچھ دریافت کیا۔ لال کنور تو جیسے اس موقعے کی منتظر ہی تھی کہنے لگی۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھے بہت چاہتے ہو؟"

"بالکل۔" جہاندار شاہ نے جواب دیا۔ "اگر درمیان میں تم نہ ہوتیں تو بلا کسی کشمکش اور تردد کے قبلہ عالم ہمیں اپنا جانشین نامزد فرما دیتے۔" پھر سرد آہ بھر کر بولا۔ "انہیں تم سے نفرت ہے کہتے ہیں تم تان سین کے خاندان کی ایک ناچنے گانے والی عورت ہو، تمہاری اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں، تم خاندانی وجاہت سے محروم ہو۔"

لال کنور نے جہاندار شاہ کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ غصے میں تن تنا کر کھڑی ہو گئی۔ "تب تو یہ بوڑھا جب مر جائے گا تو میں خوشی میں شیرینی تقسیم کروں گی۔ یہ تمام شاہ خاندانی وجاہتوں کے پیچھے ہی پڑے رہیں گے۔"

جہاندار شاہ کی تیموری غیرت تو اسی دن رخصت ہو چکی تھی جب اس نے لال کنور جیسی معمولی عورت کو اپنا دل دے دیا تھا۔ اپنے باپ کے حق میں اس کے یہ گستاخانہ کلمات بھی اسے مشتعل نہ کر سکے

اس عالم میں خیمے کے باہر سے کچھ شور وغل کی آوازیں آنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ مشتعل لوگ جہاندار شاہ کے خیمے میں داخل ہونا چاہتے ہوں۔ شہزادہ ابھی تک عظیم الشان کے خنجر والا آتر دل سے نکال نہ سکا تھا۔ اسے شبہ گزرا کہ یقیناً شاہ عالم کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کا بھائی اپنی فوج لے کر اس کی گرفتاری کے لئے سر پر آ گیا ہے۔ وہ معاملے کی تفتیش کئے بغیر ہی لال کنور کو خیمے کے پچھلے حصے سے لے کر فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ بدحواس ہو کر خیمے کے اندر اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ اسی عالم میں کسی اجازت کے بغیر خوشحال خاں اندر آ گیا۔ وہ خود بھی بہت ڈرا سہما تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "شہزادے! پناہ! مجھے بچا لو، یہ موذی مجھے جان سے مار دیں گے۔"

جہاندار شاہ کے شک کو اور تقویت پہنچی۔ اس نے لال کنور کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا چھوٹے دروازے سے نکل کر داہنی جانب چلا گیا۔ یہ وہی حصّہ تھا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے سسکیوں کی آواز اُبھری تھی۔ جہاندار شاہ کے بھاگتے ہوئے قدم ایک دم رک گئے۔ اس کے سامنے ایک سولہ سترہ سالہ حسین لڑکی بندھی پڑی تھی۔ لڑکی کی سیاہ اور لمبی زلفوں نے اس کے درخشاں چہرے پر نقاب ڈال رکھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھ دیئے گئے تھے اور اسی رسّی سے دونوں پیر بھی جکڑ دیئے گئے تھے۔ بالوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی وہ خوف زدہ آنکھیں بے بسی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

جہاندار شاہ ٹھٹک کر رُک گیا۔ "یہ کون ہے؟" اس نے لال کنور سے دریافت کیا لیکن ابھی کوئی جواب بھی نہ ملا تھا کہ چھوڑے ہوئے خیمے کی طرف سے ایک خواص آئی اور اس نے پریشانی کے عالم میں عرض کیا۔ "شہزادے! باہر کچھ آدمیوں کے ساتھ میر بخشی ذوالفقار خان آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔"

اب شہزادے کی جان میں جان آئی کیونکہ ذوالفقار خان اس کے دادا اورنگ زیب کے زیر عظم سعد خان کا جوانمرد بیٹا تھا۔ اور شہزادے کو اس کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ جہاندار شاہ نے ایک بار پھر مظلوم لڑکی کو دیکھا۔ اسی لمحے خوشحال خاں نے اپنی بہن لال کنور کو کچھ اس طرح دیکھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ یہی وہ موقع ہے کہ بات صاف صاف کر لی جائے۔ ذوالفقار خان کی ملاقات سے پہلے ہی لال کنور بڑھ کر جہاندار شاہ کے سینے سے لگ گئی اور تحکمانہ لہجے میں بولی "ٹھیک ہے تم ذوالفقار خان سے مل لو، میں جانتی ہوں یہ وزیر کا بچہ تم سے کیا باتیں کرے گا۔ لیکن دوران گفتگو تم اس سے کوئی وعدہ نہ کر بیٹھنا۔ یہ لڑکی زینت، بھائی خوشحال خان کی محبوبہ اور امانت ہے۔ خوشحال خان اسے چاہتا ہے۔ لوگ

زینت اور خوشحال خاں کے درمیان خاندانی برتری اور کمتری کے نام سے دیواریں کھڑی کر دینا چاہتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ آج خوشحال خاں کے خاندان سے زیادہ معزز ہندوستان میں دوسرا کوئی خاندان نہیں۔" یہ کہتے کہتے لال کنور کسی سہانے خواب میں کھو گئی۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ جہاندار شاہ کے ہاتھ کو سہلانے لگی۔ "میں مستقبل کے ہندوستان کی ملکہ ہوں اور خوشحال خاں ملکہ کا بھائی ہے اور اس کا یہ اعزاز ہندوستان کے دوسرے خاندانوں کے مقابلے میں غیر معمولی اور بے مثال ہے۔"

جہاندار شاہ فوراً معاملے کی تہہ کو پہنچ گیا۔ اس نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی، وہ پہلی بار غصّے میں چیخی۔ "میں اس کمینے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں جان دے دوں گی لیکن اس کے ساتھ نہ رہوں گی۔" یہ کہتی ہوئی وہ بستر سے پھسل کر زمین پر گر گئی اور پاگلوں کی طرح اپنے سر کو زمین پر پٹکنے لگی۔ خوشحال خاں نے دوڑ کر اس کے سر کو پکڑ لیا۔ لڑکی نے کسی طرح اس کے ہاتھ کو دانتوں سے چبا ڈالا۔ خوشحال خاں کی چیخ نکل گئی۔ لال کنور نے جہاندار شاہ کو چھوڑ دیا اور غصے میں لڑکی کی طرف بڑھی۔ انتہائی درندگی سے بالوں کو پکڑ کر کئی جھٹکے دیئے اور پے در پے اس کے سر پر کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ "میرے سامنے تیری یہ ہمت کہ تو آداب شاہی کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دے۔ میں تجھے قتل بھی کرا سکتی ہوں لیکن میں تجھے زندہ رکھوں گی اور خوشحال خاں سے منسوب کر کے تیرے ذاتی اور خاندانی پندار کو پارہ پارہ کر دوں گی۔"

لڑکی نے خوشحال خاں کے ہاتھ کو دانتوں کی گرفت سے آزاد کر دیا اور بے دم ہو کر پڑ رہی۔

لال کنور نے جہاندار شاہ کو حکم دیا کہ "تم باہر جاؤ اور ذوالفقار خان سے صاف صاف کہہ دو کہ وہ اس لڑکی کی وکالت سے باز آجائیں، یہ واپس نہیں جائے گی، بھائی خوشحال خاں کے پاس رہے گی۔" اس کے بعد وہ زینت سے مخاطب ہوئی۔ "تمہارا کھانا پینا بند۔ تم اطمینان سے اپنا سر پھوڑتی رہو۔ ہم دوسرے خیمے میں تمہارے اپنے ہی ہاتھوں تمہاری موت کے منتظر ہیں۔"

اس کے بعد لال کنور اور خوشحال خاں جہاندار شاہ کے ذاتی خیمے میں چلے گئے اور خود جہاندار شاہ تذبذب اور دودلا خیمے سے باہر نکل گیا۔ باہر اب بھی شور و غل اور ہنگامہ برپا تھا۔

باہر ذوالفقار خان چند معزز اُمراء کے ساتھ جہاندار شاہ کا منتظر تھا۔ وہ جیسے ہی نمودار ہوا سبھی آداب بجا لائے۔ ذوالفقار خان دو قدم آگے بڑھا اور فیصلہ کن بھاری آواز میں بولا۔ "غلام تو شہزادے کو ہندوستان کا تاج و تخت دلانے کی کوششوں میں مصروف ہے لیکن شہزادے کے بعض نادان

اور کم عقل مقرب اپنی غلط حرکتوں سے گڑھے کھود رہے ہیں، اگر شرفاء کی عزت و آبرو ہی محفوظ نہ رہی تو پھر لوگ خلوص و ایثار کہاں سے لائیں گے۔"

جہاندار شاہ وقت کی نزاکت اور ذوالفقار خان کی لطیف دھمکی سے واقف تھا۔ اس نے معصومیت سے دریافت کیا "ہم تمہاری اعانت کے بغیر کچھ بھی نہیں، واقعے کو تفصیل سے عرض کیا جائے۔ اورنگ زیب کا پوتا انصاف سے کام لے گا۔"

اُمراء کے چہروں پر جہاندار شاہ کے مرتبے اور دبدبے کا کوئی تاثر نہ تھا۔ ذوالفقار خان نے ایک پریشان حال ادھیڑ عمر تاجر کو اشارے سے اپنے قریب بُلایا۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور کپڑے تار تار تھے۔ کہنیوں اور پنڈلیوں سے خون رِس رہا تھا۔ وہ ذوالفقار خان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ "خوشحال خاں اس کی لڑکی سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے اور شہزادے کے سپاہیوں کی مدد سے اسے اغوا کر لایا ہے۔ یہ میرا پڑوسی ہے، غلام کی درخواست ہے کہ از راہِ خسروانہ لڑکی کو واپس دلایا جائے اور اس رکیک حرکت کے مرتکبین کو قرار واقعی سزا دی جائے۔"

جہاندار شاہ نے اس مظلوم کی طرف دیکھا جو یقیناً خوشحال خاں کی ایماء پر اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں اپنی لڑکی کو بچاتے ہوئے زخمی ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ شہزادہ سخت مشکل میں تھا کہ ذوالفقار خان کو کیا جواب دے کیونکہ اندراس کی حسین محبوبہ لال کنور پہلے ہی یہ تنبیہہ کر چکی تھی کہ وہ زینت کے سلسلے میں کوئی وعدہ ہرگز نہ کرے۔

ذوالفقار خان نے دو دِلے اور مذبذب شہزادے کی کیفیت کو بھانپ لیا۔ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "اگر شہزادے کو میری درخواست کے ماننے میں تامل ہے تو غلام بھی کسی دوسرے دربار میں قسمت آزمائی کرے گا۔"

اور جہاندار شاہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے مغلیہ تاج و تخت دھوئیں کی طرح فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ "ذوالفقار خان! تمہیں مایوس نہیں کیا جائے گا۔"

ذوالفقار خان حاوی تھا۔ "بندگانِ مغلیہ سرکار اسی وقت بامراد واپس جانا چاہتے ہیں۔"

جہاندار شاہ نے جواب دیا۔ "تمہاری درخواست کا ایک حصّہ اسی وقت منظور کر لیا جائے گا اور اس پر عمل درآمد بھی ہو جائے گا لیکن بقیہ کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔"

ذوالفقار خان اور اس کے ساتھی دوسرے اُمراء سمجھ گئے کہ جہاندار شاہ لڑکی کو تو اسی

وقت واپس دلا دینا چاہتا ہے لیکن خوشحال خاں اور اس کے ساتھیوں کو سزا نہیں دینا چاہتا۔ انہوں نے بھی اصرار نہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد زینت اس کے باپ کے حوالے کر دی گئی اور اندر خوشحال خاں بے بسی سے اس کی واپسی پر آنسو بہاتا رہا۔ لال کنور کو ایسا محسوس ہوا جیسے زینت اس کے منہ پر تھوک کر چلی گئی ہو۔ جہاندار شاہ دیر تک حالات، وقت کی نزاکت اور اپنی مجبوری کا رونا روتا رہا۔ اس نے لال کنور کو بتلایا کہ اگر ذوالفقار خان دل برداشتہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ دے تو وہ دوسرے دربار سے وابستہ ہو جائے گا اور وہ اس کے جانی دشمن بھائی عظیم الشان کے سوا کوئی اور نہ ہوگا۔ اور جس کا یہ مطلب ہوگا کہ مغلیہ تاج و تخت کی حصولیابی محض سنہری خواب بن کر رہ جائے گا جو شاید کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے اور پھر وہ خود کبھی بھی ملکۂ عالیہ نہ بن سکے گی۔ لال کنور پہلے تو خوب بپھری اور ناز و غمزے دکھاتی رہی پھر وقت سے سمجھوتا کر لیا۔ اسے اپنے بھائی خوشحال خاں سے سخت شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ جہاندار شاہ ولی عہد سلطنتِ مغلیہ کی محبوبہ ہونے کے باوجود ایک حقیر تاجر کی لڑکی کو جبراً روکنے میں ناکام رہی تھی۔

اس واقعے کے کئی دن بعد شاہ عالم کا انتقال ہو گیا اور برسر اقتدار آنے کے لئے شہزادوں میں کش مکش اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ عظیم الشان فائدے میں تھا کیونکہ باپ کی موت کے وقت وہ اس کے قریب ہی تھا اور دوران علالت سارے احکام شاہی اس کے قلم اور خواہش سے انجام پا رہے تھے۔ شاہ عالم کی موت سے کئی دن پہلے ہی امراء اور ارکان سلطنت اپنی اپنی پسند کے شہزادوں کی خدمت میں چلے گئے تھے۔

عظیم الشان شاہی خیموں پر قابض تھا۔ جہاندار شاہ کی نظریں جب اُدھر جاتیں تو دل پر مایوسی غلبہ پا لیتی۔ اور ایسا معلوم دیتا جیسے بغیر جنگ و جدل اور خون خرابے کے تاج و تخت عظیم الشان کے قبضے میں چلے گئے ہیں، جب وہ مایوس اور دل شکستہ ہو گیا تو اس نے طے کیا کہ اسے ملتان کی صوبے داری پر ہی اکتفا کرنی چاہئے۔ ملتان کی صوبے داری اسے دادا اورنگ زیب سے حاصل ہوئی تھی لیکن لال کنور اس کے ارادے سے متفق نہ تھی۔ جہاندار شاہ کی بزدلی اور قناعت سے اس کا ملکۂ عالیہ بننے کا تصور خاک میں ملا جا رہا تھا۔ اس لئے اس نے جہاندار شاہ کو ذوالفقار خان کا وعدہ یاد دلایا۔

خوشحال خاں کو اس ہنگامے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ خود اس معرکے میں کوئی حصہ نہ لے سکتا

تھا۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتا تھا کہ جہاندار شاہ ہندوستان کی قسمت کا مالک بن جائے، اس کے برسر اقتدار آجانے سے خوشحال خاں اور اس کے خاندان کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس نے اپنی بہن کے مشورے سے بھی طے کیا تھا کہ کسی طرح جہاندار شاہ کامیاب ہو جائے تو جن لوگوں سے انتقام لینا تھا ان میں سرفہرست ذوالفقار خان کا نام تھا۔ اسے رہ رہ کر زینت کا خیال آتا تھا۔ زینت کے فراق میں اس کا کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔ محبت کو محبت سے جیتا جاتا ہے کے بجائے، محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اس کے نزدیک یہ نقطۂ نظر زیادہ حقیقت پسندانہ تھا۔

زینت کے خاندان کا خیمہ جس جگہ نصب تھا، خوشحال خاں اس کے ہیرے پھیرے کرنا تو ضرور چاہتا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہاں تک پہنچنے سے پہلے ذوالفقار خان اور اس کے سپاہیوں کا سامنا ہو جانا یقینی تھا۔ دل میں محبت کی آگ تو ضرور روشن تھی لیکن اس آگ میں عاقبت نااندیشانہ قوتِ عمل اور ارادوں کی توانائی موجود نہ تھی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو چوری چھپے یہ پتا لگانے بھیجا کہ زینت کے خیمے کے آس پاس نگرانی یا چوکسی کا کیا حال ہے تو معلوم ہوا کہ وہاں سے بچ کر نکل آنا ناممکن ہے۔ ذوالفقار خان کے آدمی بھیڑیوں کی طرح اپنے شکار کی بُو سونگھتے رہتے ہیں۔

لے دے کے بس ایک ہی ترکیب امید افزا تھی، وہ یہ کہ کسی طرح جہاندار شاہ کو برسر اقتدار آجانا چاہیئے لیکن اس کے طنبورے بجانے والے ہاتھ جہاندار شاہ کی کسی عملی مدد سے قاصر تھے۔ وہ بڑی دیر تک اپنے خاندان والوں کے خیموں کے آس پاس گھومتا پھرتا رہا۔ اس کی نظریں بار بار شاہی خیموں کی طرف اٹھ جاتیں جہاں عملاً عظیم الشان شاہ عالم کی جگہ لے چکا تھا۔ اس کے خیمے سے نکلنے اور اندر جانے والوں کا ہجوم حریفوں کے حوصلے پست کر دینے کے لئے کافی تھا۔ دوسری طرف بہت دُور مغرب میں خجستہ اختر اور رفیع القدر کے خیمے نصب تھے، یہ دونوں جہاندار شاہ کے عظیم الشان سے بھی چھوٹے بھائی تھے۔ خوشحال خاں نے دیکھا کہ وہاں بھی آدمیوں کا ہجوم ہے لیکن اس ہجوم میں عظیم الشان کے آدمیوں جیسا جوش و خروش نہ تھا۔ اس کے برعکس جب اس نے جہاندار شاہ کی حیثیت پر غور کیا تو اسے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ یہاں ہر سمت مایوسی اور اداسی کا قبضہ تھا۔ اس نے سوچا کہ کہاں گیا وہ ذوالفقار خان جو کہتا تھا کہ زینت کو واپس کر دو۔ میں تمہیں ہندوستان کا تاج و تخت دلا دوں گا۔ ذرا سی دیر کے لئے اس نے یہ بھی سوچا کہ لال کنور جہاندار شاہ کے بجائے اگر عظیم الشان کے دل کو جیت لیتی تو کتنا اچھا تھا لیکن خوشحال خاں یہ بھول گیا تھا کہ جہاندار شاہ کی قدر و قیمت اس کے باپ شاہ عالم کی نظر سے اس خوبصورت بلا اپنی بہن لال کنور ہی کی وجہ سے تو

گر گئی تھی۔ اگر لال کنور عظیم الشان کے پہلو میں ہوتی تو یقیناً آج جہاندار شاہ کی جگہ عظیم الشان ہوتا اور عظیم الشان کی جگہ جہاندار شاہ کو حاصل ہوتی۔ اس کے خیال میں اب بھی اس کا موقع تھا کہ وہ شکست خوردہ اور ناکام جہاندار شاہ سے پیچھا چھڑا کے عظیم الشان کے دل میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

وہ چوری سے اپنی بہن سے ملا اور اپنی تجویز کا بے تکلفی سے اظہار کر دیا۔ لال کنور بھی سوچ میں پڑ گئی اور تھوڑی دیر تک خیمے کے پردے پر بنی ہوئی مچھلی کی تصویر کو گھورتی رہی۔ خوشحال خان اس کے سکوت سے یہ سمجھا کہ شاید لال کنور رضامند ہو رہی ہے، اس نے مزید ڈھارس بندھائی۔ "تمہیں اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کرنا پڑے گا۔ میں خود کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

لیکن لال کنور کو اپنے بھائی کی اس تجویز سے اختلاف تھا۔ کہنے لگی۔ "وقت کا انتظار کرو دیکھو مستقبل جہاندار شاہ کے حق میں کیا فیصلہ صادر کرتا ہے۔" لیکن وہ پری پیکر مستقبل کے اندیشوں سے خوفزدہ بھی تھی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی: "اگر قسمت میں یہی لکھا ہے کہ جہاندار شاہ پورے ہندوستان کے بجائے ملتان کی صوبے داری پر اکتفا کرے تو میں بھی اس پر قناعت کر لوں گی۔ میں جہاندار شاہ کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔ مجھے اس سے محبت بھی تو ہے۔"

خوشحال خاں کو غصہ آگیا لیکن اس غصے کا اظہار نہ کر سکا۔ افسوسناک لہجے میں بولا۔ "بہرحال میں ایک بھائی کی حیثیت سے ہمیشہ یہی چاہوں گا کہ تم خوش و خرم رہو اور ملک کی سب سے بڑی شخصیت تمہاری محبت کی اسیر رہے۔"

خوشحال خاں ناامید اب بھی نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دو چار مرتبہ کی کوشش سے یہ کام ضرور انجام پا جائے گا۔

ہراساں اور بدحواس جہاندار شاہ دیر تک عظیم الشان کے کروفر کا مشاہدہ کرتا رہا۔ عظیم الشان کے ارد گرد فوجیوں کے عظیم اجتماع اور گھڑ سواروں کے گرد و غبار نے اس کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ اسی عالم میں ذوالفقار خان نے اس سے ملاقات کی اور جہاندار شاہ کی ہمت بندھی۔ ذوالفقار خان کے ساتھ اس کے چند جان نثار بھی تھے، وہ خیمے کے باہر ہی رہ گئے اور جہاندار شاہ اسے عزت و تکریم سے اس خیمے میں لے گیا جو صلاح مشوروں کے لئے مخصوص تھا۔

ذوالفقار خان کو بس چند ہی باتیں کرنا تھیں۔ اس نے دریافت کیا۔ "ان حالات میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

جہاندار شاہ نے افسردگی سے کہا "فی الحال ہم بالکل مجبور اور مایوس ہیں۔"

"کیوں؟" ذوالفقار خان بولا۔ "مجبوری اور مایوسی کی وجہ؟"

"ہمارے پاس زر و مال کی کمی ہے۔ ہم سپاہیوں کی تنخواہیں تک نہیں دے سکتے اور عظیم الشان کو خوش قسمتی سے سب کچھ حاصل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملتان چلے جائیں اور وہاں کے وسائل سے فوج اکٹھا کریں اور اس سے عظیم الشان کا مقابلہ کریں۔"

"گستاخی معاف، یہ فضول سی ترکیب ہے!" ذوالفقار خان کی آواز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ "جو کچھ ہونا ہے ابھی ہوگا۔ آپ سارے کام مجھ پر چھوڑ دیں، میں دولت سپاہ اور جنگ سے متعلق جملہ وسائل کا خود بندوبست کروں گا۔"

جہاندار شاہ کے مردہ دل میں جان سی آگئی۔ "پھر کب؟"

"ابھی اسی وقت!" ذوالفقار خان نے جواب دیا۔ "میں آپ کی خواہش معلوم کرنے آیا تھا!"

جہاندار شاہ نے پوچھا "مال و زر کا کس طرح بندوبست کرو گے؟"

"یہ میرا کام ہے۔" ذوالفقار خان نے کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے میں اس وقت آپ کی خدمت میں بھیجے دے رہا ہوں۔ آپ کے اقبال سے میرے اردگرد جاں نثاروں کی بھی کمی نہیں، لیکن کسی فوجی اقدام سے پہلے ہمیں چند تدبیریں ضرور بروئے کار لانا پڑیں گی۔"

"کون سی تدبیریں؟" جہاندار شاہ اب بھی پریشان تھا اور گفتگو میں اگر مگر آنے سے خوفزدہ ہو جاتا تھا۔

ذوالفقار خان نے کہا۔ "آپ کے دونوں چھوٹے بھائی رفیع القدر اور خجستہ اختر بھی عظیم الشان کی خودسری اور بددماغی سے خوش نہیں ہیں، ہمیں ان کا اعتماد بھی حاصل کرنا چاہیئے۔"

"لیکن کیا وہ دونوں ہمارا ساتھ دینے پر رضامند ہو جائیں گے؟" جہاندار شاہ کو کسی بات کا یقین ہی نہ تھا۔

ذوالفقار خان نے پُرامید آواز میں کہا "انہیں راضی کرنا میرا کام ہے میں انہیں رضامند کر لوں گا۔"

جہاندار شاہ نے ایک ممکنہ خطرے کی نشاندہی کی۔ "لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ عظیم الشان ہمیں کسی بات کا موقع ہی نہ دے اور اچانک حملہ کر کے ہمیں تباہ و برباد کر دے۔"

"اگر اس نے ایسا کیا تو غلام اس کا حل بھی ڈھونڈ نکالے گا لیکن میں جانتا ہوں کہ شہزادہ

عظیم الشان ذوالفقار خان سے خوفزدہ ہے اور جب تک میں آپ کی پشت پر موجود ہوں آپ پر حملے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

جہاندار شاہ کو اس پر یقین تو نہ آیا لیکن ذوالفقار خان کے اس خیال میں سو فیصد صداقت تھی۔ ادھر سے فارغ ہو کر جہاندار شاہ ذوالفقار خان کو خیمے کے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ دل میں یاس اور تکدر کا قبضہ تھا اور وہ غیر یقینی کیفیت کا شکار تھا۔ اسے سکون کی ضرورت تھی، اور یہ سکون لال کنور کے سوا کہیں اور ہرگز نہ مل سکتا تھا۔ وہ ذوالفقار خان کو رخصت کر کے سیدھا لال کنور کے پاس پہنچ گیا۔ لال کنور اس وقت بڑے ترنگ میں تھی، باہر کیا ہو رہا تھا اور بدبختی کی کتنی گہری اور ہولناک گھٹائیں ان کے سروں پر چھائی ہوئی تھیں اسے کسی بات کی نہ تو پروا تھی نہ فکر۔ جہاندار شاہ جب اندر داخل ہوا تو وہ نہایت عمدہ اور دلنشیں دھن میں گا رہی تھی۔

"دوستو! تم مجھے یہ مشورہ مت دو کہ میں راگ رنگ اور رقص و سرود سے توبہ کر لوں یہ تو روح کی غذا ہیں، جسم جو روح کے بغیر کچھ بھی نہیں، جب تم مستعدی سے اس کے لئے غذا فراہم کرتے ہو تو روح اپنی غذا سے کیوں محروم رہے۔

تم کہتے ہو رقص و موسیقی انسان کو غافل کر دیتے ہیں اور ان کے نشے میں انسان مدہوش ہو جاتا ہے مجھے تمہارے اس خیال سے انکار نہیں لیکن یہ بھی تو سوچو کہ جو سرور مدہوشی میں ہے ہوشیاری میں کہاں؟

قسمت نے ہمیں ایک ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے جس کے ایک طرف موت کی اتھاہ گہرائی اور گمنامی کے غار ہیں اور دوسری طرف زندگی کی جگمگاتی ہوئی مسرتیں اور خوشیاں ہیں، شہرت اور ناموری ہے اور اس دوسری راہ کے ہم اسی لئے تو امیدوار ہیں کہ ہم اپنی دو روزہ ہستی ناپائیدار کی لذتیں نچوڑ لیں۔

ہم مرنے سے پہلے مرنے کے قائل نہیں ہیں جب مرنا ہے مر جائیں گے۔ لیکن مرنے کے خوف سے مرتے رہنے سے حاصل؟

ساقیا! ایسی شراب پلا جو ہمیں فکر امروز اور غم فردا سے غافل کر دے۔ کیا امروز ہے اور کیا فردا؟ یہ سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں کوئی عقلمند ان بکھیڑوں میں کیوں پڑے؟

جہاندار شاہ چپ چاپ ایک گوشے میں کھڑا سنتا رہا۔ اس کے مایوس اور ہراساں دل پر لال کنور کی دلنشیں اور قیامت خیز آواز اور اشعار کے مفہوم نے یہ اثر کیا کہ رہی سہی ہمت بھی رخصت ہوگئی۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھا اور خیمے میں موجود خواصوں کی موجودگی کا خیال کئے بغیر لال کنور کو اپنی آغوش میں لے لیا اور بے تحاشا بوسوں کی بارش کر دی۔ خواصیں خود ہی ادھر ادھر چلی گئیں۔

باہر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے اور اورنگ زیب کا پوتا لال کنور کو آغوش میں لئے فکر فردا اور غم فردا سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

یکایک ڈھول تاشوں کی آواز سے پوری فضا گونج گئی یہ نوبت تھی جو کسی شہزادے کی رسم تاجپوشی کے بعد بجائی جارہی تھی۔ جہاندار شاہ اپنا کام ذوالفقار خان کے حوالے کر کے بے نیاز ہوگیا تھا۔ وہ بدستور لال کنور کے ساتھ داد عیش دیتا رہا۔ ذوالفقار خان نوبت کی آواز سن کر باہر نکلا اور عظیم الشان کے خیموں کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ اس نے فی الفور چند سپاہیوں کو دریافت حال کے لئے آگے روانہ کر دیا اور ذرا سی دیر بعد ہی تصدیق ہوگئی کہ عظیم الشان کی رسم تاجپوشی ادا کی جاچکی ہے اور امرا اس کی خدمت میں نذرانے پیش کر رہے ہیں۔

اب پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ شہزادہ رفیع القدر اور خجستہ اختر سے ملنے چلا گیا۔ دونوں شہزادے بڑے تپاک سے ملے اور اس لائق اور بہادر آدمی سے کچھ امیدیں وابستہ کر لیں۔ ان دونوں کو بھی عظیم الشان کی رسم تاجپوشی کی ادائیگی سے سخت اختلاف تھا۔ چنانچہ جب ذوالفقار خان نے جہاندار شاہ کے حق میں ان دونوں کا اتحاد اور تعاون چاہا تو وہ دونوں اس شرط پر آمادہ ہوگئے کہ جہاندار شاہ بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے بادشاہ بنایا جائے گا اور سکے اور خطبے میں اسی کا نام استعمال ہوگا۔

رفیع القدر کو کابل، کشمیر ملتان ٹھٹھے اور بھکر کے صوبے ملیں گے۔

دریائے نربدا سے لے کر راس کماری تک خجستہ اختر کی حکومت رہے گی۔

عظیم الشان کی شکست کے بعد جو مال و دولت ہاتھ آئے گا وہ تینوں بھائی آپس میں برابر تقسیم کر لیں گے اور ذوالفقار خان ان تینوں حکمرانوں کا وزیر ہوگا۔

کیونکہ تینوں شہزادے اس لائق شخص کی خدمات سے محرومی کو اپنی بدقسمتی تصور کرتے تھے۔

ذوالفقار خان ان دونوں کو لے کر جہاندار شاہ کے پاس پہنچا اور اسے لال کنور کی آغوش سے مجلس مشورت و معاہدہ گاہ میں آنے پر مجبور کر دیا گیا۔ جب تینوں شہزادے ایک جگہ جمع ہوئے تو

ذوالفقار خان کے طے شدہ معاہدے کو قرآن پاک پر لکھا گیا۔ تینوں نے معاہدے کی پابندی کیلئے قرآن پاک کی قسمیں کھائیں کہ تا زیست اس پر قائم رہیں گے۔

بعد میں اس معاہدے کی ایک شرط پر خود ذوالفقار خان کو بڑی ہنسی آئی۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا "تین بادشاہوں کا ہونا تو کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے لیکن وزیر ایک اور بادشاہ تین۔ یہ ایک نادر بات ہے۔"

دونوں بھائیوں کی شرکت اور ذوالفقار خان کی خوش تدبیری نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ یہ خبر آناً فاناً چاروں طرف پھیل گئی اور سپاہیوں کا جم غفیر ذوالفقار خان کی خدمت میں جمع ہونے لگا۔ مال و دولت کی کمی دونوں شہزادوں نے پوری کر دی تھی۔ عظیم الشان رسم تاجپوشی ادا کر کے حالات کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔ اور ذوالفقار خان سے خوفزدہ پس و پیش میں مبتلا تھا۔ اس کے امراء حملے کی ترغیب دے رہے تھے لیکن وہ خود ایسا کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے بے جا تساہل اور تدبذب کے بعد جب دونوں طرف کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو عظیم الشان کے پاس تیس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے تھے اور دوسری طرف ذوالفقار خان کے زیر کمان پچاس ہزار سوار اور ساٹھ ہزار پیادہ فوج تھی، حالات نے پلٹا کھایا تھا اور جب ان دونوں فوجوں میں تصادم ہوا تو قسمت جہاندار شاہ پر مہربان ہو گئی۔

عظیم الشان ہاتھی پر سوار اپنی فوج کے دل بڑھا رہا تھا۔ لیکن اسی وقت طوفان گرد و باد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ عظیم الشان کے لشکر کی طرف تھا۔ راوی کے ساحل کی ریت فوجیوں کی آنکھوں میں گھس گئی اور وہ سب گرد و غبار کے طوفان میں روپوش ہو گئے۔ توپوں کی گھن گرج نے سماعت کو ناکارہ کر دیا تھا۔ عظیم الشان کے ساتھی جنگ کے نتیجے سے مایوس اور خوفزدہ ہو گئے لیکن خود عظیم الشان کی رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا تھا۔ اس کے ایک مخلص امیر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ہاتھی کو چھوڑ دے اور گھوڑے کی پشت پر آجائے لیکن اس ہنگامہ دار و گیر میں اس کا موقع ہی نہ تھا۔ اسی عالم میں ایک گولے کی آگ سے اس کے تکیے میں آگ لگ گئی۔ عظیم الشان نے تکیے کو نیچے پھینک دیا۔ اس کے ایک مخلص امیر نے سسکیاں بھرنی شروع کر دیں۔ وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ عظیم الشان کے خیموں کا مال و متاع ذوالفقار خان کے سپاہی لوٹنے میں مصروف تھے۔

عظیم الشان کے ایک دوست نے مشورہ دیا "حضور! اب جنگ فضول ہے آپ بنگال بھاگ چلیں۔ وہاں اپنی قوت جمع کر کے دوبارہ پھر مقابلہ کیا جائے گا۔"

عظیم الشان نے حقارت کے ساتھ اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ "دارا شکوہ اور شجاع کا حشر ہمارے سامنے ہے شکست اور پسپائی کے بعد ہمیشہ کے لئے گمنامی میں چلا جانا یقینی ہے۔" اس کے بعد عظیم الشان نے دریافت کیا۔ "تمہارے پاس کتنے سپاہی ہیں؟"

دوست نے جواب دیا۔ "کل بیس سوار، بقیہ دشمنوں کی صفوں میں چلے گئے یا ہلاک ہو گئے۔"

"بہت خوب!" عظیم الشان شانِ بے نیازی سے بولا۔ "اس میں سے دس مجھے دے دو اور دس اپنے ساتھ رکھو۔ ہم دونوں کیوں نہ آخری داؤ لگا دیں۔ میں ان دس کی مدد سے جہاندار شاہ کو قتل کر دینے کی کوشش کرتا ہوں اور تم اپنے دس سپاہیوں کی مدد سے رفیع القدر اور خجستہ اختر کو ہلاک کر دینے کی کوشش کرو۔"

ابھی عظیم الشان کا آخری فقرہ ادا ہی ہوا تھا کہ ایک گولا ہاتھی کے خرطوم پر پڑا لگا۔ ہاتھی چنگھاڑتا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ فیلبان نیچے گر گیا۔ اور اس کا مورچھل بردار رسیوں کے سہارے فوراً نیچے اتر گیا اور راہِ فرار اختیار کی، ہاتھی کو روکنے کی بھرپور کوششیں ہوئیں لیکن وہ دریائے راوی میں اتر گیا۔ جو دوست اور دشمن عظیم الشان کا پیچھا کر رہے تھے جب وہ دریا کے کنارے پہنچے۔ تو ہاتھی عظیم الشان سمیت اس کی تہہ میں بیٹھ چکا تھا اور اوپر سطح آب پر غیر معمولی ہلکورے دکھائی دے رہے تھے۔

جب جہاندار شاہ اور ذوالفقار خان میدانِ جنگ میں اپنی قسمتوں کے فیصلوں میں الجھے ہوئے تھے تو خوشحال خاں موقع غنیمت دیکھ کر بہن کی ایما پر زینت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سازندوں کی یہ فوج دس آدمیوں پر مشتمل تھی۔ زینت کا باپ خیمے میں موجود تھا۔ خوشحال خاں اس سے ملا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ اس نے ہر طرح یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس سے شادی کر کے زینت بہت عیش کرے گی۔ اس نے یہاں تک لالچ دیا کہ اگر جہاندار شاہ فاتح رہا تو وہ اس سے کسی صوبے کی صوبے داری حاصل کرے گا ان دنیاوی جاہ و ثروت کی حصولیابی کے بعد لوگ اس کی خاندانی کم تری کو بھول جائیں گے لیکن زینت کا باپ پھر بھی نہ پسیجا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "یہ پیوند بالکل انمیل اور بے جوڑ رہے گا۔"

خوشحال خاں نے دھمکی دی۔ "او بوڑھے تاجر! تو مجھے کوئی معمولی آدمی نہ سمجھ، میری بہن عنقریب ہندوستان کی ملکہ ہونے والی ہے۔ یاد رکھ اس وقت تجھے جیسی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا ابھی تو تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس وقت تیرے سارے حمایتی بھی نوک دم فرار ہو جائیں گے!"

زینت کے باپ نے تنگ آکر جواب دیا۔ "زینت اپنے ماموں کے لڑکے سے منسوب ہے۔"

"جھوٹ۔" خوشحال خاں نے ترش روئی سے کہا "اچھا تم مجھے ایک بار زینت سے بلا دو، میں خود اس سے بات کر لوں گا۔ اگر وہ انکار کر دے گی تو پھر کبھی تمہیں تنگ نہ کروں گا۔"

زینت کے باپ کا چہرہ سرخ ہو گیا "اے نوجوان تو اپنی حد میں رہ تو حد سے تجاوز کرتا جا رہا ہے۔"

خوشحال خاں نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا وہ ایک دم زینت کے باپ پر ٹوٹ پڑے۔ اسے شور و غل کا بھی موقع نہ دیا۔ گرا کر بے بس کر دیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کے ساتھی باہر ہی رہے اور خوشحال خاں فاتحانہ شان سے زنانخانے میں چلا گیا۔ اندر زینت اور اس کی ماں اپنی شکلیں چھپانے لگیں۔

خوشحال خاں نے دھمکایا "اب چھپنے چھپانے سے کچھ حاصل نہیں۔ باہر جہاندار شاہ کے سپاہی، تم سب کی گرفتاری کے لئے کھڑے ہیں۔ لیکن گرفتاری سے پہلے مجھے موقع دو کہ میں زینت سے چند باتیں کر لوں، اس کے بعد زینت کے فیصلے کے مطابق کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔"

سپاہیوں کا ذکر سن کر دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ زینت نے چیخ کر سوال کیا۔ "ہمارے باوا جان کہاں ہیں؟"

خوشحال خاں اُن کے پاس پہنچ چکا تھا۔ "سپاہیوں کی حراست میں!"

زینت کی سمجھ میں اچانک معلوم نہیں کیا بات آئی کہ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے اپنی ماں سے کہا "اماں آپ سامنے سے ہٹ جائیے آپ کی بے پردگی ہو گی۔ میں خود اس سرکش سے فیصلہ کن باتیں کئے لیتی ہوں۔"

ماں نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ بیٹی نے مزید تشفی کر دی "آپ بے فکر رہیں، میں اپنی ناموس کی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔" اس کے بعد وہ خوشحال خاں سے مخاطب ہوئی۔ پوچھا "تو بات چیت میں کتنا وقت لے گا؟"

خوشحال خاں پر فتحمندی کا نشہ چڑھ رہا تھا ناک بھوں چڑھا کر بولا "یہ تمہارا اندازِ گفتگو کیا ہے؟"

زینت نے رعونت سے جواب دیا "ہم ہر ایک سے اس کے شایانِ شان بات کرنے کے آداب سے واقف ہیں۔"

"تم اپنے مہمانوں سے اسی طرح بات کرتی ہو؟" خوشحال خاں نے سوال کیا۔

"تم مہمان کب ہو؟" اس نے تمکی بہ تمکی جواب دیا۔ "چہ خوب، تم اپنے تئیں مہمان تصور کرتے

ہو، چور اُچکے، لفنگے۔"

خوشحال گرج کر بولا۔ "دیکھو ان فضول اور ہتک آمیز باتوں میں وقت نہ ضائع کرو، میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میرا آئندہ اقدام تمہاری گفتگو کی روشنی میں ہوگا۔"

زینت ایک طرف جاتی ہوئی بولی "ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں پھر تجھ سے اطمینان سے گفتگو کروں گی۔"

"اور تجھ سے"۔ پر ایک بار پھر اس کے جسم میں آگ لگ گئی اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو، جان رہے یا جائے اس ضدی، سرکش خاندان کو نیچا دکھا کے رہوں گی۔ ذرا سی دیر بعد ہی زینت واپس آگئی چمکتا ہوا خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ خوشحال خاں یہ سمجھا کہ لڑکی اس پر حملہ کرنے آئی ہے۔ گھبرا کر پوچھا۔ "اس خنجر کی کیا ضرورت تھی۔ خدانخواستہ میں کسی بُری نیت سے تو یہاں آیا نہیں ہوں!"

زینت نے کہا۔ "بات کرو، بکواس بند کرو، یہ خنجر تو اس لئے لائی ہوں کہ اگر تو کسی قسم کی زیادتی یا دراز دستی سے کام لے تو اس سے تجھے ہلاک کر کے خود بھی جان دے دوں، یہ زہر میں بجھا ہوا ہے!"

خنجر کی نوک خوشحال خاں ہی کی طرف تھی، اس نے نوک کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے اپنی طرف کرو۔"

زینت نے طنز کیا۔ "کیوں؟ اس سے ڈر لگتا ہے۔ کیا تمام مرد تیری ہی طرح ہوتے ہیں۔ کیا تیرے خاندان میں لڑکیوں کی کمی ہے۔ جا اپنے ہی خاندان میں کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ، ہم اپنے خاندان کے لئے سر کٹانا جانتے ہیں۔"

خوشحال خاں کچھ بدحواس ہو رہا تھا۔ زینت نے خنجر کی دھار کو انگلی پھیر کر جانچا۔

خوشحال خاں کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "زینت! میں تم سے محبت کرتا ہوں، میں اس وقت اپنے دور کا سب سے بڑا طنبورہ نواز ہوں اس کے علاوہ بعض دوسرے ساز بھی بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میں اس دور کا بے مثل کلاونت ہوں!" پھر کچھ دم لے کر بولا۔ "اور تم اس کو بھی چھوڑو لال کنور میری حقیقی بہن ہے جو عنقریب ملکۂ ہند بننے والی ہے۔ کیا تمہیں اب بھی میرے معزز ہونے میں شبہ ہے؟"

زینت کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ اُبھری اور فوراً ہی غائب ہوگئی۔ "تو نہ صرف خاندانی طور پر کم تر ہے بلکہ چور، اُچکا اور اٹھائی گیر ہے۔ تو گدھا ہے اور گدھا بادشاہ کی سواری میں رہے یا کسی اور کی، رہے گا گدھا ہی، راتوں کا تصور سیاہی کے سوا ہرگز نہیں ہوگا۔ زنگی کو کتنا ہی نہلاؤ دھلاؤ وہ رہے گا زنگی کا زنگی ہی۔ تو اپنے خاندان کے لئے باعث ننگ ہے تیرے اندر غیرت کی کمی ہے۔"

تہدید کی جائے گی کہ وہ خوشحال خاں کی گوشمالی کردے۔

جہاندار شاہ کی فتح مندی نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ چنانچہ جب مال غنیمت اکٹھا ہوا اور اس کی تقسیم کا وقت آیا تو کیسا قرآن، کہاں کا معاہدہ اور شرائط، ساری ہی باتیں بھلا دیں، اب وہ معاہدے والے صوبوں کی حکومت بھی اپنے دونوں بھائیوں کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ نجستہ اختر نے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی اور کئی دن کی لڑائی کے بعد ذوالفقار خان کی حکمت عملی سے نجستہ اختر کو شکست ہو گئی۔ اور وہ قتل کر دیا گیا۔ بعد میں دوسرا بھائی رفیع القدر بھی مقابلے پر آ گیا اور یہ بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جب چاروں طرف سے فتح کے شادیانے بجے اور لوگ جہاندار شاہ کو خدمت میں مبارکبادیں دینے آئے تو لوگوں کا وجود اس کے لئے مصیبت بن گیا۔ وہ جلد از جلد لال کنور کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا اور اس فتح کی اصل خوشی اس کی آغوش میں منانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے جاں نثاروں کی پرواہ کئے بغیر اندر چلا گیا۔ وہاں فتح کی خوشی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ سارے تکلفات اور شاہی آداب بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے۔ ہاؤ ہو اور رقص و موسیقی کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ لال کنور کے کنبے کے سارے افراد اچھل کود اور ہا تھا پائی میں مشغول تھے یہاں تک کہ جب جہاندار شاہ اندر پہنچا تو کسی نے اس پر توجہ ہی نہ دی۔ لال کنور بھی نشے میں دھت تھرک رہی تھی۔

جہاندار شاہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا لال کنور کی طرف بڑھا وہاں تک پہنچتے پہنچتے کئی متوالوں نے اسے سخت دھکے دیئے جس سے وہ لڑکھڑا لڑکھڑا گیا لیکن اس نے انہیں منع نہیں کیا۔ یہ سارے ہی اس کی لال کنور کے عزیز رشتے دار تھے اور لال کنور اسے دنیا کی ہر شئے سے زیادہ عزیز تھی۔

لال کنور نے جیسے ہی اسے دیکھا بے ساختہ اس سے لپٹ گئی اور اس پر بوسوں کی بارش کر دی۔ نشے میں دھت دوسروں نے بھی دیکھا دیکھی لال کنور کی تقلید کی اور پھر اس حمام میں سبھی ننگے ہو گئے۔

جہاندار شاہ لال کنور کو لے کر دوسرے خیمے میں چلا گیا۔ آج وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت عورت سمجھ رہی تھی وہاں پہنچتے وہ تلملا کر مچھلی کی طرح تڑپ کر جہاندار شاہ کی آغوش سے نکل گئی۔ "آج میں تمہیں ترساؤں گی اور تمہیں اس وقت تک اپنے پاس نہ آنے دوں گی جب تک تم مجھ سے چند وعدے نہ کر لو گے!"

جہاندار شاہ نے ہنستے ہوئے دوڑ کر اسے پکڑنا چاہا لیکن وہ قابو میں نہ آئی اور دھوکا دے کر دوسری طرف چلی گئی۔ جہاندار شاہ یہ کہتا ہوا اس کی طرف دوڑا "ہم تمہاری ہر خواہش پوری کریں گے تم فکر مت کرو۔"

خوشحال خاں کا مارے غصّے کے بُرا حال ہو رہا تھا لیکن زہر میں بجھے خنجر کا ڈر بھی غالب تھا۔ یہ لڑکی کچھ خونخوار ہی لگتی تھی جو ذرا سی چیں چپڑ پر اپنا خنجر پیٹ میں اتار دے گی، خوشحال خاں نے سوچا کہ ایسا عشق جو جان لے کر ٹلے فضول ہے، کیا ساری دنیا میں صرف زینت ہی اتنی حسین ہے جس سے محبت کی جائے۔ دوسری بہت ساری لڑکیاں بھی تو ہیں اس نے سوچا کہ اگلا عشق کسی ایسی لڑکی سے کرنا چاہیئے جو ہتھیار کے استعمال کا شوق نہ رکھتی ہو۔

"اچھا" خوشحال خاں مایوسی سے بولا۔ "تو تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں؟"

"پھر وہی بکواس! زینت گرم ہو گئی۔ "اس موضوع پر تو کوئی بات ہی نہ کرو۔"

خوشحال خاں نے ایک بار پھر خنجر پر نظر ڈالی اور دل میں سوچا کہ اگر جھپٹا مار کر اسے چھین لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ لیکن دوسرے لمحے یہ سوچ کر باز رہا کہ خنجر زہر میں بجھا ہے۔ اگر چھین جھپٹ میں وہ اس کے ہاتھ میں کہیں چبھ گیا یا وہ زخمی ہو گیا تو اس کی موت یقینی ہو جائے گی۔

اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "جبر نہیں ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں تو مجبوری ہے میں تمہیں مجبور بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ آہستہ آہستہ خیمے کے دروازے کی طرف بڑھا جب وہ بالکل دروازے پر پہنچ گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اب اگر زینت دوڑ کر بھی اس پر حملہ کرنا چاہے تو ناکام رہے گی ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ "زینت جا تو رہا ہوں، لیکن یاد رکھنا، میں بھی خوشحال خاں ہوں۔ تمہاری گستاخیوں کا بدلہ نہ لوں تو نام بدل دینا۔"

زینت تیزی سے اس کی طرف لپکی، خوشحال خاں بھاگ کر باہر نکل گیا وہاں جنگ سے فارغ ہونے والے سپاہیوں کی واپسی شروع ہو چکی تھی، خوشحال خاں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ بوڑھے تاجر کو چھوڑ دیا جائے جس کی فوراً تعمیل کی گئی۔ وہ اپنے آدمیوں سمیت وہاں سے روانہ ہو گیا۔

زینت اس کے جاتے ہی پیٹ پکڑ پکڑ کے ہنستی رہی، اسے خوشحال خاں کی بزدلی پر بڑی ہنسی آ رہی تھی۔

جب لال کنور نے یہ ساری روداد سنی تو اسے اپنے بھائی پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے چند مغلظات سنا کر بھائی کو یہ طعنہ دیا کہ تم نے بزدلی دکھا کر اپنے خاندان کی عزت کو بٹا لگا دیا ہے۔"

جب ذوالفقار خان کو خوشحال خاں کی تازہ گستاخی کا علم ہوا تو وہ نظر انداز کر گیا کیونکہ یہ وقت ایسا نہ تھا جو ان فضول باتوں میں ضائع کیا جائے لیکن اس نے یہ ضرور سوچا کہ جہاندار شاہ کو سختی سے

"اُوں ہُوں!" لال کنور کو شوخی سے ستانے میں مزہ آرہا تھا "پہلے ایک ایک بات پر وعدہ کرو۔"

جہاندار شاہ نے کہا۔ "تمہیں ہماری بات کا یقین نہیں، یہ تو خوشی کا موقع ہے، ذرا باہر جھانک کر تو دیکھو ہمارے کتنے ہی جاں نثار ہمیں مبارکباد دینے آئے ہیں لیکن ہم انہیں چھوڑ کر تمہارے پاس آگئے ہیں اس لئے کہ تم ہمیں ان سے کہیں زیادہ عزیز ہو۔"

لال کنور اس کے قریب پہنچ گئی جہاندار شاہ نے اسے آغوش میں لے لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں شامل اپنے نرم ریشمی گدوں کی طرف بڑھے۔

لال کنور نے کہا۔ "جس طرح تمہارے خاندان میں شاہی بیگمات اور خواتین کو نور محل اور ممتاز محل وغیرہ کے خطابات ملتے رہے ہیں اسی طرح کوئی اچھا سا خطاب مجھے بھی ملنا چاہیئے۔"

جہاندار شاہ نے کہا۔ "ہم تمہیں امتیاز محل کا خطاب دیتے ہیں۔ اس خطاب کا باقاعدہ اعلان شاہجہان آباد پہنچ کر قلعے میں کر دیں گے!"

"اور یہ کہ اب میں قلعۂ معلیٰ کی سب سے زیادہ معزز خاتون ہوں گی اس لئے میری خواہش ہے کہ محلسرا کی جملہ بیگمات اور خواتین میری خدمت میں دست بستہ ہو کر آداب بجا لائیں۔"

"اس کی بھی تعمیل کرائی جائے گی تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیئے!"

"میرے بھائی خوشحال خاں کو اکبر آباد کی صوبیداری عطا کی جائے!"

"اس کی بھی تعمیل ہوگی۔"

"شاہجہاں آباد میں میری ایک منہ بولی بہن ہے، وہ میری سب سے زیادہ عزیز سہیلی ہے اسے ہاتھی کی سواری اور اپنے ساتھ جلو میں چلنے والے آدمیوں کو رکھنے کی اجازت دی جائے!"

جہاندار شاہ اس کی ہر بات مان رہا تھا، اسے بھی مان لیا۔

لال کنور مزید بولی "میری اس سہیلی کے لئے قلعۂ معلیٰ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہنے چاہئیں، وہ مجھ سے ملنے کسی بھی وقت اور کسی بھی دن آئے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔"

"منظور!" جہاندار شاہ نے جواب دیا۔

"اور بقیہ باتیں، جب یاد آئیں گی، تم سے ان کا وعدہ لیتی رہوں گی!" لال کنور نے کہا۔

"یہ بھی منظور!"

"اور ہاں دو باتیں اور۔" لال کنور کو جیسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو، ذوالفقار خان کو برطرف کر دیا

جائے اور زینت کو زبردستی بھائی خوشحال خاں کے حوالے کر دیا جائے۔"

اور ساری شرائط میں یہ شرطیں ایسی تھیں جنہیں جہاندار شاہ کسی طرح بھی پورا نہ کر سکتا تھا اس نے بے بسی سے لال کنور کو دیکھا۔ "یہ شرائط سردست پوری نہیں کی جا سکیں گی، جب ان کے پورا کرنے کا وقت آئے گا تو تمہارے یاد دلائے بغیر پوری کر دی جائیں گی۔"

لال کنور نے بھی اس لئے ضد نہ کی کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ جہاندار شاہ کی شہنشاہیت ذوالفقار خان ہی کی رہینِ منت ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو جہاندار شاہ بادشاہ بھی نہ ہوتا۔

اور وہ پوری رات دونوں نے خوب عیش کوشی میں گزار دی۔

واپسی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ خیمے اکھڑنے لگے۔ اب جلد از جلد شاہجہان آباد پہنچ کر قلعے کو اپنی تحویل میں لینا تھا۔ خوشحال خاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ صوبے داری کے تصور میں چوتھے آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے جیسے ہی صوبے داری کا پروانہ ملے گا وہ زینت کو ایک بار پھر متاثر کر کے پھر زبردستی قابو میں لانے کی کوشش کرے گا۔

جہاندار شاہ نے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شاہجہان آباد مراجعت کی، لال کنور ہودج میں اس کے آغوش میں تھی، اس سے پہلے کسی شہزادے یا حکمران کے ساتھ ایک ہی ہودج میں کوئی شاہی خاتون ہی سفر کر سکتی تھی۔ لیکن مغل تاریخ میں لال کنور وہ پہلی معمولی عورت تھی جس نے اس رسم کو توڑ دیا۔

ابھی تین گھڑی دن باقی تھا کہ جہاندار شاہ باؤلی کے راستے سے شاہجہان آباد میں داخل ہو گیا۔ شاہجہان آباد کا صوبے دار محمد یار خان اس کے استقبال کو بڑھا اور تین دن بعد جہاندار شاہ قلعے میں داخل ہو گیا۔ یہاں نہایت تزک و احتشام سے رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔ عہدے اور خطابات تقسیم ہوئے۔ ذوالفقار خان کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ لال کنور حسب وعدہ امتیاز محل بن گئی، اس تقریب میں شاہی بیگمات کے دوش بدوش لال کنور کے خاندان کی عورتیں بھی شریک تھیں، شاہجہان آباد کی گمنام کنجڑن جسے لال کنور نے بہن بنایا تھا اور جس کے منصب و اعزاز کی اس نے جہاندار شاہ سے سفارش کی تھی۔ اب زہرہ بیگم بن چکی تھی اور اس کی سواری، اس جشن میں شمولیت کے لئے اس طمطراق اور کروفر سے قلعے میں داخل ہوئی کہ وہ خود ہاتھی پر ہودج میں تھی اور اس کی پشت پر مورچھل برداری ہو رہی تھی۔ اور جلوس میں ہاتھی کے آس پاس ہٹو بچو کرنے والے ملازمین کا ایک جم غفیر ساتھ تھا۔

لال کنور نہایت شان اور تکبر کے ساتھ جہاندار شاہ کے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور شاہی بیگمات دست بستہ حاضر ہو کر کورنش و تسلیمات بجا رہی تھیں اور نذرانے پیش کر رہی تھیں۔ بعد میں لال کنور

کے رشتے داروں نے اپنی خاندانی رسوم و روایات کے مطابق جشن منایا اور پوری محفل کو رقص گاہ بنا کے رکھ دیا۔ جہاندار شاہ کو یہ سب گوارا تھا کیونکہ یہ اس کی محبوب ترین بیوی لال کنور کی خاندانی رسوم تھیں۔

خوشحال خان جلد از جلد صوبے داری کا پروانہ حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بہن کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ زینت کے سلسلے میں خوشحال خاں کو ایک دشواری اور پیش آئی۔ اس کے آدمیوں نے شاہجہان آباد میں زینت کے مکان کا پتہ چلا لیا تھا بدقسمتی سے یہاں بھی زینت کو ذوالفقار خان کا قرب حاصل تھا۔ اور اس کوچے میں قدم رکھنا بھی خوشحال خاں کے بس کی بات نہ تھی، سردست اسے پروانۂ صوبے داری کا انتظار تھا۔

جہاندار شاہ کے حکم پر میر بخشی نے صوبے داروں کی فہرست پیش کر دی وہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ لال کنور کا یہ اصرار بھی تھا کہ خوشحال خاں کو کسی دور دراز صوبے میں نہ بھیجا جائے۔ صوبہ اکبر آباد شاہجہان آباد سے بہت قریب تھا جہاندار شاہ نے وزیر اعظم کے نام فرمان لکھوایا کہ اکبر آباد کے صوبیدار کو معزول اور اس کی جگہ خوشحال خاں کو صوبے دار مقرر کیا جائے۔ صوبے داری کے علاوہ خوشحال خاں کو ہفت ہزاری منصب بھی عطا کیا گیا۔

خوشحال خاں خوش خوش اپنے سازندے مصاحبین کے ساتھ ذوالفقار خان کے پاس پہنچ گیا۔ اور شاہی فرمان اس کے حوالے کر دیا۔ ذوالفقار خان اس وقت معزز امراء کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ خوشحال خاں نے ذوالفقار خان کو اس طرح دیکھا اور مسکرایا جیسے مرتبے میں وزیر اعظم کا ہمسر ہو گیا ہو۔ اسے یقین تھا کہ اب شاہی فرمان کے پیش نظر وزیر اعظم اس کی عزت و تکریم پر مجبور ہو جائے گا۔ اس نے مصافحے کے لیے ذوالفقار خان کی طرف دونوں ہاتھ بڑھا دیئے لیکن ذوالفقار خان اپنے ہاتھ سمیٹے رہا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز سے خوشحال خاں کو دیکھا اور سلام کا جواب گردن کی ہلکی سی جنبش سے اس طرح دیا جس طرح امراء اپنی پرجا کے سلاموں کا جواب دیا کرتے ہیں۔

ذوالفقار خان نے خوشحال خاں کو ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کیا یہ وہ جگہ تھی جہاں کاروبار سلطنت کے معمولی متصدی اور منشی بیٹھے ہوتے تھے۔ خوشحال خاں کو یہ رویہ بہت برا لگا۔ ذوالفقار خان اس کی برابر بے عزتی کیے جا رہا تھا لیکن خوشحال خاں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ وہ حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق ذوالفقار خان کے حکم کی تعمیل کرے۔ وہ کہنہ سال فرسودہ حال متصدیوں اور منشیوں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ذوالفقار خان نے شاہی فرمان پڑھا اور پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، اس نے ایک اچٹتی نظر خوشحال خاں پر ڈالی اور پروانۂ صوبے داری کے بجائے ایک فرمان جاری کیا۔ وزیر اعظم کا فرمان خوشحال خاں امیدوار صوبے داری اکبر آباد کے نام۔ اس نے لکھا۔

"اکبر آباد کی صوبے داری کے امیدوار کو سندِ صوبے داری حاصل کرنے سے پہلے لازم ہے کہ حق التحریر میں پانچ ہزار ڈھول اور سات ہزار طنبورے داخلِ سرکار کرے۔"

نیچے اپنے دستخط کر دیئے اور خوشحال خاں کو اشارے سے قریب بلا کر یہ تحریر اس کے حوالے کر دی۔ خوشحال خاں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی وہ چپ چاپ دل ہی دل میں کڑھتا ہوا وہاں سے واپس ہوا اور سیدھا لال کنور سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ لیکن لال کنور اب امتیاز محل تھی اور اس سے ملاقات اتنی آسان بات نہ تھی۔

خوشحال خاں کے سارے خواب بکھر رہے تھے، وہ زینت کو بھول جانا چاہتا تھا لیکن یہ مسئلہ اب محبت کے بجائے سفلہ انا کا بن گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب جہاندار شاہ ہندوستان کا بادشاہ ہو جائے گا تو اس کی ساری مشکلات دُور ہو جائیں گی۔ لیکن اب جبکہ اس کی بہن کا عاشق دہلی کے لال قلعے میں اپنی بادشاہت کے شادیانے بجوا رہا تھا تو اس کا وزیر اعظم ذوالفقار خان کمال حوصلہ و جرأتمندی سے اس کے فرمان کو حقارت سے ٹھکرا رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے لال کنور سے ملاقات ہوئی اور اس نے رد رد کر اپنی نامرادی کی داستان دہرا دی۔ لال کنور کو خوشحال خاں سے زیادہ غصّہ آیا اس کا بس چلتا تو وہ ذوالفقار خان کو قتل کر کے اس کی لاش کو ہاتھی کی دُم سے بندھوا کر سارے شہر میں گشت کراتی لیکن ذوالفقار خان پر اس کا کوئی بس نہ تھا۔ اس کے دل میں ایک کانٹا اور کھٹک رہا تھا۔ جب سے وہ لال قلعے میں امتیاز محل کی حیثیت سے رہ رہی تھی، اس کی خدمت میں ابھی تک جہاندار شاہ کی پھوپھی اور اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء حاضر نہیں ہوئی تھی۔ وہ لال کنور کو اس لائق نہیں سمجھتی تھی کہ اورنگ زیب کی بیٹی اس کے روبرو دست بستہ حاضر ہو۔

جہاندار شاہ کو کچھ اور فکریں بھی لاحق ہو گئی تھیں، عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر بنگال سے عظیم آباد پہنچ چکا تھا اور مخبروں نے خبر دی تھی کہ وہ اپنے باپ کا بدلہ اور تخت شاہجہان آباد کے حصول کی خاطر وہاں کے امراء اور صوبے داروں کو راضی کر رہا ہے۔ عظیم الشان کا دوسرا بیٹا کریم الدین ابھی تک قابو میں نہ آیا تھا۔ اور جب تک یہ زندہ تھے اس کا تاج و تخت غیر محفوظ تھا۔ ذوالفقار خان کی بے مثل شجاعت اور

تدبر نے اسے بڑی حد تک بے فکر کر دیا تھا لیکن دونوں شہزادوں کی پر خطر شخصیت بہر حال ڈرا رہی تھی۔ وہ دیوان عام سے اٹھ کر رنگ محل کی طرف چلا گیا۔ رنگ محل اب امتیاز محل ہو چکا تھا۔ جہاندار شاہ کی رنگ رلیوں کا یہی مسکن تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو مسلح تاتاری عورتیں اور خواصیں مودب ہو گئیں، اس کی نظریں لال کنور کو تلاش کر رہی تھیں، لال کنور حوض کے کنارے عود پر ایک المیہ دھن میں گا رہی تھی۔

"ہمیں خدا نے جس عزت سے نوازا ہے اس کے بعض سرکش بندے اس اعزاز کو ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں، اے وزیر نا عاقبت اندیش! تو اگر واقعی ہمیں ناپسند کرتا ہے اور ہمارے اعزاز و احتشام سے خوش نہیں ہے تو اس معاملے میں بادشاہِ وقت سے مت جھگڑ، اس کے فرمان کو مت ٹھکرا بلکہ اس سے الجھ، جہاں سے عزت و ذلت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں، دیکھنا، وہ وقت آ کے رہے گا جب صاحبِ عزت ذلیل اور تیری نظر میں ذلیل صاحبِ عزت ہوں گے، میں تیری سیاست نہیں جانتی۔ لیکن میری سیاست سے تو بھی لاعلم ہے۔ میں وہ ہوں جس نے یوسف کو رسوا، عیسیٰ کو مصلوب، آدم کو بے گھر اور بڑے بڑے فاتحین کو مغلوب کیا ہے۔ بس ذرا جذبۂ انتقام کے پرورش کرنے کی دیر ہے میں ہر کام کر سکتی ہوں ظالمو! چند روزہ زندگی کو اس کی حلاوتوں سے محروم کیوں رکھتے ہو میں نے بادشاہِ وقت کو زندگی کی بہترین لذتوں سے آشنا کیا ہے اور زندگی رہی تو اس کے بدترین ذائقے تجھے چکھاؤں گی۔"

جہاندار شاہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لال کنور نے گانا بند کر دیا اور منہ موڑ کر ایک طرف چل دی۔ جہاندار شاہ اس کے پیچھے چلا اور لال کنور کا آنچل پکڑنا چاہا۔ لیکن اس نے ایک جھٹکے میں آنچل چھڑا لیا۔ جہاندار شاہ دوڑ کر اس کے سامنے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ "بات کیا ہے؟ تم ہم سے ناراض کیوں ہو؟"

لال کنور نے ہتک آمیز لہجے میں کہا۔ "اب تک میں تمہیں بادشاہ سمجھتی تھی لیکن آج معلوم ہوا کہ بادشاہ تم نہیں ذوالفقار خان ہے۔"

"بادشاہ ہم ہیں، ذوالفقار خان ہمارا وزیر اعظم ہے!" جہاندار شاہ نے تن کر جواب دیا۔

"پھر تمہارے فرمانوں کی تعمیل کیوں نہیں کی جاتی؟"

"کیا ہوا؟"

لال کنور نے ذوالفقار خان کی تحریر جہاندار شاہ کے حوالے کر دی۔ "اسے پڑھو عبرت پکڑو اور ہوش کی آنکھیں کھولو۔"

جہاندار شاہ نے اس تحریر کو پڑھا اور اسے ایسا لگا جیسے ذوالفقار خان نے اس کے رخسار پر طمانچہ جڑ دیا ہے، غصّے میں بولا۔ "تمہیں افسردہ نہیں ہونا چاہیئے ہم ذوالفقار خان سے اس کی گستاخی کا جواب طلب کریں گے۔"

"جواب ہی طلب کرو گے یا سزا بھی دو گے؟" لال کنور نے طنز کیا۔

جہاندار شاہ کو اپنی بے بسی اور ذوالفقار خان کی طاقت کا جلد ہی احساس ہو گیا۔ "سر دست ہم اس سے جواب ہی طلب کر سکتے ہیں اور اس سے اکبر آباد کی صوبے داری کی سند خوشحال خاں کو دلا دیں گے، رہا سزا کا مسئلہ تو اس کا ابھی وقت نہیں آیا۔"

لال کنور نے انداز دلنوازی اور شانِ دلربائی سے کہا۔ "مجھے پہلے یہ نہیں معلوم تھا کہ بادشاہ اپنے وزیر سے اس درجہ خوفزدہ اور مغلوب ہے۔"

لال کنور نے دوسری شکایت کی۔ "زیب النساء ابھی تک میری خدمت میں نہیں حاضر ہوئی ہے۔"

جہاندار شاہ کے لئے یہ سب ایک مسئلہ بن گئے تھے اورنگ زیب کی بیٹی کے خلاف بھی وہ کوئی قدم نہ اٹھا سکتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ زیب النساء موت کو گوارا کرے گی لیکن لال کنور کے روبرو دست بستہ ہرگز نہ حاضر ہوگی۔

"زیب النساء اگر تمہاری خدمت میں اب تک نہیں آئی ہے تو تمہیں بھی اس پر کوئی توجہ نہیں دینی چاہیئے۔ آج سے ہم خود بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ جیتے جی اس کی شکل نہ دیکھیں گے۔"

ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ جہاندار شاہ کو ایک بہت بڑی خوشخبری سنائی گئی۔ اس کا بھتیجا سلطان کریم الدین گرفتار ہو چکا ہے اور باہر اپنے چچا کے ہاتھوں گردن زدنی کا منتظر ہے اس نے فوراً لال کنور سے معذرت کی اور دیوان عام چل دیا۔ کیونکہ جہاندار شاہ کی نظر میں سلطان کریم الدین کو جلد از جلد ٹھکانے لگا دینا وقت اور امور سلطنت کا سب سے ضروری کام تھا۔

سلطان کریم الدین، عظیم الشان کا بیٹا اور جہاندار شاہ کا بھتیجا زنجیروں میں جکڑا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جہاندار شاہ نے اس سے چند باتیں کیں اور یہ محسوس کیا کہ بھتیجا اپنے چچا کے اقتدار سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہے۔

جہاندار شاہ نے پوچھا "تمہارا کیا خیال ہے ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

کریم الدین نے فوراً جواب دیا "آپ مجھے قتل کرا دیں گے!"

"تم نے یہ کس طرح اندازہ لگایا؟"

"میں آپ کا بھتیجا ہوں اگر آپ کے دل میں میرے لئے ذرا سی محبت ہوتی تو آپ مجھے دیکھتے ہی پہلے زنجیروں سے آزاد کرا دیتے اس کے بعد کچھ باتیں ہوتیں۔"

جہاندار شاہ نے اندازہ لگایا کہ اس کا بھتیجا غیر معمولی ذہین ہے اور اس کی ذہانت آگے چل کر اس کے تاج و تخت کے لئے مستقلاً خطرہ ثابت ہو گی، جہاندار شاہ نے غیر جذباتی لہجے میں جواب دیا "تم کافی سمجھ دار ہو، ہم تمہیں معاف نہیں کر سکتے، تم باغی ہو تم نے اپنے باپ کے ساتھ مغلیہ سلطنت کے اصل حقدار کے خلاف بغاوت کی تھی اور بغاوت کی سزا موت ہے، صرف موت۔"

لیکن بہادر کریم الدین پر اس ظالمانہ حکم کا کوئی اثر نہ ہوا "جلد یا بدیر، ہم دونوں ہی مریں گے۔" وہ کہنے لگا۔ "میں پہلے مر رہا ہوں آپ کچھ دنوں بعد مریں گے لیکن یہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا بھائی فرخ سیر آپ کو معاف نہ کرے گا اور عنقریب حکومت مغلیہ ادھر منتقل ہو جائے گی۔"

جہاندار شاہ کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ بھتیجا خاصا گستاخ تھا۔ جلاد کو گردن کے اشارے سے حکم ملا کہ تعمیل ہو اور تلوار کے ایک بھرپور ہاتھ نے سلطان کریم الدین کے سر کو دھڑ سے جدا کر دیا۔ جب کٹی ہوئی گردن سے خون کے فوارے چھوٹے تو اس سرسراہٹ سے جیسے "فرخ سیر فرخ سیر" کی آواز آ رہی تھی اور عظیم آباد میں فرخ سیر واقعی اپنی قوت مجتمع کر رہا تھا۔

جہاندار شاہ ابھی چند ہی قدم چلا ہو گا کہ اسے ذوالفقار خان کا ایک پرچہ ملا۔ چند سطری مبہم اور مہمل سی تحریر۔

"سلطنت کے ہر امیر اور پرجا کی عزت و ناموس بے حد عزیز ہے اور حضور کا وفادار خادم ذوالفقار خان چین قلیچ خان سے متحد و متفق ہے۔"

ابھی وہ اس تحریر کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لال کنور کی منہ بولی بہن زہرہ بیگم کا ہاتھی سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس سواری کے ساتھ چلنے والے پیادے زخمی تھے اور ان کے جسم لہولہان تھے۔ سواری امتیاز محل کے صدر دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس میں سے زہرہ بیگم نمودار ہوئی۔ اس کا لباس تار تار تھا۔ اور ہاتھ پیروں اور چہرے پر چوٹ کے نشانات تھے۔ اس نے رو رو کر اپنی سہیلی لال کنور کو بتلایا کہ ابھی جب وہ اس سے ملنے آ رہی تھی۔ تو راستے میں چین قلیچ خان کی

سواری بھی گذر رہی تھی۔ اس کے سپاہیوں نے بلاوجہ زہرہ بیگم کے آدمیوں کو مارا پیٹا اور خود زہرہ بیگم کو ہاتھی سے کھینچ کر نیچے گرالیا اور اس کی مرمت کر دی۔

لال کنور جانتی تھی کہ چین قلیچ خان کوئی معمولی سردار نہیں ہے۔ اس کا یہ خطاب اورنگ زیب کا عطا کردہ ہے اور اورنگ زیب کا وزیر علامی سعد اللہ خان چین قلیچ خان کا نانا ہے لیکن اس کے باوجود جب جہاندار شاہ اندر پہنچا اور زہرہ بیگم کی پٹائی سنی، اس کا ذوالفقار خان کی تحریر سے موازنہ کیا تو پتا چلا کہ ضرور کوئی بات ہے ورنہ چین قلیچ خان جیسا سنجیدہ اور گوشہ نشین سردار ایسی لغو حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

اس نے معاملے کی اصل نوعیت کو سمجھنے کے لئے ذوالفقار خان کو طلب کیا۔ یہ دن اس کے لئے بڑا ہی منحوس تھا۔ دم بدم ایسی باتیں پیش آ رہی تھیں کہ وہ لال کنور کی قربت سے محروم ہو رہا تھا۔

جب ذوالفقار خان آ گیا تو جہاندار شاہ، خوشحال خاں اور چین قلیچ خان سے متعلقہ تحریریں لے کر اس سے ملا اس کا پہلا سوال خوشحال خاں سے متعلق تھا۔ جہاندار شاہ نے وہ تحریر ذوالفقار خان کی طرف بڑھا دی اور کہا۔ "ہمارا خیال ہے کہ تم نے یہ سب از راہِ مذاق لکھ دیا ہوگا۔ اس کا سنجیدگی سے کوئی تعلق نہ ہوگا!"

ذوالفقار خان نے مردانہ لہجے میں صاف صاف کہہ دیا۔ "نہیں قبلۂ عالم کو غلام سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ یہ اپنے آقا کے فرمان کے ساتھ مذاق کرے گا۔ جو کچھ لکھا ہے سنجیدگی اور ہوشمندی سے لکھا ہے۔"

جہاندار شاہ کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ "تب پھر تمہاری تحریر کا مطلب؟"

ذوالفقار خان نے جواب دیا۔ "صوبے داری یا سرداری کے منصب آج تک آسانی سے نہیں ملے ہیں، ان خاندانوں نے صدیوں کی محنت اور سرفروشیوں کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اب اگر جہاں پناہ ان کی جگہ ناچنے گانے والوں اور نااہل لوگوں کو بٹھا دیں گے تو ان سرداروں کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ معزول سردار ناچنے گانے کا پیشہ اختیار کریں اور کسی طور اپنی روزی کما کھائیں، خوشحال خاں سے لئے جانے والے ڈھول اور طنبورے معزول سرداروں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔"

جہاندار شاہ نادم ہو گیا اور شرمندگی سے اپنی گردن جھکا لی، تھوڑی دیر بعد جب سر اٹھایا تو چین قلیچ خان کا مسئلہ درپیش تھا۔ ذوالفقار خان نے کہا۔ "جہاں پناہ! جب چین قلیچ خان کی سواری بازار سے گزر رہی تھی اسی وقت زہرہ بیگم بھی ڈوم ڈھالیوں کے ساتھ ادھر سے گزری۔ چین قلیچ خان نے از راہِ احتیاط

اپنی سواری کو ایک طرف کر لیا کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ، لیکن زہرہ بیگم کے کم ظرف ہمنشینوں اور مصاحبوں نے چین قلیچ پر پھبتیاں کسنی شروع کر دیں۔ انہوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر سردار کی بے عزتی کی جہاں پناہ یہ تو جانتے ہی تھے کہ چین قلیچ خاں کے والد فیروز جنگ ایک بیماری میں اپنی بینائی کھو بیٹھے تھے۔ خود زہرہ بیگم نے ہاتھی کے ہودج سے باہر حیرہ نکالا اور چیخ کر تمسخرانہ لہجے میں پوچھا کہ کیا فیروز جنگ اندھے کا بیٹا چین قلیچ خان یہی ہے۔ چین قلیچ خان اپنی یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکے اور اپنے آدمیوں کو ان سب کی پٹائی کا حکم دیا۔"

جہاندار شاہ سب کچھ سانس روکے سنتا رہا اور شاید زندگی میں پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ واقعی اب شرفا کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ اسے زہرہ بیگم پر بڑا غصہ آیا لیکن یہاں بھی یہی مجبوری تھی کہ وہ لال کنور کی عزیز ترین سہیلی اور منہ بولی بہن تھی۔

خوشحال خاں کو سند صوبے داری نہیں مل سکی۔ خوشحال خاں جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے یہ طے کیا کہ وہ کسی بھی طرح زینت کا اغوا کر کے کسی دور دراز علاقے میں نکل جائے گا۔ اس نے چند جنگجوؤں کی خدمات اچھے معاوضے پر حاصل کیں اور ایک ایسے وقت جبکہ ذوالفقار خان دربار میں تھا زینت کے مکان پر دھاوا بول دیا۔ محلے والوں نے لڑ بھڑ کر اس کی کوششیں ناکام بنا دیں، جب ذوالفقار خان کو یہ خبر ملی تو اس نے فوراً خوشحال خاں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ وہ گرفتار کر لیا گیا اور پابہ زنجیر ذوالفقار خان کے روبرو کھڑا کر دیا گیا۔ ذوالفقار خان نے پہلے تو اسے برا بھلا کہا لیکن خوشحال خاں نے جب اسے یہ دھمکی دی کہ اس کی بہن لال کنور اسے چھڑا لے گی تو وہ پاگل سا ہو گیا۔ اس نے خوشحال خاں کو بے تحاشا پٹوایا۔ اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے سلیم گڈھ کے قلعے میں قید کر دیا۔

لال کنور نے بہتیری کوشش کی کہ اسے رہا کرا لے لیکن جہاندار شاہ ذوالفقار خان سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ دم بدم خبریں مل رہی تھیں کہ فرخ سیر سادات بارہہ کی حمایت حاصل کر کے اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ جہاندار شاہ ذوالفقار خان پر تکیہ کئے ہوئے تھا اسے کسی بات کی فکر نہ تھی، فرخ سیر آتا ہے تو آئے ذوالفقار خان اس کا بندوبست خود کر لے گا۔

کچھ دنوں سے لال کنور یہ محسوس کر رہی تھی کہ جہاندار شاہ کے جوش و خروش میں کچھ کمی آ گئی ہے انہی دنوں شاہی مالی نے یہ خبر دی کہ امتیاز محل کے درخت مرجھاتے جا رہے ہیں، جہاندار شاہ لال کنور کے ساتھ ان کے معائنے کو پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا تمام درخت بے برگ و بار زرد زرد امربیل کی گرفت میں آ چکے ہیں، امربیل نے ان سب کو جکڑ لیا ہے اور ان کی ساری توانائی چوس رہی ہے؛

جہاندار شاہ نے مالی سے پوچھا "یہ درخت کیوں مرجھائے جا رہے ہیں؟"
شاہی مالی نے ڈرتے ڈرتے ایک نظر لال کنور کو دیکھا اور گردن جھکا کے عرض کیا "جہاں پناہ! ان درختوں کی توانائی امربیل چوسے جا رہی ہے۔ امربیل جو خود غذا نہیں مہیا کرتی بلکہ دوسرے درختوں کی غذا پر زندہ رہتی ہے۔ یہ جب کسی جگہ داخل ہوتی ہے تو بڑی مشکل سے نکلتی ہے اور پورے کو ویران کر کے رکھ دیتی ہے۔"

لال کنور کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ ساری باتیں جیسے امربیل کے پردے میں خود اس کے لئے کہی گئی ہیں، وہ چیخنے لگی "یہ مجھے ذلیل کر رہا ہے۔ یہ مالی۔ کمینہ کم اوقات مجھ پر پھبتی کس رہا ہے اسے اس کی اس گستاخی کی سزا ملنی چاہیئے۔ میں اس وقت تک اپنے آقا بادشاہ سے ناراض رہوں گی جب تک مالی زندہ ہے۔"

جہاندار شاہ کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا کہ یہ سب کچھ لال کنور کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہے، لال کنور کی خفگی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ایک حقیر مالی اور لال کنور میں کیا مقابلہ، چنانچہ مالی کی گستاخی و فضول بیانی کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ اسے قتل کرا دیا جائے۔ جہاندار شاہ نے اسے فوراً قتل کرا دیا۔

فرخ سیر سادات بارہہ کے ساتھ فوجیں لئے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ لال کنور نے سوچا کہ معلوم نہیں جہاندار شاہ کی حکومت کتنے دن اور رہے بہتر ہے کہ اس سے پہلے ہی جتنی خواہشیں ہیں پوری کرا لی جائیں لیکن بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی خواہشیں بھی سمجھ نہ آتی تھیں، ناز برداری اور پرستش کرانے کی خواہش تھی کہ ہر وقت سر اٹھائے رہتی۔ جہاندار شاہ اور لال کنور دریا کی میں کھڑے جمنا کا نظارہ کر رہے تھے اور لال کنور اسی سوچ میں تھی کہ اب کون سی خواہش ہے جو پوری نہیں ہوئی۔ جمنا میں کشتیاں نہا رہے تھے اور کشتیاں اِدھر اُدھر رواں دواں تھیں، لال کنور ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتی رہی۔ جہاندار شاہ کسی کسی لمحے اس کے حسین و جمیل چہرے کو دیکھ کر ایک نشہ سا طاری کر لیتا۔

وہ سوچتا کہ لال کنور میں معلوم نہیں کیا چیز ہے جس نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ لال کنور جمنا کے ساحل پر کھڑی اس کشتی کو غور سے دیکھ رہی تھی جس میں کچھ مسافر سوار ہو چکے تھے اور بقیہ سوار ہو رہے تھے مسافروں میں بوڑھے، بچے، جوان عورتیں اور مرد سبھی تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب کشتی نے ساحل چھوڑا اور دریا کے درمیان کی طرف بڑھی تو لال کنور کے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش پیدا ہوئی۔ جیسے کوئی اس کے اندر میں بیٹھا کہہ رہا ہو۔ "آج تک تو نے کسی کشتی کو ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھا؟"

لال کنور خوفزدہ ہوکر جہاندار شاہ سے چمٹ گئی۔ "جہاندار!" جہاندار شاہ نے اسے بھینچ لیا۔ "جانِ جہاندار!"

"ایک خواہش۔ بس ایک خواہش۔ تم اسے پورا کر دو" لال کنور پر اضطراری کیفیت طاری تھی۔

"خواہش کا اظہار کرو ہم تمہاری ہر خواہش پوری کریں گے!" جہاندار شاہ نے محبت سے اس کی پشت تھپتھپائی۔

اس نے جلدی جلدی پلک جھپکائی اور اپنی لمبی پلکوں کے تیر چلاتی ہوئی مسکرا کر بولی "لیکن خدا کے لئے اس خواہش پر مجھے پاگل ہرگز نہ سمجھنا!"

"نہیں ہم تمہیں اس دور کی سب سے زیادہ فرزانہ اور ہوشمند عورت سمجھتے ہیں"

اس نے ہچکچاتے ہوئے عرض کیا۔ "جہاندار! میں نے آج تک مسافروں سے بھری ہوئی کوئی کشتی ڈوبتے نہیں دیکھی۔ کیا تم میری یہ خواہش پوری نہ کر سکو گے!"

یہ کون سی مشکل یا ناممکن العمل خواہش تھی، جہاندار شاہ نے گویا چٹکی بجاتے ہوئے کہا "بس یہ ذرا سی خواہش؟ اس کی تعمیل بھی کوئی مشکل کام ہے، ابھی تو ہم ابھی تمہاری اس خواہش کو پورا کئے دیتے ہیں"

اور جہاندار شاہ کے فرمانبردار سپاہیوں کا ایک پرا لال کنور کی اس حقیر سی خواہش کو پورا کرنے کے لئے برق رفتاری سے جمنا کی طرف روانہ ہوگیا۔ لال کنور کی نظریں دور دھبے کی طرح نظر آنے والی کشتی پر لگی ہوئی تھیں، جہاندار شاہ کے سرفروش سپاہیوں نے اس کشتی کو واپس کرالیا اور وہ ایک بار پھر اسی ساحل سے آلگی جہاں سے تھوڑی دیر پہلے روانہ ہوئی تھی پھر اسے آہستہ آہستہ بیچ دریا میں لے جایا گیا۔ اور وہاں بھاری بھاری دزنی آلات کی ضربوں سے کشتی کے پیندے میں بڑے بڑے سوراخ کر دیئے گئے بچے بوڑھے جوان سبھی بدحواس عرصۂ محشر کی طرح کشتی میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کی چیخیں قلعے کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ جہاندار شاہ کی نظریں لال کنور کے چہرے پر تھیں اور لال کنور کا چہرہ فرطِ خوشی اور جوشِ دیوانگی میں تمتما اٹھا تھا اس نے ایسا دلچسپ کھیل پوری زندگی میں کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ پانی کے اندر بیٹھتی جا رہی تھی، اور اس کے مسافروں کی آوازیں بھی سطحِ آب کے نیچے غائب ہوتی جا رہی تھیں، جب کشتی بالکل غائب ہوگئی تو لال کنور نے ایک زوردار جھرجھری لی اور جوشِ مسرت میں اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکلنے لگیں۔

مالی کا قتل اور کشتی کی غرقابی کا ظالمانہ فعل زبان زدِ خلائق ہوگیا۔ لوگ جہاندار شاہ سے بیزار ہوگئے۔ فرخ سیر اکبر آباد تک آچکا تھا۔ اب جہاندار شاہ اس کا مقابلہ کرنے پر مجبور تھا، فوجوں کی کمان

ذوالفقار خان کے سپرد کی گئی اور پھر دونوں فوجیں آمنے سامنے ڈٹ گئیں، جہاندار شاہ نے اتنک جو بویا تھا اس کی کٹائی کا وقت آچکا تھا۔ لوگوں کی وفاداریاں مشکوک تھیں، چنانچہ جب زور شور سے معرکۂ کارزار برپا تھا تو جہاندار شاہ اس وقت بھی لال کنور کے ساتھ ہودج میں بیٹھا داد عیش دے رہا تھا۔ فرخ سیر اور اس کی سپاہ کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ جلدی ہی جہاندار کی فوج مغلوب ہونے لگی اکیلا ذوالفقار خان کیا کر سکتا تھا لیکن وہ میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ اسی دوران جہاندار شاہ کی عیش پسندی اور ناعاقبت اندیشی نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا۔ لال کنور اس خونریز معرکے سے بہت خوفزدہ تھی اس نے جہاندار شاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ خواہ مخواہ یہاں اپنا وقت ضائع نہ کرے، اس نے سوچا کہ یہی وہ موقع ہے کہ ذوالفقار خان سے بدلہ لیا جائے اور جنگ کی ساری ذمہ داری اس کو سونپ دی جائے۔ اس نے جہاندار شاہ سے کہا۔ "جہاندار! تم اپنی جان ہلاکت میں کیوں ڈالتے ہو، ذوالفقار خان سے کہو کہ یہی وقت ہے جس میں اس کی وفاداری اور جاں نثاری کا امتحان لے لیا جائے گا"

جہاندار شاہ نے لال کنور کا مشورہ مان لیا اور کسی فیصلے سے پہلے ہی لال کنور کو لے کر شاہجہان آباد روانہ ہو گیا۔ وہاں قلعے میں قیام کرنے کے بجائے ذوالفقار خان کے باپ سعد خان کے پاس چلا گیا۔

فوج نے جب یہ دیکھا کہ جہاندار شاہ کا کہیں پتا نہیں تو چاروں طرف ایک ابتری پھیل گئی۔ ذوالفقار خان انہیں روکنے کی لاکھ کوشش کرتا تھا لیکن کوئی رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذوالفقار خان اپنے آدمیوں کے ساتھ تنہا فرخ سیر کا مدمقابل رہ گیا۔ فرخ سیر بھی اس سے خوفزدہ تھا۔ اور جانتا تھا کہ جب تک یہ میدان جنگ میں موجود ہے جنگ ختم نہ ہوگی۔ اس نے ذوالفقار خان کے نام ایک مختصر سا پیغام بھیجا۔

"سلطنت کا دعویدار تو راہِ فرار اختیار کر چکا کیا تم بھی حکومت کے دعویداروں میں ہو جو اب تک میدان میں ڈٹے ہوئے ہو، اگر تم دعوے داروں میں سے ہو تو یہ امر جُدا ہے اور اگر نہیں تو نسلِ عالمگیری میں جہاندار شاہ نہیں تو میں سہی۔ تمہیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

ذوالفقار خان نے اسی وقت مقابلے سے ہاتھ اٹھا لیا اور شاہجہان آباد روانہ ہو گیا۔ جب وہ اپنے باپ سعد خان کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جہاندار شاہ وہاں پہلے ہی سے موجود ہے اور اس نے بھیس بدلنے کی خاطر اپنی داڑھی مونچھ صاف کرا دیا ہے۔ سعد خان نے اورنگ زیب کے عہد میں تیس سال وزارت کی تھی، اس نے اپنے بیٹے ذوالفقار خان کو سمجھایا کہ اب جہاندار شاہ کے ڈرامے کو ختم ہو جانا

چاہیئے تم فرخ سیر کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن ذوالفقار خان کو اپنے باپ کا یہ مشورہ پسند نہ آیا۔ اس نے اس مسئلے پر زور بحث کی لیکن جہاندیدہ باپ نے بیٹے کو ہار ماننے پر مجبور کر دیا۔ سعد خان کا خیال تھا کہ فرخ سیر اسے معاف کر دے گا۔

ابھی فرخ سیر شاہجہان آباد کے قلعے میں داخل نہ ہوا تھا اور اپنے شاہی خیمے میں فروکش تھا۔ کہ سعد خان نے جہاندار شاہ اور لال کنور کو اس کے حوالے کر دیا اور خود ذوالفقار خان کے ہاتھوں کو رومال سے باندھ کر فرخ سیر کے روبرو لے گیا۔ اس نے نئے بادشاہ سے سفارش کی کہ اس کے بیٹے کی غلطیاں معاف کر دی جائیں۔

فرخ سیر احتراماً اپنی جگہ سے اٹھا اور ذوالفقار خان کے دونوں ہاتھ کھلوا دیئے اسے بیش بہا خلعت اور قیمتی جواہرات سے نواز دیا۔ اس نے سعد خان سے کہا "تم واپس جا سکتے ہو، بوڑھے ہونے کی وجہ سے تم آرام کرنے کے مستحق ہو۔"

سعد خان کا ماتھا ٹھنکا۔ "اور ذوالفقار خان؟"

فرخ سیر نے جواب دیا۔ "یہ ابھی یہیں ٹھہرے گا۔ ہمیں اس سے کچھ مشورے لینے ہیں!"

باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا گویا آپس میں کہہ رہے ہوں کہ "اب خیر نہیں، فرخ سیر کی نیت درست نہیں۔"

سعد خان پریشان اور پراگندہ حال گھر جا پایا گیا۔ ذوالفقار خان خیمے ہی میں روک لیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد فرخ سیر اس سے مخاطب ہوا۔ "او ذلیل انسان! کیا تو ہمارے باپ اور بھائی کے قتل میں جہاندار شاہ کا معاون اور مشیر نہ تھا؟"

ذوالفقار خان فرخ سیر کے اس خطرناک لہجے سے ذرا بھی نہ گھبرایا۔ "مجھے اس سے کوئی انکار نہیں ہمیں اس بازی میں جو مسلسل کھیلی جا رہی ہے اگر حصہ لینا ہے تو کسی کا دوست اور کسی کا دشمن بننا ہی پڑے گا۔ لیکن سلطان کریم الدین کی موت کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔"

"نمک حرام" فرخ سیر برس پڑا۔ "تو زبان دراز اور گستاخ بھی ہے۔ موت سر پر منڈلا رہی ہے اور تو اس سے اب بھی خوفزدہ نہیں۔"

ذوالفقار خان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "نمک حرامی کی تہمت مجھ پر نہیں تجھ پر لگ سکتی ہے۔ تو اپنے چچا جہاندار شاہ کا بنگال میں ملازم تھا اور اب تو اسے شکست دے کر اس کا حق غصب کرنے کی فکر میں ہے۔"

فرخ سیر اس گستاخی پر ذوالفقار خان کو خود بھی سزا دے سکتا تھا لیکن ذوالفقار خان کے تیور یہ بتاتے تھے کہ اگر فرخ سیر نے اس سے کسی بھی قسم کی زیادتی کی تو یہ سب کے سامنے اسے ذلیل کر کے رکھ دے گا۔

فرخ سیر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ سب بہتے ذوالفقار خان پر ٹوٹ پڑے۔ پہلے دھوکے سے اس کے گلے میں تسمہ ڈالا اور اس سے گلا گھونٹ دینا چاہا، ذوالفقار خان مردانہ وار اُلجھ گیا اور وہ مدافعت کرنے لگا لیکن فرخ سیر کے دوسرے اشارے نے ذوالفقار خان کو قتل کرا دیا۔

یہی الزامات بلکہ اس سے بھی سنگین جہاندار شاہ پر لگائے گئے وہ ان الزامات سے کس طرح انکار کر سکتا تھا لال کنور اس سے چھین لی گئی۔ اسے قلعے میں بھیج دیا گیا۔ اس لئے کہ اب جہاندار شاہ کا اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہو چکا تھا۔ اور فرخ سیر نے بھی جہاندار شاہ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کا مستحق سمجھا کہ شاہی اعزاز و احتشام سے لال قلعے میں رہتی رہے۔

اسی دن جہاندار شاہ کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ فرخ سیر کی دونوں کو قتل کرا دینے سے بھی سیری نہ ہوئی۔ اس نے ایک نیا فرمان جاری کیا۔ "جہاندار شاہ کی لاش سے اس کا سر جدا کر دیا جائے۔ اور لاش کو ہاتھی پر رکھ کر پورے شہر میں تشہیر کرائی جائے۔" اور ذوالفقار خان کی لاش کے لئے یہ حکم صادر ہوا۔ "اسی ہاتھی کی دم سے ذوالفقار خان کی لاش باندھ دی جائے اور اس ہاتھی کو پورے شہر میں اس طرح گھمایا پھرایا جائے کہ اس کے پیچھے ضعیف دکھن سال سعد خان اپنے عام لباس میں اس ہاتھی کے پیچھے پیچھے ہو۔ نیز اس کے خاندان کی خواتین بھی اپنی اپنی نقاب میں اس جلوس میں شرکت کریں۔ لال کنور بھی جلوس میں شامل ہوگی۔

اس فرمان کے جاری کرنے کے بعد فرخ سیر نے اپنے چچازاد بھائی، جہاندار شاہ کے بیٹے کی آنکھوں میں گرم گرم سلاخیں پھیروا کر اندھا کر دیا۔

جب جہاندار شاہ اور ذوالفقار خان کی لاشوں کا جلوس نکلا تو بوڑھا سعد خان اپنے خاندان کی پردہ نشین خواتین کے ساتھ اپنے بیٹے کی لاش کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں کلیجہ باہر نکلا آرہا تھا۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اور سینے میں غم واندوہ کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ خواتین چیخیں مار مار کر رونا چاہتی تھیں لیکن فرخ سیر کے خوف سے اس غم کے پہاڑ کو سینے کے اندر ہی ضبط کرنے پر مجبور تھیں یہ جلوس جدھر سے گزرتا۔ لوگوں کی آنکھیں نم ہو جاتیں، ان دنوں یہ تماشا عام تھا۔ شاہجہان آباد کے لوگ ایسے تماشے تو آئے دن ہی دیکھتے رہتے تھے لیکن پھر بھی عادی نہ ہوتے تھے۔

آنکھیں اُبل ہی پڑتی تھیں، اور شدتِ جذبات سے گلے رندھ ہی جاتے تھے۔

لال کنور بھی چپ تھی، جمنا میں ڈبوئی جانے والی کشتی اور اس کے مسافروں کی چیخ و پکار اور واویلا کی وحشتناک صدائیں اس وقت بھی کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس وقت سعد خان کی نظریں لال کنور پر پڑیں، اورنگ زیب کے بوڑھے وزیر نے کہا: "لال کنور! تو نے جمنا میں مسافروں سے بھری کشتی نہیں ڈبوئی تھی بلکہ جہاندار شاہ کی حکومت کو جمنا کی تہہ میں ڈبو دیا تھا۔"

لال کنور نے فرخ سیر کے سپاہیوں کے خوف سے اشک آلود رخسار جلدی سے پونچھ ڈالے، اس وقت مظلوم مالی کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

"جہاں پناہ! یہ امربیل ہے جو تمام درختوں کی غذا چوسے جا رہی ہے۔ امربیل اپنی غذا خود نہیں پیدا کرتی بلکہ یہ دوسرے درختوں کی غذا پر زندہ رہتی ہے۔ یہ ایک بار کسی درخت کو اپنی گرفت میں لے لے تو پھر مشکل ہی سے اس کی جان چھوڑتی ہے۔"

کہتے ہیں بادن سالہ جہاندار شاہ نے مرتے وقت افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ "افسوس! میں پیدا تو ہوا تھا عقاب کے گھرانے میں لیکن زاغ و زغن کی صحبتوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"

داستانِ حور

ہلاکو خان

نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی، بے شمار مسلمان قتل کر کے دریائے دجلہ میں بہا دیئے گئے جن کے خون سے پانی کا رنگ سُرخ ہوگیا مسلمانوں کے بعد ان کے کتب خانوں کی باری آئی اور ان قرآنی حرفوں میں لکھی جانے والی کتابوں کو دریائے دجلہ میں انڈیل دیا گیا۔ کتابوں کی سیاہی پانی میں گھُلی تو دریا کا پانی سیاہ ہوگیا اور کتابوں کے انبار نے دریا میں بند سا تعمیر کر دیا جو مسلمان کسی طرح بچ گئے تھے ان میں سے بیشتر نے قاہرہ کا رُخ کیا۔ منگول شہسوار گھوڑوں اور بیلوں کی دموں کے پرچم لیے ان کے تعاقب میں لگے تھے باپ کو بیٹی کا پتہ تھا اور نہ شوہر کو بیوی کا۔ قیامت کی نفسا نفسی کا عالم تھا۔ اسی نفسا نفسی میں بغداد کا ایک علمی گھرانہ جب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تو اسے اپنی منزل کا کوئی پتہ نہ تھا۔ یہ قافلہ چار افراد پر مشتمل تھا، یعقوب، جو اس خاندان کا سربراہ اور بغداد کا نامی گرامی عالم اور طبیب تھا، اس کی بیوی، ان کا اٹھارہ سالہ لڑکا وقیع اور سولہ سالہ لڑکی حور۔ اس کا نام آگے

اور تھا لیکن خاندان کے لوگ اس کے مثالی حسن اور چہرے کی معصومیت کی وجہ سے اسے حور کہتے تھے۔ خدا معلوم انہوں نے کس طرح دیناروں سے اپنے بوری جیسے تھیلے کو بھر لیا تھا اور اس کو ساتھ لے کر گھر چھوڑ دیا تھا۔ حور اور اس کی ماں کو ایک اونٹ پر محمل کے اندر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے وقیع اور اس کا باپ رہتے۔ سفر تو یہ لوگ نہایت دلیری سے کر رہے تھے لیکن انہیں اپنے پیچھے مغلوں کے نمودار ہونے کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا۔ یہ لوگ بغداد سے دمشق پہنچے اور دمشق سے یروشلم روانہ ہو گئے اور یہ جس جگہ بھی پہنچتے یہی معلوم ہوتا کہ منگول ان کے تعاقب میں چلے آ رہے ہیں۔ راہ میں انہی جیسے اور لوگ بھی مل گئے۔ یروشلم میں چند دن رہ کر انہوں نے قاہرہ کا رُخ کیا۔ ان کے قافلے میں کئی ہزار افراد شامل تھے جن میں بچے، ضعیف و ناتواں مرد اور عورتیں، مضمحل اور شکست خوردہ جوان مستقبل سے مایوس نوجوان خواتین، صحرائے سینائی کی طرف اس طرح بڑھ رہے تھے جیسے صحرا کے اس پار کوئی ایسا قلعہ موجود تھا جو منگولوں کی دسترس سے دور اور ناقابلِ تسخیر تھا۔ سڑک کے آس پاس سایہ دار درختوں نے انہیں دھوپ کی تمازت سے بچا رکھا تھا کہیں کہیں ان درختوں کے اندر سے گرجوں کے مینارے جھانک رہے ہوتے۔ شکستہ حال مسلمان ان گرجوں کی طرف نفرت و حقارت سے دیکھتے اور عیسائیوں کو بددعائیں دینے لگتے کیوں کہ ان کے علم میں یہ بات خوب اچھی طرح آ چکی تھی کہ مسیحی ہلاکو خان اور اس کی خونخوار منگول فوج کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ سب کچھ ہلاکو خان کی مسیحی بیوی دوقوز خاتون کی ایما اور منشا پر ہو رہا ہے۔

انہیں یکایک بہت سارے گھوڑوں کے ہنہنانے اور ان کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ قافلے کے لوگ گھبرا کے پیچھے دیکھنے لگے اور ان میں سے چند نے بیلوں اور گھوڑوں کی دموں کے پرچم کو اٹھا ہوا دیکھا اس پرچم نے قافلے میں ہراسانی پھیلا دی اور جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ منگولوں نے اپنے سواروں کو ان کے تعاقب میں اس طرح ڈال دیا گویا وہ شکاری کتے ہوں، منگول سوار ان کے قریب آتے جا رہے تھے۔ یعقوب کی سمجھ میں اور کچھ تو آیا نہیں، وہ قافلے سے بچھڑ کے یروشلم کی آبادی میں داخل ہو گیا اور کسی سے پوچھے بغیر ایک چرچ میں پناہ لے لی۔ قربان گاہ کے اوپر حضرت مسیح اور ان کی ماں مریم کی خیالی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں انہوں نے گرجے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا لیکن اسی لمحے ایک طرف سے گرجے کا ادھیڑ عمر پادری نمودار ہوا اور اس نے پوچھا "تم لوگ کون ہو؟ اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

یعقوب نے جواب دیا "جناب! میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مسلمان ہوں، منگول ہمارا پیچھا کر رہے ہیں، تم ہمیں پناہ دو!"

پادری نے کہا "گو کہ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے لیکن تم لوگ گرجے میں داخل ہو چکے ہو اس لیے میں تمہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا!"

یعقوب نے پادری کا شکریہ ادا کیا۔ حور کو پادری نے اپنے بچوں میں پہنچا دیا، حور کی ماں باہر گرجے ہی میں رہی، وہ اپنے شوہر کی رفاقت سے لمحہ بھر کے لیے بھی محروم نہیں رہنا چاہتی تھی۔ یعقوب اپنی بیوی اور بیٹے وقیع کو اس طرح

ہدایات دینے لگا گویا یہ اس کا آخری وقت تھا۔ اس نے بیوی اور بیٹے کو نصیحتیں کرتے ہوئے کہا "اگر میں زندہ نہ رہوں تب بھی تم دونوں حور کے ساتھ قاہرہ چلے جانا اور وقیع وہاں تم فن سپاہ گری حاصل کرو گے اور اس میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد تم منگولوں سے جنگ کرو گے اور بغداد کی تباہی کا بدلہ لو گے"۔ اس کے بعد بیوی سے کہا "اور تم، ہاں تم بھی میری بات ذرا کان کھول کے سن لو یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم وقیع کو انتقام کے لائق بنا دو"۔

اسی لمحے گرجے کے بڑے دروازے سے کئی منگول اندر داخل ہو گئے ان کے جسموں پر پوستینیں تھیں اور ان کی چینیوں سے کسی قدر کم کھینچی ہوئی آنکھیں لرزہ طاری کر رہی تھیں۔ پادری نے انہیں دیکھتے ہی گرجے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور یعقوب سے کہا "اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ خونخوار اتنی جلدی یہاں آ جائیں گے تو ہم تمہیں کبھی بھی یہاں نہ روکتے اور اندر خاندان میں پہنچا دیتے"۔

وقیع کو جوش آ گیا، نوجوانی کا خون غصے اور غیرت سے اُبلنے لگا۔ اس نے پادری سے کہا "میرے بزرگ! کیا آپ کے گھر میں اسلحہ ہوں گے؟"

پادری نے جواب دیا "یہ اس نبی کی عبادت گاہ ہے جو عدم تشدد کا پیغمبر تھا۔ ہمارے گھروں میں ہتھیاروں کا کیا کام؟"

وقیع نے بدستور جوش میں کہا "مجھے باہر جانے دو میں منگولوں ہی سے ہتھیار چھین کے انہیں ٹھکانے لگا دوں گا!"

یعقوب نے بے زاری سے کہا "وقیع! تمہاری عقل کہاں چلی گئی؟ کیا تم ان خونخوار اور خون آشام منگولوں سے بالکل واقف نہیں؟ ان کے مقابلے کے لیے جوش اور تدبیر دونوں ہی درکار ہیں"۔

پادری نے ہونٹوں پر خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہوئے انگلی رکھ دی اور آہستہ سے کہا "تم لوگ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاؤ منگولوں کی آہٹیں ہمارے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں"۔

اسی لمحے کسی نے دروازے پر دستک دی اور کسی نے تحکمانہ انداز میں کہا "دروازہ کھول دو ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے"۔

پادری نے ان تینوں کو قربان گاہ کے پیچھے پہنچا دیا "اس دوران منگول گرجے کا دروازہ پیٹتے رہے۔ پادری نے اپنی جگہ پر واپس جا کے سوال کیا "تم لوگ اندر کیوں آنا چاہتے ہو؟"

منگول آواز نے جواب دیا "دروازے کھول دو، سوال جواب سے ہماری توہین ہوتی ہے، ہم اندر کیوں آنا چاہتے ہیں اس کا جواب سننے کے بجائے آنکھوں سے دیکھ لینا"۔

پادری نے پُروقار لہجے میں کہا "تم لوگ ایک وعدہ کرو، یہ ایک مسیحی عبادت گاہ ہے تمہیں اس کا احترام کرنا پڑے گا!"

"باہر سے جواب ملا" ذلیل انسان! چپ چاپ دروازے کھول دے ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے!"

پادری نے دروازے کھول دیئے اور تقریباً پچاس منگول گھوڑوں سے کود کود کے گرجے کے ہال میں داخل ہو گئے۔ ان کا سردار ان سب سے آگے تھا اور کسی کی تلاش میں پانچوں حواس سے کام لے رہا تھا۔ پادری بے بسی سے ان کی حرکات دیکھتا رہا۔ بالآخر ایک منگول نے ان تینوں کو قربان گاہ کے ایک گوشے سے برآمد کر لیا۔ یعقوب کا چہرہ خوف سے سفید ہو گیا۔ بیوی نے چادر میں اپنا منہ چھپا لیا اور دقیع نے ایک شدید جھٹکے سے خود کو چھڑا لینا چاہا۔ اس پر منگول کو سخت غصہ آیا۔

اس نے چھرے کی ایک شدید ضرب سے اس ہاتھ ہی کو کاٹ دیا جس سے یہ جھٹکا دیا گیا تھا۔ خون کا فوارہ اڑا اور ماں کی چادر بھیگ گئی۔ دقیع کی کربناک چیخ سے گرجے کا ہال گونج گیا، ماں نے پیچھے پلٹ کے جو یہ منظر دیکھا تو وہ بھی چیخ چیخ کے رونے لگی۔ پادری ان وحشیوں کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

منگول سردار آگے بڑھا اور اس نے یعقوب سے کہا "تم مسلمان لوگ اس جادوانی آسمان کے نیچے ہماری سرحدوں سے کہیں بھی دور نہیں ہو ہم زمین کے آخری سرے تک تمہارا پیچھا کر سکتے ہیں۔"

یعقوب نے بے بسی سے منگول سردار کو دیکھا اور کوئی جواب دیئے بغیر اپنی نظریں جھکا لیں۔

پادری نے تڑپتے ہوئے دقیع کو رحم آمیز نظروں سے دیکھا اور منگول سردار سے کہا "سردار! محبت خدا ہے تم انسانوں پر رحم کرو گے تو اوپر خدا تم پر رحم کرے گا۔"

منگول سردار نے جواب دیا "ہم جادوانی آسمان کا قہر ہیں جنہیں ان مسلمانوں پر نازل کیا گیا ہے ہم عیسائیوں کے نجات دہندہ ہیں تمہیں ہماری راہ میں نہیں حائل ہونا چاہیئے۔"

اس کے بعد منگول سردار ایک دم یعقوب کی بیوی کی طرف مڑ گیا اور اس کے چہرے سے چادر کھینچ کے دور پھینک دی۔ ایک چھبتیس سینتیس سالہ گداز جسم اور تیکھے خدوخال کی عورت اس کے سامنے تھی منگول سردار کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، بڑی ترنگ میں بولا "بالکل میری بیوی کی ہم عمر لیکن اس سے حسین، اس سے کچھ زیادہ خوبصورت!"

اس کے بعد پادری سے کہا "مسیح کے بیٹے! تم یہاں سے چلے جاؤ" اور یعقوب سے کہا "تم مسلمان جب اپنے دشمنوں کو مغلوب کر کے ان کے مال اور دولت پر قبضہ کر لیتے ہو تو اسے مال غنیمت کہتے ہو آج اسی طرح تیری بیوی میرے لیے مال غنیمت ہے۔ اپنی بدقسمتی پر صبر کر اور جو کچھ ہونے والا ہے اسے ایک بہادر مفتوح کی طرح قبول کر۔"

اس کے بعد منگول سردار نے اپنے چند ساتھیوں کو اشارے سے پہرہ دینے کو کہا اور ان پہرے داروں کے درمیان اس نے یعقوب کی ادھیڑ عمر بیوی کو گرا دیا۔ زخمی دقیع جوش غیرت میں آگے بڑھا لیکن ایک منگول نے تلوار کے بھرپور وار سے اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی۔ دقیع چیخ مار کے گر گیا اور تڑپنے لگا۔ یعقوب کے سینے، پیٹ اور پشت پر منگولوں کے نیزے ٹکے ہوئے تھے جو اس کی ذرا سی مزاحمت پر ایک ساتھ جسم میں پیوست ہو سکتے

تھے۔ کئی منگولوں کے درمیان یعقوب کی بیوی منگول سردار کی گرفت میں ایک کمزور پرند کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

گرجے کے باہر کھلے میدان میں منگولوں نے پڑاؤ ڈال دیا یہ پڑاؤ ایک ایسی گزرگاہ پر واقع تھا جہاں سے ان تمام راستوں کی نگرانی کی جاسکتی تھی جن سے گزر کے تباہ حال اور غریب الوطن مسلمان مصر میں داخل ہو سکتے تھے۔ سارا دن ریشمی لباس پر پوستین ڈالے چوڑی ناکوں اور کھنچی آنکھوں والے منگول ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دیتے پادری اور اس کے شاگرد ان کے ظلم اور بربریت سے زیادہ ناخوش نہیں تھے، ایک عرصے سے ان کی مسلمانوں سے آویزش چلی آرہی تھی اور اس آویزش میں مسلمان تقریباً ہمیشہ ہی سرخرو اور سربلند رہے تھے اور عیسائیوں کو شرمندگی اور ندامت اٹھانی پڑی تھی لیکن آج ان وحشی منگولوں کے ہاتھوں انہیں ایک عظیم الشان مگر اتفاقی برتری اور فتح حاصل ہو گئی تھی، جس تشدد سے پادری کو چند دن پہلے ذرا دکھ پہنچا تھا آج اس تشدد کو اس نے اس لئے گوارا کر لیا تھا کہ جنگوں میں تشدد کے بغیر چارہ کار ہی نہیں۔ ایک مسلمان لڑکی حور اس کے گھر میں پناہ گزین تھی اور اسے یہ یقین دلا کے خاموش رکھا گیا تھا کہ اس کے کنبے کے بقیہ تینوں نفر ایک دوسری جگہ چھپا دیئے گئے ہیں اور موقع ملتے ہی ان سب کو بچا کر کے مصر روانہ کر دیا جائے گا۔ حور نے کئی بار اپنے کمرے کی کھڑکیوں سے وحشی اور خونخوار منگولوں کو ادھر سے ادھر آتے جاتے دیکھا تھا۔ پادری کے کئی شاگرد حور کو نت نئی معلومات فراہم کر دیا کرتے تھے اور اس طرح ان میں ایک خاموش مقابلہ شروع ہو چکا تھا اور اس مقابلے کا ہر فرد اس کوشش میں تھا کہ اس بے یار و مددگار لڑکی کی محبت حاصل کر کے اس کو مسیح بنا لینے کا شرف حاصل کرے۔ ان شاگردوں میں ایک ریمنڈ نامی نوجوان بھی شامل تھا۔ وہ وقت بے وقت حور کے پاس آجاتا اور گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا دل بہلاتا رہتا۔ حور بھی اس میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

پادری منگولوں کے ساتھ آبادی کے مسلمان گھروں کی نشاندہی کے فرائض انجام دے رہا تھا اور منگول وحشی آبادی کی مسجدوں کو آگ لگاتے پھر رہے تھے اور مسلمانوں کا مال اسباب لوٹ رہے تھے، عورتیں انہیں لذتِ شہوانی فراہم کر رہی تھیں۔ حور کھڑکی کے پاس بیٹھی ماضی حال اور مستقبل میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ باہر گرجے کے لان میں رنگ برنگے پودے لہلہا رہے تھے اور ان میں لگے ہوئے مختلف قسم کے پھولوں نے موسم بہار کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ حور نے دیکھا پریشان بال ریمنڈ گرجے سے نکلا اور اس کی طرف آنے لگا اس کی نظریں بار بار حور کی کھڑکی کی طرف اٹھ رہی تھی جب وہ کھڑکی کے قریب آگیا تو اس کی نظریں اچانک حور سے ٹکرا گئیں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے ریمنڈ کے ہاتھ میں سرخ گلاب کا ایک پھول تھا، اس نے یہ پھول حور کی طرف اچھال دیا اور حور نے شرما کے گردن جھکا لی۔ اس نے باہر ہی سے دریافت کیا "حور! خیریت تو ہے تم کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی ہو؟"

حور نے جواب دینے کے بجائے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اندر چلی گئی ریمنڈ چکر لگا کے مکان کے اندر داخل ہو گیا اس وقت حور کچھ زیادہ ہی اداس تھی۔ ریمنڈ نے ایک بار پھر اس سے دریافت کیا "حور! تم پریشان کیوں ہو؟"

حور نے جواب دیا "ریمنڈ! جو لوگ اس گھر میں آتے جاتے ہیں ان میں تم سب سے زیادہ لائق اعتبار نوجوان

ہو، اس لئے میں تمھیں اپنا ہمراز بنا کے دل کا بوجھ اتار دینا چاہتی ہوں"!

ریمنڈ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ زلفوں کی شریر لٹوں نے حور کی ایک آنکھ چھپا رکھی تھی۔ ریمنڈ نے شوخی سے کہا حُور! باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی پہلے تم اپنی زلفوں کی بدلی کو آنکھ پر سے ہٹا دو کیونکہ ایک آنکھ کا نشہ، شرابی بننے میں حائل ہو رہا ہے"!

حور نے گھبرا کے سر جھٹکا یا تو چند دوسری لٹوں نے دوسری آنکھ کو بھی اپنی نقاب میں لے لیا۔ ریمنڈ کھلکھلا کے ہنس دیا بے ساختہ بولا۔ "لیجئے جناب وہ آنکھ بھی گہن میں آگئی"۔

"ریمنڈ! حور نے دکھ سے کہا۔ اس وقت میں ایک لاوارث لڑکی ہوں اور تم لوگ جس طرح چاہو مجھ سے ملو اور باتیں کرتے رہو لیکن میں خود ان باتوں میں خوش دلی سے شریک نہیں ہو سکتی میں نے کئی بار سوچا کہ تم سے ذرا دور دور رہوں اور تمھاری ہر بات کو خاموشی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے دوں لیکن پھر تمھاری سادہ لوحی اور پاک طینتی کا احساس میری اس فکر پر غالب آجاتا ہے اور میں تم سے بات چیت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہوں، لیکن اگر تم میرے دل کو ٹٹول کے دیکھو تو اس میں مایوسی اور اداسی کے سوا اور کچھ بھی نہ ملے گا۔ ایسی اداسی اور مایوسی جس سے سکتے کا مرض لاحق ہو سکتا ہے"!

ریمنڈ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ بولا "حور! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھاری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگائے بغیر تم سے پُر لطف باتیں شروع کر دیں"! پھر قدرے خاموش رہ کے پوچھا "اگر تمھاری اداسی اور مایوسی کا میں کوئی علاج کر سکتا ہوں تو میں حاضر ہوں۔ مطلع کرو"!

حور نے نم آنکھوں سے ریمنڈ کی طرف دیکھا اور کہنے نہ کہنے کے تذبذب کا شکار ہو گئی۔

ریمنڈ نے کہا "اگر تم مجھ پر واقعی اعتماد کرتی ہو تو جو کچھ دل میں ہے۔ بلا جھجک کہہ دو شرماؤ مت"!

حور نے جواب دیا "میں اس گھر میں رہتے رہتے اکتا سی گئی ہوں مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ میرے ماں باپ اور بھائی زندہ بھی ہیں یا مر گئے ریمنڈ! تم سوچو تو کہ آخر میں کب تک یہاں رہوں گی، میں کب تک اس مقدس اور لائق تعظیم شخص پر بار بنی رہوں گی جسے تم سب مقدس باپ کہتے ہو"!

اسی وقت پادری بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے حور کی باتیں سُن لی تھیں۔ بولا "حور بیٹی! میں نے تمھیں خوشی سے اپنے گھر رکھا ہے تمھارے ماں باپ اور بھائی ایک دوسری جگہ رہ رہے ہیں مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم لوگ مصر جانا چاہتے ہو لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ان حالات میں کہ صحرائے گوبی سے گزرنے والے مغل تم مسلمانوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں تمھیں کس راستے سے مصر بھیجا جا سکتا ہے، تمھیں کچھ دن صبر کرنا پڑے گا"!

حور روہانسی ہو گئی، بولی۔ میں زندگی کی پروا کئے بغیر آپ لوگوں سے استدعا کروں گی کہ مجھے میرے والدین اور بھائی سے ملا دیا جائے"!

پادری نے کسی قدر پس و پیش سے کہا "بیٹی! میں تجھ سے ایک سچی بات کہنے کے لئے کئی دن سے بے چین ہوں اگر تو اجازت دے تو کہہ گزروں؟"

حور نے ڈبڈبائی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور آہستہ سے کہا "کہیئے"۔

پادری نے کہا۔ یہ زمانہ عالم اسلام کے لئے نہایت پُر آشوب ہے اور گو مجھے یہ بات اپنی زبان سے نہیں کہنی چاہیئے لیکن سچی بات کو کوئی کب تک چھپائے رکھ سکتا ہے ایک زمانہ اس خیال پر متفق ہو چکا ہے کہ یہ دور اسلام کے سکرات کا ہے آج نہیں تو کل یہ نزع کی کیفیت بھی جاتی رہے گی اور اسلام ختم ہو جائے گا اور انسانیت مسیحیت کی آغوش میں چلی جائے گی"۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد اپنے دل کی بات بھی کہہ دی۔ اس لئے عقلمندی کا یہی تقاضا ہے کہ ایک دم ٹوٹتی شے کو چھوڑ کر ایک زندہ اور جاوداں حقیقت کو اختیار کر لیا جائے؟

حور کی آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ مایوسی سے بولی "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اسلام کو چھوڑ دوں اور مسیحیت اختیار کر لوں؟"

"ہاں"! پادری کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں "حور بیٹی! یہ سب کچھ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ منگو قیا کے فاتح یہ آخری فیصلہ کر چکے ہیں کہ اسلام کو مصر سے بھی نکال باہر کیا جائے وہ مسلمانوں کو افریقی ریگ زاروں میں دھکیل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منتشر اور پریشان کر دینا چاہتے ہیں اور منگولوں کی حالیہ سینتیس سالہ یلغاروں سے اقوام عالم اس نتیجے پر پہنچ چکی ہیں کہ ان ناقابل تسخیر فاتحین کو ان کے ارادوں سے باز رکھنا انسانی عزم و حوصلے کی بات نہیں ہے انہوں نے جب اور جیسا کچھ چاہا ہے حاصل کر کے دم لیا ہے"۔

حور نے جواب دیا "لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں ان سے خوفزدہ ہو کے اسلام کو چھوڑ دوں؟"

پادری نے حوصلہ شکنی کی۔ بولا "جس عقیدے اور جس مذہب کو آج نہیں تو کل فنا ہو جانا ہے اس سے چمٹے رہنا کہاں کی عقلمندی ہے"؟ پھر ریمنڈ کی تائید حاصل کرنے کے لئے اسے مخاطب کیا "ریمنڈ! اس معصوم اور نادان لڑکی کو تمہیں کچھ سمجھاؤ!"

ریمنڈ اس مسئلے کے جذباتی پہلو کو پادری سے کچھ زیادہ ہی سمجھتا تھا شاید اس لئے کہ اسے حور اچھی لگتی تھی۔ اس نے جواب دیا "مقدس باپ! یہ ایک جذباتی مسئلہ ہے مجھے اس پر اظہار خیال سے معاف رکھا جائے"!

ریمنڈ کے جواب سے حور کی ہمت بندھی، اس نے پادری سے کہا "اگر آج منگول وحشی مسیحیت کی سرپرستی سے دست کشی اختیار کر لیں اور مسلمانوں پر مہربان ہو جائیں اور یہ فیصلہ بھی کر لیں کہ مسیحیت کو روئے زمین سے مٹا دینا ہے تو کیا اس وقت آپ مسیحیت سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان ہو جائیں گے"؟

ریمنڈ کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق آگئی اور پادری بوکھلا گیا لیکن اس نے غیر معمولی تحمل سے کام لیا۔ بولا۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو میں واقعی اس پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا"!

حور نے کہا "لیکن میں ترکِ اسلام پر کبھی بھی آمادہ نہ ہوں گی"۔

پادری نے مایوسی سے کہا "سننے میں آیا ہے کہ مصر کا مملوک جنرل بیبرس منگولوں سے جنگ کرنا چاہتا ہے اور منگول بھی مصر کی تسخیر کا فیصلہ کر چکے ہیں، اگر ایسا واقعی ہو گیا تو وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے کہ اسلام واقعی افریقی صحراؤں میں بھٹک بھٹک کے اپنی جان دے دے"۔ پھر مملوک جرنیل کا مذاق اڑاتا ہوا بولا "اور وہ بیبرس تاتاری غلام جو دمشق کے بازارِ غلاماں میں چار سو نقرئی سکوں میں خریدا گیا تھا آج ناقابلِ تسخیر منگول قوت سے نبرد آزما ہونے کی ہمت کر بیٹھا ہے اور اس کا جو انجام ہو گا ہمیں ابھی سے معلوم ہے"۔

حور نے جواب دیا "اسلام میں مایوسی کفر ہے، میں اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ میرے محترم بزرگ خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور کسی بات پر مجھے مجبور نہ کریں"!

پادری نے ابھی جواب میں زبان بھی نہ کھولی تھی کہ باہر سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ شور و غل بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ پادری پریشان ہو کے باہر چلا گیا۔ ریمنڈ نے پادری کے جاتے ہی حور سے کہا "حور! میں تمہارے جواب سے بہت خوش ہوا"۔

حور نے ریمنڈ کو اُمید بھری نظروں سے دیکھا اور کہنے لگی "میں یہاں بے آس اور بے بس قیدی کی طرح زندگی گزار رہی ہوں، کیا تم اتنی ہمت کر سکتے ہو کہ کسی طرح مجھے میرے والدین اور بھائی وقیع سے ملا دو اور اگر بدقسمتی سے یہ لوگ زندہ نہ ہوں تو کیا تم خطرہ مول لے کر مجھے مصر تک پہنچانے پر آمادہ ہو جاؤ گے"؟

ریمنڈ کا دل دھڑکنے لگا۔ پوچھا "لیکن اگر خدانخواستہ تمہارے والدین اور بھائی واقعی زندہ نہ ہوں تو تم مصر کس کے پاس جاؤ گی"؟

حور نے جواب دیا "مصر کے مسلمان میرے دینی رشتے دار ہیں وہاں میں کسی کے ساتھ بھی رہ سکتی ہوں"!

ریمنڈ نے ڈرتے ڈرتے پیش کش کی "لیکن اگر تم مصر نہ بھی جاؤ اور یہیں یروشلم میں رہ جاؤ تو میں تم سے یہ وعدہ کرنے کو تیار ہوں کہ تمہیں ترکِ مذہب پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور میں اپنی پوری زندگی تمہاری مرضی اور تابعداری میں گزارنے کو آمادہ ہوں"!

حور نے پوچھا "کیا تم میرے ساتھ مصر نہیں چل سکتے"؟

ریمنڈ نے کہا "یروشلم میں میرے والدین ہیں، بھائی بہن ہیں عزیز رشتے دار ہیں، میں انھیں کس طرح چھوڑ سکتا ہوں"؟

حور نے افسردگی سے جواب دیا "لیکن میں یہاں یروشلم میں نہیں رہ سکتی میں مصر جانے پر مجبور ہوں"۔

باہر شور و غل بڑھتا جا رہا تھا۔ دونوں کھڑکی کے پاس بیٹھ کے باہر کی طرف دیکھنے لگے، جہاں منگولوں کے خیمے نصب تھے وہاں کافی لوگ جمع تھے اور منگول سردار گھوڑے پر سوار اِدھر اُدھر چکر لگاتا پھر رہا تھا

پھر لوگوں کا ہجوم ایک طرف سمٹنے لگا اور دور دمشق سے آنے والی شاہراہ گرد و غبار میں ڈوب گئی، دیکھتے ہی دیکھتے گھڑسواروں کی قطاریں نمودار ہونے لگیں، انہیں دور ہی سے پہچانا جا سکتا تھا یہ گھڑسوار منگول تھے ان کے سروں پر بالوں کا جنگل سا اگا ہوا تھا اور جن لوگوں نے بالوں کی ٹوپیاں اوڑھ رکھی تھیں ان کے بال دونوں کنپٹیوں اور گدی پر بکھرے ہوئے تھے۔

ریمنڈ نے کہا "حور! خدا خیر کرے یہ منگولوں کا ٹڈی دل لشکر معلوم ہوتا ہے"!

حور نے مایوسی سے کہا "ہاں، شاید اب یروشلم میں ایک مسلمان بھی زندہ نہ بچے اور ان کی ساری عبادت گاہیں چیوٹ کر زمیں بوس کر دی جائیں"! پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں آسمان کی طرف اٹھا دیئے اور کہنے لگی "خدایا! اگر اسلام واقعی کوئی باطل مذہب ہے تو تو اسے واقعی نیست و نابود کر دے لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اب اسلام اور مسلمانوں پر رحم فرما"!

ریمنڈ نے حور کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور باہر جاتے ہوئے کہا "میں اصل واقعہ معلوم کر کے تمہیں مطلع کروں گا حور! تم میرا انتظار کرو"!

ریمنڈ کے چلے جانے کے بعد بھی حور کھڑکی کے پاس ہی بیٹھی رہی اس نے دیکھا جب گھڑسواروں کا سلسلہ ختم ہوا تو پیادہ فوج کی قطاریں نمودار ہو گئیں اور یہ کئی گھنٹے تک سامنے سے گزرتی رہیں، ان کے پیچھے بار بردار اونٹوں کی قطاریں تھیں چھوٹے بڑے اور ایک ایک اور دو دو کوہان والے اونٹوں کی پُرپیچ قطاریں کہیں کہیں متوازی اور کہیں کہیں ایک دوسرے سے ذرا الگ الگ بے ترتیبی سے بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ اونٹوں کے پیچھے بیل گاڑیاں تھیں جن کی چوں چوں کی آوازوں سے فضا میں دور تک جل ترنگ بجنے لگے تھے۔

حور کو رات ہی کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اب منگول مصر پر لشکر کشی کرنے والے ہیں اور اس نئے لشکر کی آمد کا مقصد ہی یہ تھا کہ منگول اپنی عسکری قوت کو یک جا کر کے مصر اور یروشلم کے درمیان کی مسلم آبادی اور عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کرتے ہوئے قاہرہ میں داخل ہو جائیں اور پھر وہاں بھی بغداد کی طرح انسانی خون کا سیلاب بہا دیں۔ حور کے دل پر یکایک مایوسیوں نے غلبہ کیا اور وہ یہاں تک ناامید ہو گئی کہ اسے اپنی زندگی وبال سی محسوس ہونے لگی وہ اپنے ماں باپ اور بھائی کی طرف سے بالکل ناامید ہو چکی تھی۔ وہ پادری سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔ ریمنڈ پر کسی حد تک ضرور بھروسا کرتی تھی لیکن یہ احساس کہ ریمنڈ بھی مسیحی ہے اس کا دل توڑ دیتا اور وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگتی۔ پادری گھر میں آتا اور حور سے کسی قسم کی بات کئے بغیر واپس چلا جاتا اس نے اپنے بیوی بچوں کو یروشلم سے ہٹا دیا تھا۔ اب حور گھر میں تنہا رہ گئی تھی۔ ریمنڈ اس کے پاس آتا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلا جاتا۔ وہ حور سے کسی نازک مسئلے پر بات کرتے ہوئے خوف کھاتا تھا کیونکہ وہ حور کی جذباتیت سے واقف ہو چکا تھا۔

وہ روز صبح و شام گرجے کی گھنٹیاں سنتی اور کھڑکی سے مسیحی عورتوں اور مردوں کو گرجے کی طرف جاتے اور اندر داخل ہوتے دیکھتی، پھر اس پر ماحول کا کچھ کچھ اثر ہونے لگا اور گرجے کی گھنٹی کی آواز پر گردن جھکائے خاموش طبع لوگوں کو گرجے کی طرف جاتے اور گرجے کے اندر داخل ہونے کے مناظر نے اسے متاثر کرنا شروع کر دیا۔ وہ سوچتی، کیا گرجے میں کوئی دوسرا خدا ہوتا ہے اور مسجد میں کوئی اور خدا؟ کیا عیسیٰ کی پیغمبری اور رسالت کی قرآن پاک گواہی نہیں دیتا؟ یہاں اس کے دل سے تعصب کی گرد اڑنے لگتی اور وہ سوچتی کہ مسیحیت بھی کوئی برا مذہب نہیں پھر اس کے دل میں گرجا میں جانے اور ناصریوں کے طریقۂ عبادت دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن وہ مسیحی ہجوم کے ساتھ اس گرجے میں نہیں جانا چاہتی تھی، وہ سنسان اور ویران گرجے میں گھس کے اسے دیکھنا چاہتی تھی۔

ایک دن دوپہر میں پادری گھر میں سویا ہوا تھا، حور نے موقع غنیمت دیکھ کر چپکے سے گرجا کا رُخ کیا، وہ لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی گرجے میں داخل ہو گئی۔ گرجے کی پُرسکون اور باوقار فضا نے حور کے دل میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا۔ دیواروں پر جگہ جگہ عہد نامۂ جدید کے ٹکڑے لکھے ہوئے تھے اس نے رک رک کے ان ٹکڑوں کو پڑھنا شروع کیا یہ متی کی انجیل کے ٹکڑے تھے۔

"مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی اُن ہی کی ہے۔"

مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہ تسکین پائیں گے۔

مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔

مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے بھوکے پیاسے ہیں کیونکہ وہ آسودہ ہوں گے"!

ان ٹکڑوں سے اس کا دل بھر آیا، اسے ایسا لگا جیسے یہ سب کچھ اس کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں وہ آہستہ آہستہ قربان گاہ تک پہنچ گئی وہاں ایک طرف ایک اونچی سی ڈیسک پر کتاب الدعا رکھی ہوئی تھی۔ وہ کتاب الدعا کو بھی پڑھنا چاہتی تھی لیکن اس نے قربان گاہ کے سامنے کسی کو سجدے میں گرا ہوا دیکھا اس نے اس شخص کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، یہ ریمنڈ تھا اور وہ کچھ اتنے خشوع و خضوع سے سجدے میں گیا تھا کہ اسے حور کی آمد تک کا علم نہ ہو سکا۔ وہ آہستہ آہستہ کوئی دعا بھی کر رہا تھا۔ حور اس سے ذرا اور پیچھے ہٹ آئی اور اس کی مناجات سننے کی کوشش کرنے لگی۔ ریمنڈ سجدے میں گرا مناجات کر رہا تھا۔

"اے آسمانی بادشاہت کی بشارت دینے والے! میں اس نمک کی طرح ہوں جس کا کھارپن چھن گیا ہو۔

میں اس سمندر کی طرح ہوں جس کی تہہ میں طوفان سو گیا ہو۔

اور میں بانس کی اس نلکی کی طرح ہوں جس میں سُر تو چھپے ہیں لیکن ان سُروں کو چھیڑنے والا ناپید ہے۔

خدایا! کیا میں اسلام کی اس بیٹی سے محروم رہوں گا جو مجھ سے اتنی ہی قریب ہے جتنا تو اپنے ایک بندے سے۔

آسمان کی بادشاہوں کے مالک تو قرآن کی پرستار حور کو حضرت مسیح کے دامن میں پناہ لینے پر مائل کر دے۔
حور کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت ریمنڈ کو سجدے سے اٹھا کے لڑنا جھگڑنا شروع کر دے۔ کیونکہ وہ معلوم نہیں ایسی دعا کیوں مانگ رہا تھا۔ حور نے ریمنڈ کو ہوش میں لانے کے لئے زمین پر زور زور سے پیر پٹکے۔ ریمنڈ نے آواز کی طرف آنکھیں اٹھا دیں۔ حور کو غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے کھڑے ہو کے حور سے پوچھا "حور! تم یہاں؟ کیا میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"
حور نے خوش دلی سے جواب دیا "نہیں تم خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں حقیقتاً گرجے کے اندر اور تمہارے روبرو کھڑی ہوں!"
ریمنڈ کا خوشی سے بُرا حال تھا۔ اس نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے دل کی بات تم سے کس طرح اور کن لفظوں میں کہوں!"
حور نے جواب دیا "اگر تم کچھ بھی نہ کہو تب بھی میں یہ جانتی ہوں کہ تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا پوچھنا چاہتے ہو!"
ریمنڈ نے پلک جھپکاتے بغیر کہا "اچھا بتاؤ تو بھلا کہ میں تم سے کیا کہنا یا پوچھنا چاہتا ہوں؟"
"کیا تم یہ نہیں جاننا چاہتے کہ میں یہاں کیا لینے آئی ہوں"
"ہاں!" ریمنڈ نے جواباً کہا۔ "اور یہ کہ تمہیں گرجے کی فضا سے کس قسم کا سکون حاصل ہوا؟"
حور نے جواب دیا "ابھی جب میں گرجے میں داخل ہوئی تھی تو میں نے اس کی دیواروں پر لکھی ہوئی عبارتیں پڑھنا شروع کر دیں اور مجھے اب یہ محسوس ہوا ہے، جیسے یہ سب کچھ میرے ہی لئے لکھ دیا گیا ہے"
ریمنڈ نے سراپا اشتیاق بن کے سوال کیا۔ مثلاً کون سی عبارت؟ کون سے ٹکڑے؟"
حور نے کہا "خصوصاً وہ ٹکڑے جن میں غم گین لوگوں، حلیم الطبع انسانوں اور راست بازوں کو نویدیں سنائی گئی ہیں!"
ریمنڈ خوشی سے پاگل ہونے لگا۔ بولا۔ تو اب تو تمہیں مسیحیت کی سچائی کا یقین آ گیا؟ اب تو تم یروشلم ہی میں رہ بس جانا پسند کرو گی؟"
حور نے آہستہ سے کہا "نہیں یہ بات نہیں ہے" پھر وہ بلا کی سنجیدہ ہو گئی، بولی "میں یہاں یہ دیکھنے آئی تھی کہ مسجد کے خدا اور گرجے کے خدا کا باہمی فرق معلوم کروں لیکن افسوس کہ اس تلاش کا نتیجہ بہت ہی معمولی اور عام سا نکلا!"
ریمنڈ نے کسی شاگرد کی طرح گردن ہلائی اور پوچھا "کیا فرق تمہیں نظر آیا؟"
حور نے جواب دیا "مجھے یہ معلوم کر کے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ جو خدا مسجد میں ہوا کرتا ہے وہی گرجے میں

بھی محسوس ہوا، وہی وقار اور وہی سکون جو ایک مسجد میں ملتا ہے گرجے میں بھی ہے۔ لوگ خواہ مخواہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں!"

ریمنڈ کو امید بندھی، پوچھا۔ "اگر وہی سچائی جو اسلام میں موجود ہے۔ مسیحیت میں بھی پائی جاتی ہے۔ تو حور تمہیں مسیحیت اختیار کر لینے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے!"

حور نے کہا "ولیسکن میں تو تم سے بھی یہی اقرار کرانا چاہتی ہوں کہ جو صداقت تمھیں مسیحیت میں دکھائی دیتی ہے وہی اسلام میں بھی موجود ہے!"

"میں اس حقیقت کو کس طرح جھٹلا سکتا ہوں!"

حور نے کہا "میں تو صرف یہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اب جب کہ تم اسلام کی صداقت کو بھی تسلیم کر چکے ہو میں تم سے یہ درخواست کروں گی کہ تم اسلام اختیار کر کے اور دینی اور دُنیوی سُرخروئی حاصل کر لو!"

ریمنڈ سہم سا گیا، بولا "حور! میں اس مسئلے پر سوچ تو سکتا ہوں لیکن اس پر عمل نہیں کر سکتا۔ آخر کوئی انسان اپنے باپ دادا کے مذہب کو کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟"

حور نے طنزاً کہا "کوئی انسان اپنے باپ دادا کا مذہب خود چھوڑ تو نہیں سکتا لیکن دوسروں سے چھوڑنے کی درخواست ضرور کر سکتا ہے!"

ریمنڈ نے شرمندگی سے کہا "اچھا حور! اب تم مجھے مزید شرمندہ نہ کرو میں حضرت مسیح کی قسم کھا کے یہ یقین دلانے پر تیار ہوں کہ میں آئندہ کبھی اس موضوع پر کوئی بات تک نہ کروں گا!"

حور نے ڈرتے سہمتے ریمنڈ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ سے کہا "کیا محبت کی حدت زندہ رکھنے کے لئے کافی نہیں ہوتی، جب ہم دونوں اس تلخ اور ناخوشگوار حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں کہ اپنے باپ دادا کا مذہب ہم کسی طرح بھی نہ چھوڑیں گے تب پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کے محبت کی لو کی دھیمی دھیمی آنچ میں زندہ رہنے کی کوشش کیوں نہ کریں؟"

"ہاں ایسا ممکن تو ہے!" ریمنڈ نے حسرت سے کہا "ولیسکن میں تو ابھی سے یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ محبت کی یہ دھیمی دھیمی آنچ ایک نہ ایک دن گوشت پوست کو گھلا چکنے کے بعد ہڈیوں تک کو راکھ کر کے رکھ دے گی۔ میں تو ابھی سے گھلنے پگھلنے لگا ہوں!"

حور کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اس کا دل پگھلنے لگا اور اس گداز کا تاثر بھر بھرائے ہوئے چہرے سے ظاہر ہونے لگا۔ وہ ریمنڈ کا ہاتھ پکڑ کے ایک بار پھر متی کی انجیل کے ان ٹکڑوں کی طرف لے گئی جہاں دیوار پر کندہ تھا۔

مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہ تسکین پائیں گے۔

مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی اُن ہی کی ہے۔"

حور نے مذبذب انداز میں سوال کیا "کیا ہمیں آسمان کی بادشاہی کی خاطر دنیا میں صبر و تحمل نہیں اختیار کرنا چاہیئے؟"

ریمنڈ لاجواب ہو چکا تھا، مقدس عہد نامہ جدید کی اس عبارت کے خلاف کیونکر بول سکتا تھا۔ جواب دیا "ہاں اگر خداوند کی مرضی اسی میں ہے تو ہم کر بھی کیا سکتے ہیں!"

× × × ×

پادری کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی عدم موجودگی میں حور گرجے میں گئی تھی اور عہد نامہ جدید کی عبارتوں نے اسے بہت متاثر کیا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ وحشی منگولوں سے بھی بہت خوش تھا کیونکہ وہ مسیحیت کی نہایت فراخ دلی سے سرپرستی کر رہے تھے اسے مسلمانوں کی ہٹ دھرمی پر غصہ تھا کہ یہ لوگ ان غیر یقینی اور نامساعد حالات میں بھی اپنا مذہب چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے جب منگول یروشلم میں داخل ہوئے تھے تو آئے دن مسجدیں اور مسلمانوں کی دوسری یادگاریں پھونکی جا رہی تھیں۔ فضا میں دھواں اس طرح معلق اور منجمد ہو گیا تھا گویا ابر چھا گیا ہو۔ ہلاکو خان بغداد کی تباہی کے بعد قراقرم روانہ ہو چکا تھا کیونکہ وہاں منگولوں کا حکمران خان مر چکا تھا اور کسی نئے خان کے انتخاب کا مسئلہ طے پانا تھا ہلاکو خان نے اپنے مشہور جرنیل قط بوغا کو مصر کی مہم پر لگا دیا تھا۔ روانگی سے پہلے ہلاکو خان نے قط بوغا سے کہا تھا "خاقان جو مر چکا ہے اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ مصر کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ کام میں خود انجام دیتا لیکن خاقان کی موت کے بعد میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ اس لئے مصر کی مہم تم سر کرو۔"

قط بوغا نے بھوکے بھیڑیئے کی کھال اپنے شانوں پر ڈال لی تھی اور جواب دیا تھا "میں مصر کی تھوتھنی اس طرح کچل دوں گا جس طرح سانپ کا پھن کچلا جاتا ہے"!

ہلاکو خان نے روانگی سے پہلے مصر کے فرماں روا کے نام ایک خط لکھ دیا تھا۔

"یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ تم اپنی فصیلیں منہدم کر دو اور اطاعت قبول کر لو اگر تم ہماری بات مان لو گے تو تمہیں چین سے زندہ رہنے دیا جائے گا لیکن اگر تم نے یہ بات نہ مانی تب پھر جو پیش آنا ہے پیش آئے گا اور ہم کیا جانیں کیا پیش آئے گا اس کا علم تو بس جاودانی آسمان کو ہے۔"

یہ خط مصر پہنچ چکا تھا اور مصر کے تاتاری مملوک جرنیل نے جو جواب دیا تھا وہ قط بوغا اور دوسرے منگول سرداروں کو مشتعل کر دینے کے لئے کافی تھا۔ مصر کا مملوک جرنیل منگولوں سے جنگ کے لئے بالکل تیار تھا اس نے جنگ کو ناگزیر بنانے کے لئے منگول سفیروں کو قتل کروا دیا تھا۔ بیبرس کی اس حرکت نے قط بوغا اور دوسرے منگولوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔ اس نے جملہ منگول عساکر اور سامان جنگ کو یروشلم میں جمع کر لیا اور مصر کی بربادیوں کے منصوبے بنانے لگا۔ اس نے بیبرس کی حرکت کا معمولی انتقام یوں لیا کہ یروشلم کے بچے کھچے مسلمانوں کو بھی پکڑ لیا گیا اور انہیں اذیتیں دے دے کر مارنے کے لئے ایک شاندار جشن منایا گیا۔ ایک بڑے میدان کو رسّوں کے گھیرے میں

لے لیا گیا۔ رستوں کے اندر مسلمانوں کو کھڑا کر دیا گیا اور احاطے کے باہر منگول اور مقامی عیسائی تماشائی بن کے جمع ہو گئے ابھی یہ تماشا شروع بھی نہ ہوا تھا کہ قطبوغا کو مطلع کیا گیا کہ مصر سے خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ آیا ہے اور اس کے پاس مملوک جرنیل بیبرس کے بارے میں بڑی معلومات ہیں۔ قطبوغا نے حکم دیا "اسے ہمارے سامنے پیش کیا جائے"!

مصری خانہ بدوشوں کا سات رکنی وفد قطبوغا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ وفد کا سردار ایک عجیب مسخرا شخص تھا اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا اور اس کی ایک آنکھ میں نیلاہٹ تھی۔ جب اس نے یہ بتایا کہ اس نے بیبرس کو بہت قریب سے دیکھا ہے تو قطبوغا کو اس سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ اس نے پوچھا "تم ایک خانہ بدوش قوم سے تعلق رکھنے والے انسان آخر بیبرس کو کس طرح جانتے ہو"؟

خانہ بدوش نے جواب دیا "مجھے گانے کا بڑا شوق ہے اور بیبرس کو میرا گانا بہت پسند ہے"!

قطبوغا نے پوچھا "تمہارا مذہب"؟

خانہ بدوش نے جواب دیا "خانہ بدوشوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یہ جس ملک اور شہر کے امراء کا کھاتے ہیں وہی ان کا مذہب ہو جاتا ہے"!

قطبوغا نے پوچھا "بیبرس کیسا آدمی ہے"؟

خانہ بدوش کی ایک دم ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ بمشکل ہنسی پر قابو پا کر بولا "یراہ کرم پانی پلوادو بڑے زور کی پیاس لگ رہی ہے"!

قطبوغا نے ایک خدمت گار کو پانی لانے کا حکم دیا اور خانہ بدوش سے پھر سوال کیا "تم نے بتایا نہیں کہ بیبرس کیسا آدمی ہے"؟

وہ ایک بار پھر قہقہہ مار کے ہنس دیا بولا "بیبرس بھی کسی آدمی کا نام ہے۔ ارے وہ تو اعلیٰ درجے کا مسخرا ہے اور وہ شاید مجھے اسی لئے بہت زیادہ پسند کرتا ہے کہ میں خود بھی مسخرا ہوں"!

خدمت گار نے اسے پانی کا پیالہ دیا جسے اس نے منہ سے لگا لیا۔

قطبوغا نے پھر پوچھا "وہ جرنیل کیسا ہے"؟

خانہ بدوش کی پھر ہنسی چھوٹ گئی اور اس کے منہ کا پانی پر زور فوارے کی طرح اٹھ کر قطبوغا کے کپڑوں کو تر کر گیا۔ خانہ بدوش سہم کر ایک دم خاموش ہو گیا اور معافی مانگتا ہوا بولا "جناب والا! آپ کا سوال اتنا دلچسپ تھا کہ میں ہنسی نہ روک سکا۔ میں معافی چاہتا ہوں"!

قطبوغا کو بیبرس کے بارے میں معلومات درکار تھی اس لئے خانہ بدوش کی زیادتی کو برداشت کر گیا۔ اس نے پھر سوال کیا۔ "بیبرس جرنیل کیسا ہے"؟

خانہ بدوش پھر ہنسنے لگا۔ بولا "بیبرس مسخرا اچھا ہے۔ جرنیل کیسا ہے؟ اس کا صحیح جواب اس کا کوئی واقف کار سپاہی بہتر طور پر دے سکتا ہے۔"

قط بوغا نے پوچھا "بغداد اور اس کے نواح کے جن مسلمانوں نے مصر میں پناہ لی ہے۔ اس سے مصری باشندوں پر کیسا اثر پڑا ہے؟"

خانہ بدوش نے جواب دیا "ہر طرف خوف و دہشت کی لہر دوڑی ہوئی ہے اور مصری باشندے منگولوں کے ذکر سے ڈرنے لگے ہیں۔" "کیا مصری دولت مند بھی ہیں؟"

"دولت مند ــــ؟ اجی جناب بغداد کی طرح قاہرہ بھی فاطمی خلفاء کا پایۂ تخت رہا ہے اور وہاں اتنی ہی دولت موجود ہوگی جتنی کہ بغداد سے ہاتھ آئی ہوگی!"

قط بوغا نے کہا "میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں تم بیبرس کے ساتھ رہ چکے ہو۔ اور اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ قاہرہ لے چلوں گا، کیا تم میرے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟"

خانہ بدوش نے جواب دیا "آپ کے ساتھ رہنے میں مجھے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیشہ ایک بات کا دھڑکا لگا رہے گا۔ میں اس کی آپ سے ضمانت طلب کروں گا؟"

قط بوغا نے پوچھا "کس بات کی ضمانت؟"

خانہ بدوش نے جواب دیا "منگول سردار! ہم خانہ بدوش لوگ آزاد رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہمارا کوئی وطن نہیں ہے۔ آج یہاں، کل وہاں، ایک جگہ جم کر رہنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے اور یہی آزادہ روی ہے جس نے ہمیں ضرورت سے زیادہ لاپروا اور بے فکرا بنا دیا ہے اور ہم لاعلمی میں ایسی زندہ دلی کا مظاہرہ کر جاتے ہیں جسے مہذب لوگ برداشت نہیں کرتے اور ہم سے بہت جلد بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود بیبرس بھی ہماری زندہ دلی سے عاجز آگیا اور ہمیں اس سے جدا ہو جانا پڑا۔"

قط بوغا نے عاجز آ کے پوچھا "لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟"

خانہ بدوش نے جواب دیا "اپنی اور اپنے ساتھیوں کے جان و مال کا تحفظ۔ اگر کبھی کوئی ایسی ویسی حرکت ہم سے سرزد ہو جائے جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ہنس ہنس کے آپ کے کپڑوں پر کلی کر دی تھی۔ اس قسم کی کچھ اور گستاخیاں بھی وقوع پزیر ہو سکتی ہیں جن کی ہم پیشگی معافی مانگنے پر مجبور ہیں۔"

قط بوغا نے جواب دیا "احتیاط رکھو۔ ہم بھی تمہاری باتوں کا خیال رکھیں گے!"

خانہ بدوش نے کہا "میری طبیعت میں مزاح اور تمسخر کا عنصر فطری اور قدرتی ہے۔ میں بھی محتاط رہنے کی کوشش کروں گا لیکن فطرت پر قابو پانا انسان کے بس کی بات نہیں ہے!"

قط بوغا نے کہا "تم لوگ میرے ساتھ رہو۔ میں تم سب کو مالا مال کر دوں گا۔ قاہرہ پہنچ کر میں تم لوگوں سے کچھ

ضروری کام لینا چاہتا ہوں۔ تم بیبرس کو جانتے ہو اور اس کے قریب رہ چکے ہو میرے لئے یہ بڑے کام کی بات ہے اور تم اس پہلو سے میرے لئے سودمند ہو۔"

خانہ بدوش نے منگول سردار کا شکریہ ادا کیا۔ قط بوغا نے کہا "بیبرس نے میرے سفارتی نمائندگان کو قتل کر کے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے اور یہ ویسا ہی جرم ہے جیسا ایک بار محمد خوارزم شاہ نے خان اعظم چنگیز خان کے سفراء کو قتل کر دینے کی صورت میں کیا تھا اور خان اعظم نے اس جرم کی اسے جو سزا دی تھی اسے لوگ بھولے نہیں ہیں۔ اب وہی سزا میں بیبرس کو دوں گا۔ اس زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے بیبرس کو پناہ کے لئے کوئی جگہ نہ مل سکے گی۔"

خانہ بدوش نے ہنستے ہوئے کہا "بیبرس ایک مسخرا انسان ہے۔ اس نے جنگیں دیکھی نہیں ہیں اسی لئے وہ تم منگولوں کی داستان شجاعت و خونخواری کو مبالغہ آمیز قصے سمجھتا ہے!"

قط بوغا نے کہا "اچھا۔ تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں مسلمانوں کا تماشا دکھاؤں۔ بیبرس نے میرے آدمیوں کو قتل کرا دیا۔ لیکن دیکھو میں ان مسلمانوں کو جوابی کارروائی کے طور پر کس ظلم اور سفاکی سے ہلاک کرتا ہوں یہ تماشا بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آؤ۔ تم لوگ میرے ساتھ آؤ۔!"

خانہ بدوش انکے ساتھ اس میدان میں پہنچ گیا جہاں رسّوں کے حصار میں یروشلم کے قیدی مسلمانوں کو سزائیں دینے کے لئے جمع کیا گیا تھا۔

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

قط بوغا چند خونخوار منگولوں کے ساتھ رسّوں کے حصار میں چلا گیا اس مجمع میں ریمنڈ اور پادری بھی موجود تھے قط بوغا نے پادری کو حصار کے اندر بلا لیا۔ پادری ریمنڈ کے ساتھ اندر چلا گیا۔ خانہ بدوش مسخرے کا خیال تھا کہ اسے بھی اندر بلا لیا جائے گا لیکن منگول سردار نے اسے اندر نہیں بلایا۔ خانہ بدوش خود ہی اندر پہنچ گیا اور بھاگ کر منگول سردار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بولا "میں نے سوچا مجھے اندر تو بلایا ہی جائے گا پھر میں خود کیوں نہ آ جاؤں!"

اس کے بعد پادری کے گلے میں لٹکی ہوئی صلیب کو انگلی سے اچھالتا ہوا بولا "اور جناب آپ کا یہاں کیا کام؟ مسیح نے یہ تو کہا تھا کہ اگر تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارا جائے تو تم اپنا دوسرا گال بھی آگے بڑھا دو اور مسیح نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کوئی تمہیں بیگار میں ایک کوس لے جائے تو تم اس کے ساتھ دو کوس چلے جاؤ۔ لیکن کیا مسیح نے یہ بھی کہا تھا اگر منگول ایک مسلمان کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو تم ان سے پوری مسلمان آبادی کا صفایا کرا دو!"

پادری نے گھبرا کے منگول سردار کی طرف دیکھا وہ اس مسخرے کا تعارف چاہتا تھا۔ منگول سردار نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مسیحیوں کے مقدس باپ! یہ ایک مسخرا خانہ بدوش ہے اس کی باتوں کا برا نہ ماننا یہ اپنی ان حرکات کی مجھ سے پیشگی معافی مانگ چکا ہے۔"

پادری نے کہا "حضرت مسیح نے دل آزاری سے منع کیا ہے منگول سردار! تم اسے منع کرو کہ یہ اپنے تمسخر کا کم از کم مجھے تو نشانہ نہ بنائے۔"

منگول سردار نے بھوکے بھیڑیئے کی کھال اتار کے خانہ بدوش کے شانے پر ڈال دی اور ہنستے ہوئے اسے منع کیا۔

"خبردار جو تم نے اس بزرگ کی شان میں کوئی گستاخی کی!"

خانہ بدوش ریمنڈ سے مخاطب ہو گیا۔ پوچھا "تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

ریمنڈ نے کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ وہ اس مسخرے کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔

قط بوغا نے اعلان کیا "لوگو! تماشا دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اس کے بعد اس نے دو بھوکے دق زدہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں شمشیریں تھما دیں۔ اور کہا "یہ دونوں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے اور ان میں جو فاتح رہے گا اسے معاف کر دیا جائے گا۔"

تماشائیوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور دونوں نحیف و نزار مسلمان ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے ان کی صورتوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کئی دن کے فاقوں سے ہیں۔ دونوں نے مضبوطی سے تلواریں پکڑ لیں لیکن ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے ان میں کا ایک ہمت کر کے دوسرے پر جھپٹا لیکن کمزوری نے اسے ڈھیر کر دیا دوسرے نے موقع غنیمت دیکھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن وہ زمین پر ذرا کھسک گیا اور حملہ آور کی تلوار زمین سے ٹکرا کر ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ زمین پر گرے ہوئے حریف نے اپنے مقابل کو نہتا جو دیکھا تو فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نہتے پر حملہ کر دیا۔ ہاتھ میں اتنا زور ہی نہ تھا کہ وہ اپنے مقابل کو ایک ہی وار میں ہلاک کر دیتا۔ تلوار شانے پر پڑی اور پھسلتی ہوئی نکل گئی۔ زخمی نے چیخ ماری۔ قط بوغا ہنسنے لگا بولا "میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ ان کا مقابلہ دیکھوں۔ یہ ایک دوسرے کو کسی طرح نہیں مار سکتے۔" پھر اس نے ایک منگول کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا "ان دونوں کی مشکل آسان کر دی جائے اور زندگی کی تہمت سے نجات دلائی جائے۔"

منگول نے تیر کمان میں جوڑا اور ایک مسلمان کی گردن کا نشانہ لے کر چھوڑ دیا۔ تیر اس کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ زخمی نے چیخ ماری اور تیورا کے ڈھیر ہو گیا۔ تماشائیوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں دوسرا مسلمان بھاگ کے قط بوغا کے قدموں میں آن گرا اور گڑگڑا کے جان کی امان مانگنے لگا۔ قط بوغا نے اپنا نیزہ دوسرے منگول کے حوالے کر دیا اور اسے حکم دیا۔

"نجات۔ آزادی، زندگی کے مصائب سے گلو خلاصی"۔

نیزہ بردار منگول اس کے پاس چلا گیا اور ایک خالی گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ اس نے قط بوغا کو ذرا دور ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ چوگان کھیلنے کے انداز میں نیزے کو تانے ہوئے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا مدقوق مسلمان کی طرف بڑھا اور اسے نیزے میں مچھلی کی طرح پرو کے اٹھا لیا۔ زخمی نے چیخ ماری اور تماشائیوں نے ایک بار پھر نعرۂ تحسین و آفرین بلند کیا۔ زخمی نیزے میں پھنسا ہوا پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اس کے بعد قط بوغا نے ایک عمر رسیدہ مسلمان کو قریب آنے کا حکم دیا۔ پادری اسے دیکھتے ہی قط بوغا سے مخاطب ہوا بولا "معزز منگول سردار! خدا تمہیں اور کامرانیاں عطا کرے کیا تم میری خاطر اس شخص کو رہا کرنا پسند کرو گے"؟

قط بوغا نے بے رخی سے جواب دیا "یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے تم سب کی خاطر ہو رہا ہے۔ مسیحیت کے فروغ اور بقا کے لئے ہو رہا ہے۔ پھر تم اس ذلیل انسان کی سفارش کیوں کر رہے ہو"؟

خانہ بدوش نے ایک گنجے منگول کی چاند سہلا دی بولا "اس میدان کو بنجر مت رکھو۔ اس میں کچھ اگاؤ تاکہ چہرہ بھلا لگے"۔

وحشی منگول نے تلوار سونت لی اور غصے میں بولا "میں تجھے قتل کر دوں گا۔ تو نے مجھ سے تمسخر کیوں کیا"؟

قط بوغا نے جواب دیا "اس مسخرے کو معاف کر دو۔ اس وقت یہ میرا مصاحب ہے اور اتنی چھوٹ تو میں نے خود دے رکھی ہے؟ اس سے بگڑنے کے بجائے تم سب کو اس مسخرے کی باتوں سے لطف اندوز ہونا چاہیئے"۔

رمینڈ نے پادری سے سرگوشی میں پوچھا "یہ کون ہے جس کی آپ سفارش کر رہے تھے"؟

پادری نے جواب دیا "حور کا باپ"۔

رمینڈ ایک دم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حور کے باپ کو دیکھنے لگا اس کی حالت بھی یہی بتا رہی تھی کہ وہ کئی دنوں کا بھوکا ہے۔

قط بوغا نے اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ قریب آ گیا تو اس نے بشاش لہجے میں دریافت کیا "کیا تم واقعی بھوکے ہو"؟

حور کے باپ نے بے بسی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

قط بوغا نے پوچھا "تم کیا کھانا پسند کرو گے"؟

حور کے باپ نے جواب دیا "جو بھی مل جائے"!

خانہ بدوش مسخرا ان دونوں کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ قط بوغا نے پھر سوال کیا۔ "کیا تم کو گوشت

پسند ہے"؟

حور کے باپ نے خوشی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "ہاں مجھے گوشت بہت پسند ہے"۔

قط بوغا نے اپنا خنجر اس کے حوالے کر دیا۔ بولا "یہاں آگ اور مصالحے کا انتظام کرنا تو مشکل ہے۔ دونوں مسلمانوں کی لاشیں موجود ہیں ان کا جتنا گوشت بھی کھا سکو کھا لو"!

پادری نے ایک بار پھر درخواست کی "منگول سردار! میں اس شخص کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ براہ کرم اسے معاف کر دیا جائے"۔

قط بوغا ناراض ہو گیا، بولا "تم سفارش کرنے والے کون ہوتے ہو؟ براہ کرم اسے معاف کر دیا جائے"

پادری سہم کے چپ ہو گیا لیکن پھر فوراً ہی کچھ سوچ کے نئی درخواست پیش کر دی۔ اس نے قط بوغا سے کہا۔ "کیا میں اس شخص سے کچھ باتیں کر سکتا ہوں"؟

منگول سردار نے تلخی سے کہا "جا۔ باتیں کر لے لیکن خبردار جو کوئی ایسی ویسی بات کی"!

پادری حور کے باپ کے پاس پہنچ گیا "تم کتنے دن کے بھوکے ہو میرے دوست"؟

اس نے جواب دیا۔ "تین دن کا"۔

"تمہاری بیوی اور بیٹے کا کیا ہوا"؟

اس نے جواب دیا "بیوی کو یہ منگول لے گیا۔ بیٹا مر گیا"۔

پادری نے کہا "میرے دوست! تمہاری بیٹی حور میرے ساتھ سکون سے رہ رہی ہے اسے تمہاری بابت کچھ بھی نہیں معلوم وہ میرے ساتھ بہت خوش ہے، تمہارے بعد میں اس کے لئے کیا کروں گا یا مجھے کیا کرنا چاہیئے اس سلسلے میں ضرور کچھ بتاتے جاؤ"۔

حور کے باپ نے جواب دیا "تم وہی کرنا جو تم اپنی بیٹی کے ساتھ کرتے"۔

پادری نے رینڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ نوجوان رینڈ میرا شاگرد ہے اور تمہاری حور سے محبت کرنے لگا ہے۔ کیا میں اس کی حور سے شادی کر دوں"؟

حور کے باپ نے پوچھا "کیا یہ حور کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہے"؟

پادری نے بھونچکا ہو کے جواب دیا "تم اب بھی مذہب کی باتیں کئے جا رہے ہو"؟

حور کے باپ نے کہا "اگر یہ مسلمان ہو جائے تو میری طرف سے اسے اجازت ہے کہ یہ حور سے شادی کر لے"!

قط بوغا نے مداخلت کی، درشتی سے بولا "جلدی ختم کرو اپنی باتیں میرے پاس اتنا وقت کہاں"؟

خانہ بدوش نے کہا "اس ایک بھوکے پیاسے نہتے کو تم لوگ اتنی اذیتیں دے رہے ہو کہ اس کا کوئی

اپنی کوئی زمین نہیں۔ تم ہر جگہ اور ہر چیز سے سرسری گزر جاتے ہو اور کسی شے کی محبت کا سودا نہیں پالتے۔ تم کیا جانو کہ محبت کسے کہتے ہیں، خداوند مسیح کا ارشاد ہے کہ محبت خدا ہے اور تم اس محبت ہی سے واقف ہی نہیں پھر تم سے کس بات کی شکایت کی جائے تم سے ہر بات ممکن ہے"!

خانہ بدوش نے جواب دیا "اور تمہارے خداوند مسیح نے یہ بھی تو فرمایا ہے کہ اگر کوئی تمہیں بیگار میں ایک کوس لے جائے تو تم اس کے ساتھ دو کوس چلے جاؤ۔ تمہارے مسیح نے انسانی دل آزاری کو بدترین گناہ قرار دیا ہے لیکن تم نہایت آسانی سے اسی گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو۔ تمہارے مذہب میں عورت کا مطلب معصیت ہے اور تم ایک معصیت کی خاطر میری دل آزاری کا دوسرا گناہ کر رہے ہو"!

ریمنڈ جیسے ہوش میں آگیا۔ خوش اخلاقی سے پوچھا۔ تم دونوں کب جا رہے ہو اور اس سلسلے میں تم دونوں کی خدمت کر سکتا ہوں"؟

خانہ بدوش نے جواب دیا "تم حور سے چل کے آخری ملاقات کر لو، بس یہی سب سے بڑی خدمت ہے جو تم کر سکتے ہو"!

ریمنڈ نے کہا "چلو میں ابھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ"!

خانہ بدوش اسے ساتھ لے کر واپس چل دیا۔

پادری عین موقع پر ٹل گیا، ریمنڈ نے بے مثال ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے جبراً ہنس ہنس کے حور سے باتیں کیں لیکن حور کے لئے یہ کیفیت ناقابل برداشت تھی، اس موقع پر خانہ بدوش مسخرے نے بھی بڑی فراخدلی دکھائی۔ وہ ان دونوں کے سامنے سے ہٹ گیا اور جاتے جاتے کہتا گیا "ریمنڈ! میں جانتا ہوں کہ تم پادری بننے جا رہے ہو۔ اس لئے حور کے معاملے میں، میں تم پر پوری طرح اعتبار کر سکتا ہوں"! اسی طرح حور سے کہا "اور حور تم، مجھے معلوم ہے کہ تم مسلمان ماں باپ کی بیٹی ہو اس لئے تم بھی اپنی حد سے تجاوز نہیں کرو گی، میں تم دونوں کو یہ تنہائی کا موقع اس لئے دے رہا ہوں کہ ان آخری لمحوں میں تم دونوں اپنے دلوں کی بھڑاس نکال لو"

ان قیود اور پابندیوں میں وہ دونوں آخر کس قسم کی باتیں کر سکتے تھے۔ ریمنڈ کو اپنے منصب کا احساس تھا اور حور کو اپنے مذہب کا پاس۔ حور نے کہا "میں تمہاری مہربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھوں گی"!

ریمنڈ نے جواب میں کہا "میں بھی تمہاری بھولی بھالی باتوں کو ایک عرصہ تک نہیں بھلا سکوں گا"!

دونوں ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے، حور نے آنچل سے آنکھیں خشک کر لیں اور ریمنڈ چپ چاپ اٹھ کے باہر خانہ بدوش کے پاس چلا گیا۔ بولا "خانہ بدوش دوست! اب تم جا سکتے ہو"!

خانہ بدوش نے حیرت سے کہا "ارے اتنی جلدی! تم دونوں نے تو شاید ایک بات بھی نہیں کی، کیوں کیا

حساب نہیں۔" پھر گویا اس نے شکاری نظروں سے پورے مجمع کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ بہت بشاش اور خوش نظر آ رہا تھا۔ قط بوغا سے کہنے لگا۔

"جناب والا! تم لوگ تو مجھے بہت دلچسپ نظر آتے ہو۔ تم لوگوں نے میری آمد کی خوشی میں کتنے شاندار جشن کا اہتمام کیا ہے۔ میں اس کو کبھی نہ بھولوں گا۔" پھر پادری سے سوال کیا "اور جناب آپ اس شخص میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟"

قط بوغا نے کہا "مسلمان میری چڑھیں۔ منگولیا کے مرنے والے خاقان نے ہمیں حکم دیا تھا کہ بغداد اور مصر کو خاک میں ملا دیا جائے چنانچہ مرنے والے خاقان کی آرزو کو میں ہر قیمت پر پوری کر دوں گا۔"

پادری نے جواب دیا "اس مسلمان کی بیٹی حور میرے پاس رہ رہی ہے اور میں اس کے مرنے سے پہلے اس کی بیٹی کے بارے میں اس کی خواہش معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

خانہ بدوش ایک دم اچھل پڑا۔ بولا "وہ جناب واہ! جس لڑکی کی مجھے تلاش تھی گویا وہ تمہارے گھر میں موجود ہے۔"

پھر قط بوغا سے کہا "منگول سردار! مجھے ایک نجومی نے بتایا تھا کہ تم ایک ایسی لڑکی سے شادی کرو گے جو کسی مسلمان کی بیٹی ہو گی اور اس کی پہچان یہ ہو گی کہ وہ جب ملے گی اس سے پہلے لڑکی کا باپ تمہارے سامنے مارا جائے گا۔"

قط بوغا نے کہا "اگر میں اس شخص کو معاف کر دوں تو؟"

خانہ بدوش نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ "پھر مجبوراً مجھے خود زحمت کرنا پڑے گی۔"

قط بوغا کو ہنسی آ گئی بولا "میرے بھوکے بھیڑیے کی کھال میرے حوالے کر دے تو آدمی لالچی دکھائی دیتا ہے۔"

خانہ بدوش نے کھال قط بوغا کو واپس کر دی اور بولا "گستاخی معاف۔ اس کھال کی واپسی سے میں ایک گدھے کے بوجھ سے نجات پا گیا ہوں۔"

اس بات سے پادری کو بھی ہنسی آ گئی، بولا "مسخرے اپنی زبان قابو میں رکھ، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تجھے ہلاکت کی راہ پر ڈال دے، کیونکہ زبان ہی زحمت ہے۔ زبان ہی رحمت ہے۔"

قط بوغا نے خانہ بدوش کی باتوں سے اکتا کر کہا "تیری باتوں میں ہم سب کا وقت ضائع ہو رہا ہے اب تو اس وقت تک خاموش رہ جب تک میں خود بولنے کا حکم نہ دوں۔"

خانہ بدوش نے ایک کپڑے سے اپنے منہ کو باندھتے ہوئے کہا "جب تک یہ کھلا رہے گا میں بولتا رہوں گا، اس لئے اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ میں اسے قید کر دوں، نہ آزاد ہو گا نہ بولے گا۔"

اس کے بعد اس نے اپنے منہ کو جکڑ لیا۔ تماشائی اس کی حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

قط بوغا نے ایک بار پھر حور کے باپ کو مخاطب کیا "ہاں تو تم بھوکے ہو! میں نے اپنا خنجر تمہارے حوالے کر دیا ہے۔

تم اپنے ساتھیوں کے گوشت سے اپنا پیٹ کیوں نہیں بھرتے؟"

حور کے باپ نے گردن جھکالی اس کی حالت بڑی کربناک تھی۔

قط بوغا نے اشارے سے دو منگولوں کو اپنے قریب بلایا اور انہیں حکم دیا۔ "اس بھوکے کو اپنے ہی گوشت سے سیراب کر دیا جائے۔"

دونوں منگولوں نے حور کے باپ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کی رانوں کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر اس کے منہ میں بھر دیں، قط بوغا نے وحشت ناک ہنسی ہنستے ہوئے حور کے باپ سے کہا "کھا، خوب اچھی طرح کھا، تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔"

حور کا باپ چیخیں مار رہا تھا اور دونوں منگول اس کی بوٹیاں اتارنے میں مشغول تھے یہاں تک کہ بوٹیوں کی کثرت نے اس کی آواز بند کر دی۔ قط بوغا نے ایک بار پھر حکم دیا۔ "اس کے ناک کان کاٹ کر اس کے منہ میں زبردستی ٹھونس دو۔"

حکم پر فوراً ہی عمل درآمد ہوا، تماشائی خوشی میں تالیاں بجا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد حور کے باپ نے دم توڑ دیا اور اس پر منگول چیلوں کووں کی طرح پل پڑے۔ قط بوغا اسی طرح ایک کو دوسرے کے ذریعے ہلاک کراتا رہا۔ جب سارے ہی مسلمان قتل کیے جا چکے تو کسی منگول نے خوشی میں نعرہ لگایا "خاقان کی خواہش پوری ہو کے رہے گی مصر برباد کر دیا جائے گا۔ قاہرہ کی جامع مسجد میں ہم اپنے گھوڑے اور خچر باندھیں گے۔"

"خدا تمہیں مبارک کرے، منگول سردار، میری تو بس ایک ہی خواہش ہے وہ یہ ہے کہ مرنے والے کی بیٹی مجھے دلا دی جائے۔ منگول سردار تم یقین کرو، میں اس کا نادیدہ عاشق ہوں۔ تم پادری سے کم از کم اتنی اجازت تو دلا ہی دو کہ اگر میں اس یتیم لڑکی سے ملنا چاہوں تو پادری مجھے روکے نہیں۔"

ریمنڈ کو اس پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ "بس چپ رہ" اس نے خانہ بدوش کو ڈانٹا "دو خبردار جو اب تو نے اس لڑکی کا ذکر کیا۔ کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں کہ مرنے والے نے اپنی بیٹی کے لیے کیا وصیت کی ہے؟"

خانہ بدوش کو باتیں کرتا دیکھ کر قط بوغا نے شرارتاً کہا۔ "ارے تو نے اپنا منہ پھر کھول لیا اور میری اجازت کے بغیر پھر باتیں شروع کر دیں۔"

خانہ بدوش نے جواب دیا۔ "جناب لفظوں میں بڑا زور ہوتا ہے، ان کے آگے یہ کپڑے کا بند حیثیت ہی کیا رکھتا ہے۔ پیٹ میں کوئی بات آئی تو یہ منہ اس کی منہ زوری کے آگے بے بس ہو کے رہ جاتا ہے اور میں پٹا پٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔"

"قط بوغا نے کہا۔" میرے حکم پر عمل کرو ورنہ جانتا ہے کہ میں اس کے بعد کیا کروں گا۔"

خانہ بدوش اپنے منہ پر کپڑا اور چڑھانے لگا۔ بولا "اگر تم کہتے ہو تو میں اپنا منہ بند کیے لیتا ہوں، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ آدمی کتنا ہی سڑا گلا کیوں نہ ہو جب اس کے درمیان کوئی لڑکی آجاتی ہے تو یہ اپنی جان کی بالکل پروا نہیں کرتا اور پھر اپنے دل ہی کے حکم پر چلتا ہے۔" خانہ بدوش نے پھر وہی درخواست پیش کردی "منگول سردار اگر تم نے یہ لڑکی مجھے دلوائی تو یہ سمجھ لو کہ میں کنوارہ رہ جاؤں گا۔"

قطبو غانے عاجز آکر کہا "اچھا تو اپنی زبان تو بند رکھ، بعد میں دیکھا جائے گا۔"

خانہ بدوش نے معصومیت سے کہا "کس کو بعد میں دیکھا جائے گا، مجھے یا اس لڑکی کو؟"

قطبو غانے درشت لہجے میں کہا "چپ بھی رہ۔"

خانہ بدوش نے کپڑے کی لگام منہ میں ڈال لی اور اس لگام پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور بڑی مضبوطی سے منہ کو جکڑ لیا۔ اس کی اس حرکت پر سبھی ہنس پڑے یہاں تک کہ قطبو غا بھی مسکرایا۔

قطبو غا خانہ بدوش پر ضرورت سے زیادہ مہربان تھا۔ اس نے پادری کو حکم دیا کہ حور خانہ بدوش کے حوالے کردی جائے۔

پادری نے کہا "منگول سردار! ذرا اس حکم پر خالص ایمانداری سے غور فرمائیں۔ جب حور کے باپ نے یہ اجازت دے دی ہے کہ اس کی بیٹی ریمنڈ کے حوالے کردی جائے تب پھر کسی اور کو یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ اس میں ترمیم کرے۔"

قطبو غانے کہا "مسلمان مفتوح ہیں۔ اور ان کی ہر چیز پر فاتحین کا قبضہ ہو چکا ہے ہم ہی حور کے حقیقی مالک اور مختار ہیں اور ہمیں یہ بات بالکل ناپسند ہے کہ کوئی شخص ہمارے حکم سے سرتابی کرے!"

پادری خوف زدہ ہو گیا۔ خانہ بدوش نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کنپٹی کھجانے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے پادری سے پوچھا "مسیحوں کے مقدس باپ تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

پادری نے ناگواری سے جواب دیا "تین۔ دو لڑکے ایک لڑکی!"

خانہ بدوش نے افسوس سے کہا "اور میرا ایک بچہ بھی نہیں، کیونکہ میری ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔ اب خدا نے اس کا موقع دیا ہے تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں محروم رہ جاؤں۔ نہیں جناب ایسا نہیں ہو سکتا۔ چپ چاپ وہ لڑکی میرے حوالے کردو۔"

پادری نے مجبوری سے کہا "میرے ساتھ آؤ تاکہ میں منگول سردار کے حکم کی تعمیل کردوں!"

قطبو غانے کہا "خانہ بدوش دوست! تم اس وقت اس عیار کے ساتھ چلے جاؤ اور اس لڑکی پر قبضہ کرلو!"

پادری خانہ بدوش کو اپنے گھر لے گیا۔ حور اس وقت ریمنڈ سے باتیں کر رہی تھی، ریمنڈ باتیں تو حور سے کر رہا تھا لیکن تصور حور کے باپ کے قتل کی طرف تھا اور وہ دیر سے اس الجھن کا شکار تھا کہ اس سانحے کے بارے میں وہ حور کو کچھ

بتائیے یا نہ بتائیے۔

پادری نے اندر پہنچتے ہی ریمنڈ سے کہا "میرے بچے۔ تم حور کے پاس سے ہٹ جاؤ۔ کیونکہ منگول سردار نے اس لڑکی کو اس خانہ بدوش کے حوالے کر دیا ہے۔"

حور نے اس بات کو نہایت فکر و تشویش سے سُنا۔ اس نے خانہ بدوش کی طرف نفرت اور وحشت سے دیکھا ایک مسرخ سفید اور نیلی آنکھ والا ادھیڑ عمر شخص اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی ایک ہی آنکھ تھی اور دوسری آنکھ پر زخم کا نشان پایا جاتا تھا۔

ریمنڈ نے غصّے سے خانہ بدوش کی طرف دیکھا اور پادری سے کہا "کیا اب یہ منگول ہم مسیحیوں پر بھی حکم چلانے لگے ہیں؟"

"ہاں" پادری نے جواب دیا "جب تک ہلاکو خان یہاں موجود تھا اس کی عیسائی بیوی دوقوز خاتون کی وجہ سے کسی منگول کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ ہم پر حکم چلائے۔ لیکن اب تو وہ یہاں سے جا چکا ہے اور ہمیں اپنے سردار قط بوغا کے حوالے کر دیا ہے جو سخت وحشی اور غیر مہذب انسان ہے!"

خانہ بدوش نے ہنستے ہوئے کہا "تو یہ ہیں تمہارے وہ خیالات جو تم اپنے دل میں منگول سردار کے لیئے رکھتے ہو۔ میں تمہارے ان خیالات کو قط بوغا تک آج ہی پہنچا دوں گا۔"

پادری گھبرا گیا۔ بولا "نہیں میرے خانہ بدوش دوست! میں نے کوئی ایسی بات تو کہی نہیں کہ تم لوگ قط بوغا کو جا کے لگا دو۔ رہا حور کا معاملہ تو میں اسے اسی وقت تمہارے حوالے کیئے دیتا ہوں"

حور نے سختی سے کہا "میں اس وحشی کے ساتھ کبھی بھی نہ جاؤں گی۔ منگول سردار میرے بارے میں حکم دینے والا کون ہوتا ہے، اس سے کہہ دو کہ حور تیرا حکم نہیں مانتی۔"

پادری نے خوشامدانہ روش اختیار کی کہا "حور! ہم میں سے کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں ہے کہ منگول سردار کی حکم عدولی کرے۔ ہم سب کی اسی میں بہتری ہے کہ اس حکم کو بے چون و چرا مان لیں۔"

ریمنڈ الگ کڑھ رہا تھا۔ جھنجھلا کر بولا "کیا ظلم ہے کہ حور کو چاہے یہ حکم منظور ہو یا نا منظور ہو لیکن اس کی پابندی کرنے پر خواہ مخواہ مجبور کی جا رہی ہے۔"

حور نے کہا "میں اس گھر کو اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتی جب تک میرے والدین اور بھائی وقیع واپس نہیں آ جاتے۔"

خانہ بدوش زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی پر سبھی چونک پڑے۔ پادری نے پوچھا "تم بلا وجہ کیوں ہنس رہے ہو؟"

خانہ بدوش نے جواب دیا "اس بات پر کہ یہ لڑکی اس وقت تک گھر نہیں چھوڑے گی جب تک کہ اس کے بھائی اور والدین واپس نہ آ جائیں۔ گویا یہ قیامت تک اسی طرح اس گھر میں بیٹھی رہے گی۔ کیونکہ قیامت سے پہلے تو یہ لوگ

اس لڑکی سے ملنے سے رہے۔"

حور نے چونک کے پوچھا "کیا مطلب؟ کیا میرے والدین اس دنیا میں موجود نہیں ہیں؟ کیا میرے بھائی کو قتل کیا جا چکا ہے؟"

خانہ بدوش نے جواب دیا "یہ لوگ تم سے یہ خبر چھپاتے ہیں کیونکہ انہیں بھی یہ باتیں معلوم ہیں۔ لیکن میں نہیں چھپانا چاہتا۔ حور تم یقین کرلو کہ اب ہیں ان میں سے ایک بھی اس دنیا میں موجود نہیں۔ وہ سب قتل کیے جا چکے۔ نہ صرف قتل کیے جا چکے بلکہ ان کے ساتھ ہی یروشلم کے بہت سارے مسلمان بھی مار دیئے گئے۔"

حور کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بلک بلک کے رونے لگی۔ اس نے اپنے بال نوچ ڈالے کپڑے پھاڑ دیئے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا۔

ریمنڈ نے حور کو روتا دیکھ کے خانہ بدوش کو علیحدہ بلایا اور خوشامدانہ لہجے میں کہا "کیا تم اس معصوم لڑکی کو آرام سے رکھ سکو گے؟"

خانہ بدوش نے بے مروتی سے جواب دیا "کیوں؟ تم نے مجھ میں وہ کون سی خامی دیکھی ہے جس سے تم یہ شبہ کر رہے ہو کہ میں اس بے وقوف لڑکی کو آرام سے نہیں رکھ سکوں گا!"

ریمنڈ نے کہا "تم ایک خانہ بدوش ہو اور حور حضری زندگی کی عادی ہے کیا تم دونوں کے مزاج اور فطرت کا یہ فرق آئندہ اختلاف پیدا نہیں کردے گا؟"

خانہ بدوش ایک دم گرم ہوگیا زور زور سے بولنے لگا "او عاشق نامراد خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے عقل کی باتیں سمجھائے گا؟ میں تجھ سے زیادہ عقلمند ہوں اور اس لڑکی سے میں کسی طرح بھی دست بردار ہونے کو تیار نہیں!"

ان کی تیز تیز باتیں سن کے پادری بھی وہیں پہنچ گیا۔ ریمنڈ سے کہنے لگا "ریمنڈ! تم اس جنگلی سے خواہ مخواہ مت اُلجھو یہ ایک ضدی اور اڑیل انسان ہے تم اسے سمجھانے کی کوشش کرو گے یہ اس کا اُلٹا مطلب لے گا!"

خانہ بدوش پادری کے سر ہوگیا، تیوریوں پر بل ڈال کے کہنے لگا "ناصریوں کے مقدس باپ! تو اپنے تقدس کو میری دریدہ دہنی سے محفوظ رکھ میں واقعی الٹی کھوپڑی رکھتا ہوں۔ کیا تم دونوں ہی اس بھولی بھالی لڑکی پر عاشق ہوگئے ہو؟ چپ چاپ اسے میرے حوالے کردو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

پادری نے غصے میں کہا "تو اس لڑکی کو یہاں سے اسی وقت لے کر رخصت ہو جا۔ اب میں اسے ایک لمحے بھی اپنے ساتھ نہ رکھوں گا!"

خانہ بدوش نے جواب دیا لیکن اسے ایک لمحے میں تو لے جانے سے رہا ابھی تو وہ تمہارے ہی گھر میں رہے گی میں ٹھہرا ایک خانہ بدوش انسان۔ ذرا گھر بار کا انتظام کرلوں تو لے جاؤں، جب تک رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا میں اس لڑکی کو تمہارے ہی گھر میں رکھوں گا اگر تم اسے خوشی سے نہ رکھو گے۔ تو میں اسے جبراً رکھوں گا میں کسی سے ڈرتا

تھوڑی ہوں۔"

رینڈ نے پوچھا "کیا تم مسلمان ہو؟"

خانہ بدوش نے جواب دیا "میں مسلمان نہیں ہوں لیکن تمہارا اس سوال سے کیا مطلب ہے؟"

رینڈ نے کہا "حور مسلمان ہے اس لیے وہ ایک غیر مسلم کے پاس خوش نہیں رہے گی۔"

خانہ بدوش نے ڈپٹ کے کہا۔ "اور تو خود کب مسلمان ہے۔ تیرے ساتھ وہ کس طرح خوش رہے گی؟"

پادری نے رینڈ کو ڈانٹا "رینڈ! تم اس جاہل اور اَن پڑھ انسان سے خواہ مخواہ بحث مت کرو کیونکہ اس کے لٹھ جیسے جوابات کا تمہارے پاس کوئی جواب نہیں!"

خانہ بدوش نے دونوں کو کچھ عجیب سی اجنبی اجنبی نظروں سے دیکھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان دونوں کی باتوں کا اصل مطلب نہیں سمجھ پا رہا ہے اس نے اکتا کے کہا "ناصریوں کے مقدس باپ! میں چند دن تمہارے ہی گھر میں رہنا پاہتا ہوں کیونکہ میرے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔" یہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارے گھر میں ہفتے عشرے سے زیادہ نہیں رہوں گا۔

پادری نڈھال ہو گیا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ عجیب بلائے بے درماں اس کے پیچھے لگ گئی ہے، پادری نے کہا۔ "بھائی! میں تم سے نہیں جیت سکوں گا، تم جو چاہو کر لیکن میرا بھیجا نہ کھاؤ!"

خانہ بدوش نے پادری کا شکریہ ادا کیا اور کہا "ناصریوں کے مقدس باپ! شاید میں کبھی تمہارے کام آ سکوں گو ایسی بات کہنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے لیکن یہ میرے حقیقی محاورات ہیں اور میں ان کے اظہار پر مجبور ہو گیا ہوں؟"

پادری خانہ بدوش کو حور کے پاس دوبارہ لئے چلا گیا۔ حور غلطی سے ابھی تک یہی سمجھے بیٹھی تھی کہ یہ خانہ بدوش بھی شاید منگول ہے اس نے خانہ بدوش کو دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیا۔ پادری نے حور سے کہا "حور بیٹی! تو اس خانہ بدوش کو سلام کیوں نہیں کرتی؟ منگول سردار قطلوغا نے تجھے اس شخص کے حوالے کر دیا ہے۔"

حور پھر چھلک پڑی، بولی "یہ منگول مجھے بھی کیوں نہیں قتل کر دیتے؟"

خانہ بدوش نے تیسی نکال دی بے ہنگم سنسی ہنستا ہوا بولا "مت گھبراؤ لڑکی مت گھبراؤ۔ میں اندر سے بہت اچھا آدمی ہوں، میں تمہیں اتنا خوش رکھوں گا کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گی!"

حور اپنے ماں باپ اور بھائی کے غم میں آنسو بہائے چلی جا رہی تھی اس نے پادری کو سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ پادری وہاں سے چلا گیا۔ وہ رینڈ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ خانہ بدوش حور کے بالکل مقابل جا بیٹھا۔ غم کے آنسوؤں میں تر بتر سُرخ و سفید رخساروں پر آنسو یوں ڈھلکے ہوئے تھے جیسے انگاروں پر شبنمیں قطرات۔ خانہ بدوش نے افسوس سے کہا "حور! تو واقعی بڑی دکھی ہے لیکن میں یا کوئی دوسرا انسان اس سلسلے

میں کر ہی کیا سکتا ہے سوائے اس کے کہ میٹھی میٹھی پیاری پیاری باتیں کر کے تجھے دھوکے میں ڈال دے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں تجھے دھوکا نہیں دے سکتا!"

پھر اس نے حور سے رازدارانہ دریافت کیا "کیا ریمنڈ تجھے پسند ہے؟"

حور نے جواب دیا "وہ مجھے اتنا زیادہ پسند بھی نہیں لیکن وہ بہت سے دوسرے نوجوانوں کے مقابلے میں شریف اور ایماندار ضرور ہے"۔ خانہ بدوش کی باچھیں کھِل گئیں، پاگلوں کی طرح ہنس ہنس کے پوچھا "اور میں تجھے کیسا لگتا ہوں؟"

حور اس کا کیا جواب دیتی، شرما کے سر جھکا لیا۔ خانہ بدوش نے اظہارِ عشق شروع کر دیا۔ بولا "میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، شہروں شہروں کی سیر کراؤں گا میرے ساتھ رہ کر تو اس شہری اور حضری زندگی کو ایک دم بھلا دے گی!"

حور نے جواب دیا "میں تمہارے ساتھ خوشی سے ہرگز نہ جاؤں گی ہاں زبردستی کی اور بات ہے!"

خانہ بدوش ناراض ہو گیا۔ بولا "ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، جتنی عمر ہے اتنی ہی عقل بھی ہو گی، اگر تیری جگہ یہی بات کوئی زیادہ عمر والی عورت کرتی تو میں اس کے منہ پہ ایک ایسا الٹا ہاتھ رسید کرتا کہ سب نہیں تو کم از کم دو دانت تو جھڑ ہی جاتے!"

حور نے ایک بار پھر سکوت اختیار کر لیا۔ خانہ بدوش نے اس کے کالے کالے بالوں اور پیارے پیارے خد و خال کی تعریفیں شروع کر دیں شاعرانہ تعریفیں۔ بولا "خیریت تو یہ ہوئی کہ ابھی تک تجھے قسطِ بوغا نے نہیں دیکھا ورنہ وہ تجھے اپنے خیمے میں ڈال لیتا۔ پھر ہنس ہنس کے اپنی داد طلب کرنے لگا، بولا "لڑکی! اس بات پر تو مجھے داد دے کہ میں تجھے کتنی خوبصورتی سے لے اڑا۔ بس چند دن کی بات ہے اس کے بعد تو یروشلم میں نہیں کہیں اور ہو گی، کسی ایک شہر میں نہیں مختلف شہروں میں۔ میں ہوں گا تو ہو گی تیرا جمال دل نشین ہو گا میری ناز برداریاں ہوں گی تیری ادائے دلبری ہو گی میری وفاداریاں ہوں گی"۔

حور کو اس کی باتیں بڑی اچھی لگیں۔ اس نے سوچا آدمی کچھ بھی ہو لیکن دلچسپ اور سمجھ دار ضرور ہے۔

ریمنڈ کی نظروں میں دُنیا تاریک ہو چکی تھی، حور اس کے سامنے اس سے چھن چکی تھی۔ پادری اس بات پر مجبور تھا کہ خانہ بدوش اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ہی گھر میں رکھتا۔ ریمنڈ کو جب اچھی طرح یقین ہو گیا کہ اب حور اسے نہیں ملے گی تو اس نے پادری کے گھر میں آنا جانا بھی موقوف کر دیا۔ حور بے خیالی اور غیر شعوری حالت میں اس کا انتظار کرتی رہتی۔ ادھر خانہ بدوش کا عجیب حال تھا، وہ صبح ہی صبح قسطِ بوغا کے پاس چلا جاتا اور اپنا زیادہ وقت قسطِ بوغا کی خدمت میں صرف کر دیتا اور جب وہاں سے واپس گھر پہنچتا تو ہنسی ہنسی میں حور سے پوچھتا "ارے وہ لنگور تو نہیں آیا تھا؟ کیا نام ہے اس کا، شاید ریمنڈ"۔ "ہاں ریمنڈ، آج کل وہ واقعی بہت اداس اور مایوس ہے اور یہاں کا آنا جانا بھی ترک کر دیا ہے!"

خانہ بدوش نے پوچھا "یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کونسی بات ہے جس نے ریمنڈ کی آمد و رفت بند کرادی!"

حور نے رک رک کر شرمائے شرمائے لہجے میں کہا "جب سے ریمنڈ کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ میں اس کی نہیں ہوں وہ آہستہ آہستہ مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگا اور اس نے اب بالکل ہی آمد و رفت ترک کر دی!"

خانہ بدوش نے فراخدلی سے کہا "میں ریمنڈ کی آمد و رفت کو برا نہیں سمجھتا، وہ آئے اور شوق سے آئے، اس نے ابھی مجھے سمجھا ہی کہاں ہے" پھر حور کو حکم دیا "اب تو کسی طرح بھی ریمنڈ کو بلا کے سمجھا بجھا دے اور اسے یہ یقین دلا دے کہ اس گھر میں اس کی آمد و رفت بند نہیں کی گئی۔ تو ریمنڈ سے میری جانب سے صاف صاف بتا دے کہ وہ جس طرح ماضی میں اس کے گھر کے چکر لگایا کرتا تھا اب بھی اسی طرح آتا جاتا رہے!"

حور نے بے دلی سے جواب دیا "لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ اس پر آمادہ نہیں ہوگا!"

"اچھا" وہ کچھ سوچتا ہوا بولا "تب پھر میں خود اس سے بات کروں گا!"

سہ پہر کا وقت تھا، آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے اور آبی پرندے سمندر کے ساحل کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ خانہ بدوش قط بوغا کی مصاحبت میں دلچسپ باتیں کر کے واپس آ رہا تھا۔ اس نے آتے آتے اچانک گھر کے بجائے گرجے کا رخ کر دیا۔ وہ گرجے میں چلا گیا۔ وہاں ریمنڈ ایک کونے میں گم سم بیٹھا شاید آنسو بہا رہا تھا۔ خانہ بدوش کہیں رکے بغیر سیدھا اس کے سر پر پہنچ گیا، ریمنڈ نے اپنے سر پر آیا ہوا دیکھ کر گھبرا گیا۔ چالاک خانہ بدوش نے اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر لیا۔ بولا "گھبراتے نہیں بزدل نوجوان کیا تو مجھ جیسے لاابالی اور بے ضرر انسان سے بھی ڈرتا یا گھبراتا ہے؟"

ریمنڈ نے کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل جانا چاہا، لیکن خانہ بدوش اس کی راہ میں حائل ہو گیا، بولا "کہاں چلے؟ میں خاص طور پر تیرے پاس آیا ہوں اور تجھ سے چند خاص باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

ریمنڈ رک گیا۔ خانہ بدوش نے فوراً ہی سوال کر دیا "تو نے حور سے ملنا جلنا کیوں کم کر دیا؟"

ریمنڈ سمجھا مسخرا خانہ بدوش اس سے کوئی زبردست مذاق کر رہا ہے کوئی جواب دینے کے بجائے اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ اس نے پھر سوال کیا "تو جواب کیوں نہیں دیتا۔ تو نے حور سے ملنا جلنا کیوں ترک کر دیا؟"

ریمنڈ نے جواب دیا "سنگدل منگولوں میں رہنے سہنے سے تمہارا دل بھی پتھر کا ہو گیا ہے شاید کہیں تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

خانہ بدوش گرم ہو گیا "میں تجھ سے کیوں مذاق کروں گا۔ میں نے تو تجھ سے ایک بات پوچھی اور اب بھی میں تجھے اس بات کی اجازت دے رہا ہوں کہ تو اس بے وقوف اور سیدھی سادی لڑکی کے پاس آتا جاتا رہ، وہ بیوہ لوح کچھ ضرورت سے زیادہ ہے اور شاید میرے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں ہے۔ مجھے اس پر رحم سا آ جاتا ہے، میں

نہیں چاہتا کہ وہ میری وجہ سے دکھ جھیلے، وہ تم سے خوش رہتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی یہ خوشیاں اسے ملتی ہی رہیں!"

رینڈ نے غور سے خانہ بدوش کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا "کیا یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو سچ ہے، حقیقت ہے؟"

خانہ بدوش نے منہ ترچھا کر لیا۔ بولا "آخر میں کیوں جھوٹ بولوں گا؟"

رینڈ کو ذرا امید بندھی، بولا "میں نے تو پہلے ہی تمہیں یہ بتایا تھا کہ حور تم سے خوش نہیں رہے گی اور تمہیں اسے اپنانے سے درگزر کرنا چاہیئے!"

واہ جناب! خانہ بدوش نے طنز کیا "میں نے تو انسانیت برتی اور صاحبزادے اس سے دوبارہ عشق لڑانے کے لئے پر تولنے لگے" پھر ذرا تیزی سے کہا "میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتا کہ کوئی شخص بھی میری ہونے والی بیوی سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے۔"

رینڈ نے پوچھا "کیا میں حور کے آس پاس گھومتا پھرتا رہوں یا پھر کسی جگہ....."

بات سمجھنے کی کوشش کرو صاحبزادے!" خانہ بدوش نے کہا "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس لڑکی سے گاہے گاہے ملتے رہو، تاکہ وہ پیش آنے والی مفارقت کا زیادہ اثر نہ قبول کرے۔"

رینڈ ہچکچایا، وہ بلاوجہ آلۂ کار بننے پر آمادہ نہ تھا لیکن صاف صاف انکار بھی نہ کر سکتا تھا، خانہ بدوش کو ٹالنے کے لئے جواب دیا۔ "بہت بہتر۔ اگر تم اس میں خوش ہو تو میں تمہیں خوش کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

خانہ بدوش خوشی میں کھڑا ہو گیا بولا "تم بہت اچھے نوجوان ہو، شاید حور کو تم مجھ سے زیادہ خوش رکھ سکتے تھے لیکن میں ایک عمر رسیدہ انسان، اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا، لیکن حور کو خوش رکھنے کی کوشش ضرور کروں گا!"

خانہ بدوش رینڈ کو گرجے ہی میں چھوڑ کے کہیں چلا گیا۔ رینڈ گرجے سے نکلا اور آہستہ آہستہ چل کے حور کے پاس پہنچ گیا بولا "حور! تمہارا یہ خانہ بدوش کچھ عجیب آدمی ہے، بے وقوف، احمق سا۔" پھر تاسف آمیز ہنسی ہنستا ہوا بولا "آج مجھے ہدایت کی ہے کہ میں تم سے ملنا جلنا نہ ترک کروں کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اگر میں ایک دم ترک تعلق کر بیٹھوں گا تو تمہیں غیر معمولی صدمہ اٹھانا پڑے گا لیکن وقتاً فوقتاً ملتے رہنے سے یہ غم کسی حد تک قابلِ برداشت ہو جائے گا۔"

اس وقت حور نے اپنے سر میں دوپٹے جیسا کپڑا، قدرے پگڑی کے انداز میں باندھ رکھا تھا اور جسم پر ریشمی قبا چپکی ہوئی تھی آنکھیں موٹی موٹی سی تھیں۔ اس نے مایوسی سے رینڈ کو دیکھا اور اٹھ کر ایک طرف جاتی ہوئی بولی "اس وقت مجھے ایک ایسے بہادر اور مخلص نوجوان کی ضرورت ہے جو مجھے اس احمق اور غیر مہذب خانہ بدوش سے نجات دلا سکے!"

ریمنڈ نے افسوس سے کہا "حورہ! افسوس کہ میں فن سپاہ گری سے واقف نہیں ہوں۔ میں پادری بننا چاہتا ہوں اور اسی لئے میں نے تعلیم و تربیت بھی ویسی ہی حاصل کی ہے، کیا ایسا ممکن ہے کہ میں اس خانہ بدوش کو عدم تشدد کے اخلاقی حربے سے زیر کرنے کی کوشش کروں"؟

"وہ کس طرح"؟ حورہ نے تعجب سے پوچھا وہ کمرے میں جاتے جاتے رک گئی تھی۔

ریمنڈ نے کہا "حضرت مسیح کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی تمہارے داہنے گال پر طمانچہ لگائے تو تم اس کی طرف اپنا دوسرا گال بھی بڑھاؤ" جس کا لازمی اور اخلاقی یہ نتیجہ برآمد ہونا چاہیئے کہ طمانچہ مارنے والا شرمندہ ہو کے دوسرے طمانچے سے باز رہے"!

حورہ نے جواب دیا "عدم تشدد کا فلسفہ اپنی سمجھ میں نہیں آتا ویسے تم آزما کے بھی دیکھ لو"!

ریمنڈ نے کہا "تم مسلمان ہو اسی لئے عدم تشدد کا فلسفہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا ویسے میں اسے آزما کے دیکھوں گا ضرور"۔

حورہ کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی "ریمنڈ! اگر تم رکنا چاہتے ہو تو بیٹھ جاؤ میرے سر میں شدید درد ہے۔ اس لئے میں کچھ دیر کمرے میں بند رہ کے آرام کرنا چاہتی ہوں"!

ریمنڈ نے جواب دیا "اچھا پھر میں بھی چلتا ہوں اور تمھاری رہائی کے منصوبوں پر غور کرتا ہوں"!

ریمنڈ چلا گیا اور حورہ نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا۔

قطبوغا کو یہ اوٹ پٹانگ مسخرا اتنا اچھا لگا کہ وہ اس کی حرکتوں سے خوب خوب لطف اندوز ہوتا۔ خانہ بدوش نے منگول لشکر کو خوب گھوم پھر کر دیکھا اور اسے یہ جنگ جو اور خونخوار لوگ بہت پسند آئے منگول اس سے ہنسی مذاق کرتے تو خانہ بدوش مسخرا بھی بے تکلف ہو جاتا۔

اب قطبوغا مصر پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے یروشلم کے آس پاس کی مسلم آبادی کو تہ تیغ کر دیا جائے اس کے بعد مصر کی طرف بڑھا جائے۔ قطبوغا نے حلب کا رُخ کیا اس نے خانہ بدوش مسخرے سے کہا۔ اگر تم پسند کرو تو حلب چلو وہاں میں تمھیں کچھ ایسے دلچسپ مناظر دکھاؤں گا کہ تم انہیں بار بار دیکھنے کی تمنا کرنے لگو گے"!

خانہ بدوش نے جواب دیا "منگول سردار! میں نرم کا آدمی ہوں رزم کا نہیں۔ خون خرابے سے میں بہت گھبراتا ہوں اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے یروشلم ہی میں رہنے دیا جائے"۔

قطبوغا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اگر تم میرے ساتھ حلب نہیں چل سکتے تو نہ چلو کوئی بات نہیں لیکن تم یروشلم میں نہیں رہو گے"!

"پھر؟" خانہ بدوش نے سوال کیا "پھر میں کہاں رہوں گا"؟

قط بوغا نے کہا "تم قاہرہ واپس جاؤ اور میرے لئے مخبری کا فریضہ انجام دو"!

خانہ بدوش ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ پوچھا "تمہارے لئے مخبری؟ کیسی مخبری؟"

قط بوغا نے کہا "میرے لئے، منگولوں کے لئے"!

خانہ بدوش نے گھبرائے لہجے میں کہا "لیکن کیا میں یہ کام کرسکوں گا؟"

قط بوغا نے جواب دیا "بالکل کرسکو گے، بس ذرا ہمت کی بات ہے"؟

خانہ بدوش نے تشویش سے کہا "اگر مملوک جرنیل بیبرس نے مجھے اس حیثیت سے پہچان لیا تو"؟

قط بوغا نے جواب دیا "وہ تمھیں نہیں پہچان سکتا۔ تم یہاں سے روتے دھوتے قاہرہ واپس پہنچو گے تم اسے ہم منگولوں کے ظلم وستم کی ایک فرضی داستان بھی سناؤ گے اس طرح تم اس کی ہمدردیاں حاصل کر لو گے اور جب کوئی شخص کسی کا ہمدرد بن جاتا ہے تو وہ مظلوم کی خامیوں پر کم ہی غور کرتا ہے"!

خانہ بدوش نے پوچھا "مجھے قاہرہ پہنچ کے کس قسم کی معلومات تم کو بھیجنا ہوں گی"؟

منگول سردار نے جواب دیا "بیبرس کے ارادے کیا ہیں؟ اس کی فوج کل کتنی تعداد ہے؟ اس میں کتنے باقاعدہ سپاہی ہیں اور کتنے تعداد بڑھانے کے لئے شامل کر لئے گئے ہیں؟ بس یہی معلومات ہمارے لئے کارآمد ہوسکتی ہے اور ہاں یہ بھی دیکھنا ہے کہ قاہرہ کے لوگوں میں خوف و دہشت کا کیا حال ہے"؟

خانہ بدوش منگول سردار سے رخصت ہو کے حور کے پاس پہنچا اور اسے ساتھ چلنے کا فیصلہ سنایا۔

پادری نے پوچھا "تم اسے کہاں لے جاؤ گے"؟

خانہ بدوش نے جواب دیا "جہنم میں"!

پادری اس جواب کی امید نہیں رکھتا تھا۔ جھنجلا کے کہا "جہنم میں کس کے پاس جاؤ گے"؟

خانہ بدوش نے ہنس کے جواب دیا "تمہارے والد مرحوم کے پاس"!

پادری کو غصہ آگیا وہ مشتعل ہو کے کھڑا ہوگیا۔ بولا "تو میری بے عزتی کر رہا ہے میرا مذاق اڑا رہا ہے میں تیری شکایت منگول سردار سے کروں گا۔ اس نے تجھے بلاوجہ سر چڑھا لیا ہے"!

خانہ بدوش نے حور کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا "غصہ تھوک دو ناصریوں کے مقدس باپ۔ شاید یہ آخری دن ہے ہنسی مذاق کا۔ اس کے بعد کہاں تم ہوگے اور کہاں یہ ہنسی مذاق ہوگا"۔

دل نہ چاہنے کے باوجود حور اس خانہ بدوش کی رفاقت پر مجبور تھی اس کے پاس تھا ہی کیا جو رخت سفر باندھتی چند کپڑے ایک چادر میں لپیٹے اور خانہ بدوش کے ساتھ ہولی۔ جانے سے پہلے وہ ایک بار ریمنڈ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس نے خانہ بدوش سے درخواست کی "اگر تم اجازت دو تو میں آخری بار ریمنڈ سے مل لوں"!

زندہ دل خانہ بدوش نے جواب دیا "میں خود بھی ریمنڈ سے ملے بغیر یہاں سے کیونکر جاسکتا ہوں، میں اسے

سے کہہ آتا ہوں" وہ اسے دیر تک ادھر ادھر تلاش کرتا رہا آخر ایک جگہ اسے پا ہی لیا۔ ریمنڈ سر جھکائے فکر مند سا ایک گلی میں داخل ہو رہا تھا کہ پیچھے سے خانہ بدوش نے اس کی گدی پکڑ لی اور کہا۔ ریمنڈ! میں تمہاری محبوبہ کو لے کر یہ شہر سے رخصت ہو رہا ہوں کیا تم اپنی حور سے آخری ملاقات نہیں کرو گے اور اسے خوش اخلاقی سے ہنسی خوشی رخصت نہیں کرو گے؟"

ریمنڈ کا چہرہ فق ہو گیا، گھبراہٹ میں فوراً ہی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بولا" تم ذلیل انسان ہو اس طرح میرے زخموں پر نمک چھڑکنا چاہتے ہو؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بھی تمہاری طرح پتھر دل انسان ہوں تم اگر حور کو لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ اسے میری موجودگی میں لے جا کے کیا تم میرے دل کو دکھا کے لذت حاصل کرنا چاہتے ہو؟"

خانہ بدوش نے اس کے سامنے شاید پہلی بار سنجیدگی اختیار کی، بولا" ریمنڈ! اب میں اتنا بے حس نہیں ہوں جتنا تم مجھے سمجھ بیٹھے ہو۔ حور تو تم سے آخری بار ملنا ہی چاہتی ہے لیکن میں خود بھی تم سے ملے بغیر یہاں سے کس طرح جا سکتا ہوں اور پھر یہ کہ اس وقت میں حور کی خواہش اور درخواست پر تمہارے پاس آیا ہوں۔"

ریمنڈ کا دل بھر آیا تھا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ بھرائی آواز میں کہنے لگا" خانہ بدوش دوست! تمہاری بے حسی اور سنگدلی میں تمہاری طرز زندگی کو بڑا دخل حاصل ہے۔ تمہارا کوئی وطن نہیں، کوئی گھر نہیں تمہاری بات ہے؟"

ریمنڈ نے کہا" اگر تم اجازت دو تو میں تم لوگوں کو کافی دور تک چھوڑنے بھی چل سکتا ہوں!"

خانہ بدوش کو اس پر رحم آ گیا۔ کہا" اگر تمہیں بھی خانہ بدوشی پسند ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہوں۔"

ریمنڈ نے جواب دیا" تم لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں، یُردن کے اس کلیسا میں چلا جاؤں گا جہاں یحییٰ نے حضرت مسیح کی آمد کی بشارت سنائی تھی اور دریا کے کنارے گناہ گاروں کو بپتسمہ دیا کرتے تھے!"

اس کے بعد خانہ بدوش نے کوئی بات نہیں کی اور حور کے ساتھ صحرائے سینائی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریمنڈ نے اپنی پیش کش کے مطابق اس مختصر سے قافلے کو سات کوس تک پہنچا کے واپسی اختیار کی۔ حور کو ایک محمل میں بٹھا دیا گیا تھا۔ اس نے واپس ہوتے ہوئے ریمنڈ کو محمل کے پردے سے جھانک کر دیکھا اور جب تک وہ نظر آتا رہا وہ اسے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ ریمنڈ نقطۂ موہوم سے موہوم بن گیا۔ وہ محمل میں اندھیرے منہ کر گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

x x x

قطلوغا پورے فلسطین کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنا خونخوار لشکر لے کر عدلیسہ حران، نصیبین اور حلب پر یکے بعد دیگرے ٹوٹ پڑا اور اپنے پیچھے انسانی خون کے دریا اور راکھ کے ڈھیر لگاتا

گزر گیا۔ اس نے اپنے پیچھے یروشلم میں چھوڑے ہوئے فوجی دستے کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ خانہ بدوش کی بھیجی ہوئی خبروں کو فوراً اس کے پاس روانہ کر دیا جائے۔ قط بوغا کو مغربی ساحلی علاقوں میں جگہ جگہ مصر کے مملوکوں کی چوکیاں دکھائی دیں۔ اس نے ان چوکیوں پر اس لئے حملہ نہیں کیا کہ اسے ان مملوکوں کو قاہرہ پہنچ کر سزا دینی تھی۔

دوسری طرف خانہ بدوش اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھاوے مارتا ہوا قاہرہ میں داخل ہو گیا۔ اس نے قاہرہ کے ایک ایسے محلے میں قیام کیا جہاں بغداد اور اس کے نواح کے خانماں برباد مسلمان پناہ گزیں تھے۔ اس نے ایک شاندار مکان میں حور کو اتار دیا اور اپنے دو ساتھی بھی اس کے ہمراہ رہنے دیئے۔ اس نے کہا "حور! تم برا نہ ماننا، میں ایک انتہائی اہم منصوبے پر جا رہا ہوں اور پتہ نہیں کب تک تم سے دور رہوں، مجھے منگول سردار نے اس مد میں خاصی رقم دی ہے، میں اس کا بیشتر حصہ تمہارے حوالے کئے جا رہا ہوں، تم اس سے اپنی ضرورتیں پوری کرنا اور کسی بوڑھی عورت کو اپنے ساتھ رکھ لینا، میرے دونوں ساتھی تمہاری خدمت گاری کریں گے اور میں تم سے جلد از جلد ملنے کی کوشش کروں گا۔"

حور نے آزردگی سے کہا "کیا تم اسی لئے یہاں لائے تھے؟ یہاں اجنبیوں میں لوگ مجھ سے معلوم نہیں کیسا سلوک کریں، مجھے تو یہاں ڈر لگ رہا ہے۔"

خانہ بدوش نے تسلی دیتے ہوئے کہا "اچھا اگر یہ بات ہے تو میں خود بھی تم سے وقتاً فوقتاً ملتا رہوں گا تاکہ تمہارا ڈر نکل جائے۔"

خانہ بدوش اسے چھوڑ کر غائب ہو گیا۔

مصر کا مملوک جرنیل بیبرس غیر معمولی چالاک نکلا، اس نے منگولوں کے خلاف ایک اچانک غیر معمولی اور غیر متوقع قدم اٹھا دیا ایک ایسا قدم جس کی اس عہد سراسیمگی اور حالت خوفزدگی میں کسی طرح امید بھی نہ کی جا سکتی تھی۔ قط بوغا اپنے خونخوار لشکر کے ساتھ فلسطین میں تباہ کاریاں مچا رہا تھا۔ بیبرس نے فیصلہ کر لیا کہ ان منگولوں کو قاہرہ کے دروازے پر نہیں بلکہ عین ان کے سروں پر پہنچ کے سزا دی جائے گی۔ اس نے عربوں اور غیر عربوں پر مشتمل ایک شاندار لشکر تیار کیا۔ ان میں وہ مملوک بھی شامل تھے جو جنگ جوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اور بہت سی لڑائیوں میں اپنی جرأت و شجاعت میں پورے اتر چکے تھے۔ بیبرس اپنے عزائم کو چھپائے ہوئے مصر کی طرف روانہ ہو گیا جس کے مشرقی حصوں میں منگول دندناتے پھر رہے تھے۔ جب بیبرس عکہ سے خلیج گلیلی کی طرف بڑھا، عین جالوت میں غولیات کے کنوئیں کے پاس قط بوغا خیمہ زن تھا۔ ستم ظریف بیبرس نے فلسطین کے صلیبوں سے کھانے پینے کا سامان خریدا اور منگولوں کے سر پر جا پہنچا۔ قط بوغا کو جب یہ معلوم ہوا کہ بیبرس نے اسے قاہرہ جانے کی زحمت سے بچا لیا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا، سینتیس سال سے مسلسل فتح رہنے والوں کا اس طرح بھی مقابلہ کیا جا سکتا ہے منگول سردار کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔

قطبوغانے منگولوں سے کہا۔

"جاودانی آسمان ہم پر مہربان ہے اور آسمان نے ہمارے شکار کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے عین حالت میں انہیں شکست دے کر قاہرہ کا رُخ کرو اور وہاں کی دولت اور خزانوں کو زینوں کے تھیلے میں دریائے نیل کے ساحل کی ریت کی طرح بھر لو!"

ایک دیو قامت سوار اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا منگولوں کے سامنے جا کھڑا ہوا، اس کا چہرہ اور سر خود اور فولادی کڑیوں کی نقاب میں چھپا ہوا تھا، زریں زرہ بکتر پہنے بائیں ہاتھ میں تلوار لئے اس نے قطبوغا کو للکارا "کدھر ہے وہ منگول سردار جس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہمیں مصر کے دروازوں پر شکست دے گا اور کہاں ہے تمہارا وہ آقا جس نے ہمیں یہ دھمکی آمیز خط لکھا تھا کہ ہم قاہرہ کی فصیلیں گرادیں اور منگولوں کے لئے قاہرہ کے دروازے کھول دیں ورنہ جو کچھ پیش آئے گا اسے نہیں معلوم اور کوئی نہیں جانتا کہ کیا پیش آئے گا"؟

قطبوغا حیرت زدہ سا آگے بڑھا، اس نے اپنا گھوڑا ذرا آگے بڑھایا اور اس کے مقابل پہنچ کر جواب دیا "میرے جس آقا نے تمہیں قاہرہ کی فصیلیں گرانے اور دروازے کھول دینے کا حکم دیا تھا، میں اس کا ایک تجربہ کار خادم ہوں اور سینتیس سالوں سے میں نے ایک بار بھی شکست کا منہ نہیں دیکھا، میں تم سے ملنے قاہرہ جانے والا تھا لیکن جاودانی آسمان اور تمہاری موت نے تمہیں میرے سامنے لا کھڑا کیا ہے"!

دونوں کے آگے پیچھے بے شمار فوجی لوہے میں غرق پیدل اور سوار کھڑے تھے، ان کے نیزوں کی نوکیں اوپر بلند تھیں اور خود کی چوٹی کسی مقدس عبادت گاہ کے قبے کی طرح اٹھی ہوئی تھیں، گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے میدان گونج رہا تھا، پیدل فوج کے پرے مست ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے ان کی منقش زرہ بکتر اور تلواروں کے نقشین دھوپ میں آئینے کی طرح چمک رہے تھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو تلواریں فضا میں لہرا کے سلام کیا اور گھوڑوں کی لگامیں کھینچ کر ان کا رُخ اپنی اپنی فوج کی طرف موڑا اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے اپنی اپنی فوجوں میں واپس چلے گئے۔

قطبوغانے حملے کا آغاز کیا اور اپنی فوج کے داہنے بازو سے بیبرس کے بائیں حصے پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ مصری فوج کا یہ حصہ مغلوب ہو گیا اور پیچھے ہٹنے لگا منگولوں نے انہیں آسانی سے بھاگ نکلنے کا موقع ہی نہ دیا بلکہ یورش کی رفتار اتنی وحشیانہ اور تیز کر دی کہ مصری سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ منگولوں نے ان کا پیچھا کیا، وہ برتری کے نشے میں مصریوں کے تعاقب میں لگے چلے گئے، ایک جگہ جا کے یہ شکست خوردہ فوج پلٹ پڑی اور جم کے منگولوں کا مقابلہ کرنے لگی، یہ پلٹ کے مقابلہ کرنا منگولوں کے لئے حیران کن تھا، ابھی وہ حیرت ہی کر رہے تھے کہ ان پر پیچھے سے بھی مار پڑنے لگی، منگولوں کے پیچھے بیبرس کا وہ طاقتور دستہ پہنچ چکا تھا جس میں مملوکوں کی اکثریت تھی اور یہ مملوک ترک اور تاتاری نسل سے تعلق رکھتے تھے منگولوں کے

لئے یہ دوطرفہ مار بڑی تباہ کن ثابت ہوئی اور انہیں بہت جلد اس بات کا علم ہو گیا کہ شکست خوردہ مصری فوج ایک سوچی سمجھی جنگی چال کے پیش نظر پیچھے ہٹی تھی، اس طرح وہ منگولوں کو مغالطے میں ڈال کر گھیرے میں لے لینا چاہتی تھی بیبرس کی چال کامیاب رہی اور قطبوغا حیران اور پریشان بیبرس کے حصار کو توڑ دینے کی کوشش کر رہا تھا منگولوں کے پیر اکھڑ چکے تھے کیونکہ اب ان پر کئی طرف سے مار پڑ رہی تھی۔ قطبوغا خود بھی مملوکوں کے گھیرے میں پھنس چکا تھا۔

بیبرس نے گرجدار آواز میں حکم دیا "منگول سردار کو بھاگنے نہ دیا جائے، زندہ گرفتار کیا جائے!"

قطبوغا نے اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ اپنے گرد پھیلے ہوئے مملوکوں کو ڈھکیل دینا چاہا، وہ کائی کی طرح پھٹ کے دوبارہ پھر جڑ گئے۔ مملوک آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔

بیبرس گھوڑا دوڑاتا ہوا قطبوغا کے قریب آ گیا اور اس نے ایک بار پھر تحکمانہ لہجے میں چیخ کر کہا "خبردار جو منگول سردار کو بھاگنے کی راہ دی گئی، اسے زندہ گرفتار کیا جائے!"

قطبوغا نے بھی پُرجوش لہجے میں کہا "مملوکو خبردار! میں جا رہا ہوں اگر روک سکو تو روک لو، تمہارے ہاتھوں گرفتار ہونا یا قتل ہو جانا میری بے عزتی ہے اور مجھے جادوانی آسمانی پر یقین ہے کہ وہ مجھے ذلیل نہیں کرے گا!"

"منگول سردار!" بیبرس کے ہاتھ میں ایک رسی تھی اور اس کے آخری سرے میں ایک پھندا سا بنا ہوا تھا۔ "ہوشیار ہو جا!"

قطبوغا نے ایک بار پھر مملوکوں کے حصار کو توڑ دینے کی زبردست کوشش کی، اس نے دونوں ہاتھوں سے تلواریں چلانا شروع کر دیں۔ ایک مملوک اس کے سر پر آن پہنچا اور اس نے قطبوغا کو تیر مار کر گرا دینا چاہا لیکن اس مملوک کو ایک منگول نے اپنے نیزے میں پرو کے گھوڑے کی پشت سے گرا دیا۔ قطبوغا ایک بار پھر بچ گیا۔

بیبرس نے قطبوغا کو حکم دیا۔ "جنگ کا پانسہ پلٹ چکا ہے منگول سردار! منگول کٹی ہوئی فصل کی طرح کاٹے جا رہے ہیں تم خود کو ہمارے حوالے کر دو!"

"ناممکن!" قطبوغا نے غصہ میں کہا "ہم بارہا دشمن کی جیتی ہوئی جنگوں کو شکست میں بدل چکے ہیں۔ تم بھی نتیجے کا انتظار کرو!"

منگولوں کا بیشتر حصہ قتل کیا جا چکا تھا، بقیہ ادھر ادھر بھاگ نکلے تھے۔ بیبرس نے رسی کو گولائی میں لپیٹ کر اس کا دوسرا سرا مضبوطی سے پکڑ کے اسے قطبوغا کی طرف اچھال دیا۔ رسی گولائی میں گردش کرتی کھلتی چلی گئی اور پھندے والا حصہ قطبوغا کے گلے میں پڑ گیا۔ بیبرس نے اسے فوراً اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کا حلقہ تنگ ہو گیا اور قطبوغا گھوڑے کی پشت سے لڑھکتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دو مملوک بھی اپنے اپنے گھوڑوں سے نیچے پھاند پڑے اور قطبوغا کو دبا لیا منگولوں نے اپنے سردار کو جو گرتے دیکھا تو فوراً

راہ فرار اختیار کی لیکن مصری افواج نے انہیں گھیر گھیر کے پکڑنا شروع کر دیا۔ قطلوغا پر کئی اور مملوک بھی ٹوٹ پڑے اور اسے آناً فاناً بے دست و پا اور غیر مسلح کر دیا۔ اسے رسی سے جکڑ دیا گیا، اس وقت تک بیبرس غائب ہو چکا تھا۔ قطلوغا نے گرفتاری کی اذیت کو چھپانے کی بڑی کوشش کی پوچھا "بیبرس کہاں چلا گیا؟"

ایک مملوک سپاہی نے جواب دیا "ہمارا سردار تو چھلاوا ہے چھلاوا کچھ پتہ نہیں کہاں چلا گیا اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے آس پاس موجود نہیں ہو سکتا ہے وہ اس وقت ہم ہی لوگوں میں موجود ہماری نگرانی کر رہا ہو۔"

قطلوغا نے کہا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا مملوک سپاہی۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

مملوک نے جواب دیا "ہو سکتا ہے وہ ہمیں میں موجود ہو کیونکہ اس قسم کے کرتب اور مظاہرے بیبرس کو کرنا خوب آتے ہیں!"

خلیج گلیلی کے عین جالوت میں مصری سپاہ فاتح کی حیثیت سے پھیل چکی تھی بیبرس بدستور غائب تھا قطلوغا کو اس کے حکم پر قاہرہ روانہ کر دیا گیا۔ یروشلم سے ماوراء النہر تک بیبرس کا شہرہ ہو گیا اور مسلمانوں نے اطمینان کی سانس لی۔

دوسری طرف حور نے جب منگولوں کی شکست کی خبر سنی تو اسے یقین نہیں آیا۔ خانہ بدوش بدستور غائب تھا۔ اب حور کو کچھ کچھ یہ یقین ہو چلا تھا کہ خانہ بدوش کہیں پکڑا گیا اور شاید ہلاک کر دیا گیا۔

بیبرس نے قاہرہ پہنچ کے منتخب مملوک امرا کا ایک دربار منعقد کیا دور تک شاندار خیمے نصب تھے ان میں بیبرس کا خیمہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے نیچے بیک وقت کئی ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ اس خیمے کے نیچے بیبرس اپنے مخصوص لباس اور حلیے میں مملوک امرا کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا سر اس وقت بھی خود میں چھپا ہوا تھا اور فولادی کڑیوں کی نقاب اس وقت بھی چہرے پر موجود تھی اور جسم پر زرہ بکتر کی جگہ ریشمی لباس تھا مخمل کی صدری کے نیچے ایک چوڑے کمر بند سے ریشمی کرتے کو کس کے باندھ دیا گیا تھا اس کے سامنے قطلوغا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بندھا ہوا بیٹھا تھا۔ بیبرس نے حقارت سے کہا "تم بہت سی سلطنتوں کا قلع قمع کر چکے ہو لیکن آج تم خود ایک شرمناک شکست سے دوچار کے میرے روبرو بندھے بیٹھے ہو، بتاتا تو تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟"

قطلوغا نے جواب دیا "میں نے زندگی بھر اپنے آقا کی خدمت کی ہے تم زیادہ سے زیادہ جو سزا دے سکتے ہو وہ قتل کی سزا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اس قتل کا کیسا بھیانک نتیجہ نکلے گا، میرے مرنے کے بعد قاہرہ منگول شہسواروں کے ذریعہ روند ڈالا جائے گا اور تمہاری ساری شیخی خاک میں مل جائے گی!"

بیبرس نے پوچھا "کیا منگول اب بھی قاہرہ کی طرف آنکھ اٹھانے کی ہمت کر سکیں گے؟"

قطلوغا ہنسنے لگا، بولا "کیوں کیا منگول عورتوں نے بچے جننا بند کر دیا ہے یا پھر یہ کہ منگول گھوڑیاں اب

پہنچنے نہیں دیتیں؟ کیا جاودانی آسمان کی برکتیں ہم سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئیں، میری موت کی خبر ہلاکو خاں تک ضرور پہنچے گی اور ہلاکو خاں میری موت کا انتقام جس طرح لے گا تم شاید اس کا حقیقی تصور تک نہ کر سکو!"

بیبرس نے حقارت سے چونکا دینے والا سوال کیا "کیا تمہارے خانہ بدوش نے تمہیں صحیح خبریں نہیں پہنچائیں؟ وہ کہاں دفعان ہو گیا؟ کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ بیبرس اتنا نادان انسان ہے کہ اسے ایک خانہ بدوش بیوقوف بنا لے گا!"

پھر خدام کو حکم دیا "سور کو حاضر کیا جائے!"

سور وہیں کہیں کسی خیمے میں موجود تھی اسے چند لمحوں میں حاضر کر دیا گیا، قطبوغا حیرت اور پریشانی سے بار بار بیبرس کی طرف دیکھ رہا تھا، اسی وقت بیبرس نے مسکراتے ہوئے اپنے سر سے خود اتار دیا اور چہرے کی فولادی کڑیوں والی نقاب دور کر دی، خود کے نیچے سے سرخ بال نمودار ہوئے اور کڑیوں کے پیچھے سے دو ایسی آنکھیں نمودار ہو گئیں جن میں ایک تو نیلی تھی اور دوسری آنکھ کو گہرے زخم کے نشان نے چھپا رکھا تھا۔ بیبرس کھڑا ہو گیا اور زور زور سے ہنسنے لگا، قہقہوں سے پورا خیمہ گونج اٹھا، اس وقت قطبوغا کا بہت برا حال تھا۔ احساس شکست خوردگی کو بے وقوف بننے کے علم نے اور زیادہ شدید کر دیا تھا اس بے وقوف کے سامنے بیبرس کی شکل میں خانہ بدوش ٹھٹھے لگا رہا تھا۔

بیبرس ہنستا ہوا قطبوغا کے قریب پہنچ گیا اور اس کی مونچھ کو چٹکی سے پکڑ لیا اسے آہستہ آہستہ کھینچتا ہوا بولا "جاسوسی کرائے کے آدمی اچھی نہیں کر سکتے، میں اپنا جاسوس خود تھا، یہ بیبرس خود تھا جو خانہ بدوش کے روپ میں قطبوغا، منگول سردار اور اس کے عسکری معاملات کو سمجھنے گیا تھا!"

قطبوغا نے شرم سے گردن جھکا لی، اس وقت سور کا بھی بہت برا حال تھا، وہ جس انکشاف سے دوچار ہوئی تھی، اس نے سور کے ہوش و حواس زائل کر دیئے تھے۔ بیبرس اچانک سور کے پاس پہنچ گیا، بولا "سور تیرا باپ میرے سامنے قتل کیا گیا تھا، تو اپنے باپ کا انتقام تو نہیں لے سکتی تھی لیکن میں تو لے سکتا ہوں!" پھر قطبوغا سے دریافت کیا "تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟"

قطبوغا نے دلیری سے جواب دیا "میں ہر اس طرح مرنے کو تیار ہوں جسے تم میرے لئے اختیار کرو گے، کیونکہ ہر طریقے کا انجام تو موت ہی ہو گا!"

بیبرس نے چند مملوکوں کو حکم دیا "اس کے رانوں کی بوٹیاں اس کے منہ میں ٹھونس دی جائیں کیونکہ یہ سور کے باپ کے ساتھ بھی ایسا ہی کر چکا ہے۔"

مملوکوں نے قطبوغا کو پچھاڑ دیا اور تیز دھار دار چھروں سے ان کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر قطبوغا کے منہ میں ٹھونسنے لگے۔

بیبرس نے قہقہہ مار کے پوچھا "کہو کیسی ضیافت رہی۔ کچھ مزہ آیا؟"

قطبوغا درد سے بلک رہا تھا لیکن اسی شان اور اسی آن بان سے بولا "ہلاکو خان تجھے زندہ نہیں چھوڑے گا!"

بیبرس نے حکم دیا "اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی جائیں۔"

دو ملوکوں نے چشم زدن میں دونوں ٹانگیں کاٹ دیں۔ اب قطبوغا بے ہوش ہو چکا تھا، اسی بے ہوشی کے عالم میں قطبوغا کے دونوں ہاتھ بھی کاٹ دیئے گئے اور سب کے آخر میں سر بھی جسم سے الگ کر دیا گیا۔ بیبرس کے حکم پر "اس کے کٹے ہوئے ہاتھ پیروں کو قاہرہ کے چاروں دروازوں پر لگا دیا گیا اور اس کے نیچے لکھوا دیا۔ قاہرہ کی فصیلیں گرانے والا گرا دینے کا حکم دے کر کس پردے میں جا چھپا؟

اس کے بعد دوسرے منگولوں کی باری آئی۔ اور ان سب کے ہاتھ پیر توڑ کے ایک گھر میں بند رکھا گیا اور وہاں یہ لوگ سختیوں کی تاب نہ لا کر مرنے چلے گئے۔ اس کے بعد وہ حور کے پاس گیا، اب حور میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ بیبرس کو آنکھ اٹھا کر دیکھ ہی لیتی۔

بیبرس نے دریافت کیا "حور! اب تیرا کیا ارادہ ہے؟ تو مجھے اب بھی پسند کرتی ہے یا کوئی اور جواب ہے تیرے پاس میری اس بات کا؟"

حور نے دلیری سے جواب دیا "یہ الگ بات ہے کہ اب آپ کی ایک شاندار حیثیت نے میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت بہت زیادہ بڑھا دی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ میری پسند بھی بدل گئی ہے۔"

بیبرس نے کہا "کیا تجھے معلوم ہے کہ اس وقت ریمنڈ کہاں ہے؟"

حور نے جواب دیا "میں نہیں جانتی!"

بیبرس نے کہا "آج کل وہ دریائے یردن کے کنارے بنے ہوئے اس کلیسا میں رہ رہا ہے جہاں حضرت یحییٰ لوگوں کو بپتسمہ دیا کرتے تھے۔ اب وہ گوشہ نشین اور تارک دنیا ہو چکا ہے اور شاید تیری یاد کو اپنے دل سے بھی نکال چکا ہے!"

حور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔

بیبرس نے دریافت کیا "تیرا میری بابت کیا خیال ہے؟"

حور نے جواب دیا "میرا کوئی خیال نہیں، میں تو آپ کے خیال کی تابع ہوں!"

بیبرس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور محبت سے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ بولا "تو میری بیٹی ہے حور! میں نے خانہ بدوش کی شکل میں تیرے ساتھ جو کچھ بھی کیا اس کا ایک ہی منشا تھا، میں ایک مسلمان لڑکی کو ناصریوں اور منگولوں کے چنگل سے نکالنا چاہتا تھا اور میں اس میں کامیاب بھی رہا۔"

بیبرس نے حور کو بیٹی کہا تھا اور اس قول کو اس نے اس طرح نبھایا کہ کئی دن بعد وہ چپ چاپ ایک بار پھر غائب ہو گیا، اس وقت بھی حور اس کے ساتھ تھی، وہ شب و روز منزلیں مارتا دریائے یردن کے کنارے اس کلیسا میں پہنچ گیا جو حضرت یحییٰ مبشر کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ وہاں ریمنڈ ایک گوشہ میں ننگے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اپنے سامنے خانہ بدوش اور حور کو اچانک دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے بیبرس سے کہا "خانہ بدوش دوست! کیا تم میری عبادت و ریاضت کو تباہ و برباد کرنے ایک بار پھر آگئے ہو؟ کہیں تم شیطان تو نہیں ہو؟"

حور نے جواب دیا "ریمنڈ! یہ خانہ بدوش نہیں بیبرس ہیں۔ یہ ان دنوں خانہ بدوش کے بھیس میں ہمارے پاس

آئے تھے اور یہی وہ بہادر شخص ہیں جن کی جوانمردی اور خوش تدبیری نے کو عبرتناک شکست سے دوچار کر دیا!"

اس انکشاف پر ریمنڈ بھی گھبرا گیا، دونوں خاموش ہو گئے۔

بیبرس نے اس خاموشی کو ختم کر دیا۔ بولا "ریمنڈ! میں اس لئے آیا ہوں کہ اپنی بیٹی حور کو تمہارے حوالے کر دوں۔ کیا تم حور کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہو؟"

ریمنڈ نے سر جھکا لیا اور کچھ سوچنے لگا۔ حور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ امید و بیم کے جھولے میں جھول رہی تھی کچھ دیر بعد ریمنڈ نے سر اٹھایا اور آہستہ سے کہا "ہاں میں اس کا بوجھ اٹھانے کو تیار ہوں!"

بیبرس نے کہا "لیکن ایک شرط بھی ہے، حور مسلمان ہے اور تم مسیحی کیا تم مذہب کی قربانی دینے کو تیار ہو؟"

ریمنڈ نے بلا تامل جواب دیا "ہرگز نہیں!"

بیبرس نے حور سے پوچھا "اور تم؟ کیا تم ریمنڈ کی خاطر اسلام چھوڑنے پر آمادہ ہو؟"

ریمنڈ کے فوری جواب نے حور کا دل توڑ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ ریمنڈ اس سوال کا جواب سوچے سمجھے بغیر نہ دے گا لیکن اس نے جتنی عجلت اور یقین سے جواب دیا تھا، وہ بہت ہی افسوسناک تھا۔ بیبرس نے حور کو متامل جو دیکھا تو ایک بار پھر دریافت کیا "حور! کیا تم ریمنڈ کیلئے مذہب کی قربانی دینے کو تیار ہو!؟"

حور نے جواب دیا "نہیں ہرگز نہیں"!

یہ کہہ کر وہ اسی وقت کلیسا سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے بیبرس بھی باہر آ گیا اور سب کے آخر میں ریمنڈ باہر نکلا، لیکن اس کے نکلنے میں دیر ہو چکی تھی اس وقت تک بیبرس اور حور وہاں سے کافی دور جا چکے تھے۔

بیبرس حور کو قاہرہ لے آیا۔ کچھ دنوں تک تو حور کی بہت بُری حالت رہی لیکن پھر وہ سنبھلتی چلی گئی اور کبھی ریمنڈ کا نام تک نہ لیا۔ جب حور کی طبیعت ٹھہر گئی، تو بیبرس نے اس کا ہاتھ ایک نوجوان مملوک کے ہاتھ میں دے دیا اور اس موقع پر اسے رخصت کرتے ہوئے کہا "حور اگر یہ رسم ضروری نہ ہوتی تو میں تجھے شادی پر کبھی بھی مجبور نہ کرتا، اور میں نے تو یہ بھی چاہا تھا کہ تجھے ریمنڈ سے وابستہ کر دوں لیکن وہ مسلمان ہو جانے پر آمادہ ہی نہ ہوا! تمام حجت کے لئے میں نے تجھے مسیحی ہو جانے کا مشورہ بھی دیا لیکن تو نے اسے جس خوب صورتی اور اعتماد سے مسترد کر دیا تھا اس سے میری طبیعت خوش ہو گئی تھی۔" پھر اسے اپنے سینے سے لگا لیا، بولا "نہ رو میری بچی نہ رو، رونے کا زمانہ ختم ہو چکا، اب تو میری بیٹی ہے۔ بیبرس کی بیٹی۔ اس بیبرس بیٹی، جس نے منگولوں کی قوت کو پامال کر ڈالا۔"

لیکن یہ عجیب بات تھی کہ بیبرس جیسے جیسے اسے تسلی دلاسے دے رہا تھا، حور اسی قدر پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔